اقبالؒ پیامبرِ اُمید

مقالاتِ علّامہ عرشی امرتسری

مرتبہ: ڈاکٹر تصدّق حسین راجا

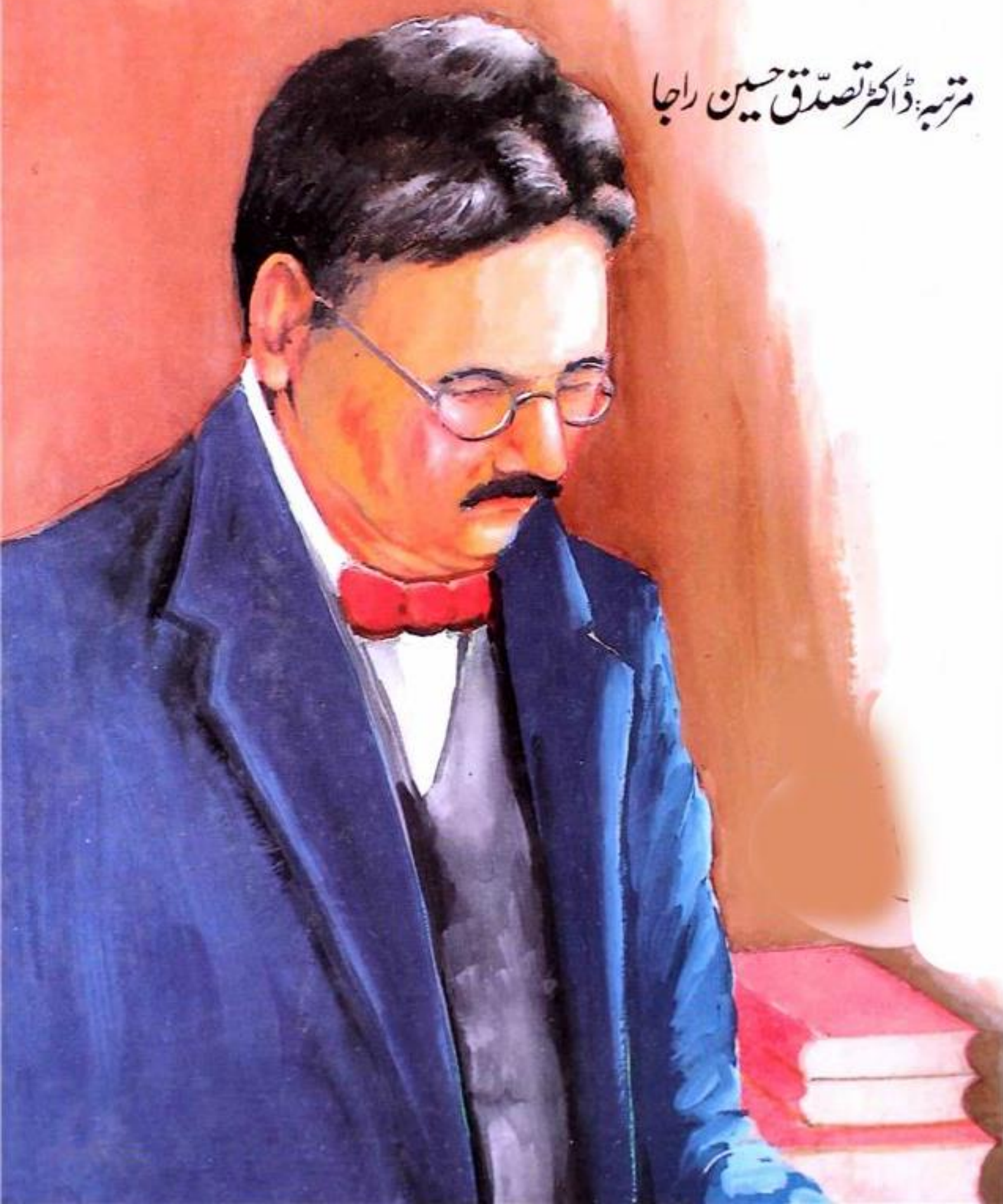

اقبال — پیامبرِ اُمید

(مقالاتِ علّامہ عرشی امرتسری)

مرتّبہ — ڈاکٹر تصدّق حسین راجا

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

انتساب

بہت ہی پیاری بیٹی

قرۃ العین شیریں کے نام

جس نے خیر و شر کے دوراہے پر مجھے بارہا صحیح سمت دکھائی

فہرست

۱	عرشی امرتسری اور اقبال	۷
۲	سوانح اور تصانیف	۱۱
۳	من و اقبال	۳۴
۴	علّامہ اقبال کے ملازم خاص علی بخش سے ایک ملاقات	۴۰
۵	مکتوبِ اقبال کی روشنی میں موجودہ صورتِ حال	۴۵
۶	عظمتِ قرآن بنظرِ اقبال	۵۱
۷	اقبال کے کرم فرما	۶۳
۸	اقبال اور حکیم فیروز طغرائی	۸۴
۹	ایک فراموش شدہ عظمت (حیاتِ اقبال کا ایک پنہاں گوشہ)	۹۱
۱۰	جامی و اقبال بحضور رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم	۱۱۰
۱۱	اقبال ـــــــــ پیامبرِ اُمید	۱۲۲
۱۲	اقبال اور ارتقاء	۱۳۶
۱۳	شاعرِ فردا	۱۵۷
۱۴	اقبال کا مردِ مسلمان	۱۷۰
۱۵	اقبال اور ہنگامِ سحر	۱۸۰
۱۶	اقبال اور حیات بعد الممات	۲۰۹
۱۷	حضرت خواجہ احمد الدین اور علّامہ اقبال	۲۲۴
۱۸	علّامہ اقبال - ایک مردِ خدامست	۲۴۸
۱۹	اقبال اور تشکیلِ کردار	۲۶۴
۲۰	گر بجز قرآں ـــــ اقبال (اقبال پر ایک دلچسپ تنقیدی مکالمہ)	۲۸۴

عرشی امرتسری اور اقبالؒ

اقبال کے سینے میں کئی باتیں ایسی پوشیدہ تھیں جن کے اظہار سے گریز پا رہے کہ نا سمجھ اور تنگ خیال لوگوں کا ردِ عمل ان اسرار و رموز کو جان کر اچھا نہ ہوتا جسے یہ دانائے راز اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا۔ علامہ عرشی امرتسری اس بارے میں فرماتے ہیں "میں نے ایک دفعہ کسی قدر گستاخ ہو کر ۱۹۲۵ء میں ان سے کہہ دیا تھا " ڈاکٹر صاحب آپ نے دنیا کو دھوکہ دے رکھا ہے۔ اس فریب کو دنیا نے کبھی پا لیا تو کیا ہوگا؟ یہ سُن کر متحیر ہو گئے۔ لیکن مسکرا کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟" میں نے عرض کیا "ہم سب سمجھتے ہیں کہ آپ نے بڑی محنت اور بڑے غور و فکر کے بعد اپنے خیالات اشعار میں قلم بند کر دئیے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ جانتے پہچانتے ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی آپ کے کلام میں نہیں ہے۔ یہ تو بڑا ستم ہے کہ ہم صرف اتنا ہی جان کر اکتفا کریں اور آپ یہ غضب کر رہے ہیں کہ شاعری سے آگے نہیں بڑھتے ، آپ کی صحبتوں میں وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی آپ کے اشعار میں محض کہیں کہیں دھوپ چھاؤں سی مل جاتی ہے۔ آپ بات بات میں وہ نکتے بتا جاتے ہیں جو مدتوں مطالعہ کے بعد شاید معلوم نہ ہوتے۔" ڈاکٹر صاحب بڑے زور سے ہنسے، سر کرسی کے ساتھ ڈال دیا۔ چھت کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر حقّے کا گہرا کش لے کر بولے "دیکھو دنیا جس آفت میں مبتلا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ پورے طور پر بتا نہیں سکتے[۱] اور جو لوگ نہیں جانتے وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ رہتے ہیں اور بتاتے بھی رہتے ہیں۔" اس کے بعد ایک خاص انداز سے مسکرا کر کہنے لگے "تو پھر کیا چاہتے ہو؟" اس کے بعد پھر ایسی بات بتائی جس کے بتانے کا یہ موقع نہیں[۲]

لہ ۔ سید میاں بھیک فرماتے ہیں بھیکا بات اگم کی کہن سن میں ناں + جو جانے سو نہ کہے سو جانے ناں ۔
بقول سعدی در طلبش بے خبر انند آں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد ۔

ٹہ اور ایسا موقع پھر کبھی نہ آیا (اقبال اور عرشی : محمد عیص عابد)

مولانا عرشی امرتسری کا تعارف علامہ اقبال سے ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ جسے مولانا نے قلمی اور عینی دو طرح کے تعارف کا نام دیا ہے اور اس کی تفصیل اس باب کے پہلے ہی مقالے "من و اقبال" میں موجود ہے۔

عرشی امرتسری اقبال کے ان چند ممتاز معاصرین میں سے ایک ہیں جو باہم ایک دوسرے سے کئی معاملات میں تبادلہ خیال اور مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا عرشی کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ قیام پاکستان سے قبل جب آپ امرتسر میں تھے اور اقبال لاہور میں تو نام و پیام کے ذریعے آپ کو لاہور بلوایا جاتا تھا۔ عرشیؔ اور اقبالؔ میں چند باتیں مشترک تھیں اور یہی اشتراک علامہ عرشی کو دوسرے معاصرینِ اقبال سے ممتاز بناتا ہے۔ دونوں حضرات کے افکار اور مشاہدات کا ماخذ قرآنِ حکیم ہے۔ دونوں تہجد گزار تھے اور دعائے نیم شبی و آہ سحر گاہی کی مقبولیت پر یقین رکھتے تھے۔ دونوں کی زندگی میں انتہائی درجے کی سادگی تھی دونوں امت مسلمہ کے بھٹکے ہوئے آہو کا رُخ جانبِ منزل موڑ دینے کی فکر لیے ہوئے تھے دونوں عمل پیہم اور جہد مسلسل پر زور دیتے ہیں۔ دونوں کے درمیان بظاہر ایک بہت بڑا فرق تھا کہ اقبال بیرسٹر تھے اور یورپ کی دو بڑی جامعات سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے۔ جب کہ مولانا عرشی نے غیر ملکی جامعات کا تو کجا اپنے ملک میں کسی اسکول کالج کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔ البتہ اس کمی کے باوجود جو علم و فراست اللہ نے عرشی امرتسری کو عطا کی تھی اس کے سامنے بڑی بڑی جامعات کی ڈگریاں رکھنے والے ہیچ تھے۔ تفہیم قرآن کی بات ہو یا شعر و سخن کا کوئی معاملہ، کوئی لسانی گتھی سلجھانی ہو یا مسئلہ معاشرتی، اقتصادی یا سیاسی نوعیت کا ہو علامہ عرشی امرتسری کی رہنمائی کی ضرورت بڑے بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو بھی پیش آتی تھی۔

عرشی امرتسری نے جو جسمانی و روحانی سفر علامہ اقبال کے ساتھ طے کیا اس کی بڑی واضح اور نمایاں جھلک حیاتِ عرشی میں قدم قدم پر نظر آتی ہے اور اقبالیات پر گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک عرشی امرتسری کا ذکر شاملِ گفتگو نہ کر لیا جائے۔ شارحین کلامِ اقبال میں جو مقام علامہ عرشی کو حاصل ہے وہ میری ذاتی رائے میں شاید ہی کسی اور کے حصے میں آیا ہو۔

علامہ اقبالؒ ۱۹۳۸ء میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر مالکِ حقیقی سے جا ملے تھے۔

اس وقت میری عمر صرف ایک برس تھی۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد جب اقبالیات کا مطالعہ شروع کیا تو یہ خیال رہ رہ کر ستاتا تھا کہ کاش میں کچھ عرصہ پہلے پیدا ہوا ہوتا تاکہ علامہ کی زیارت کرتا اور آپ کے افکار سے براہِ راست مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔ پھر میں چند ایسی شخصیات سے ملا جن کو علامہ اقبالؒ کی قربت میسّر آئی تھی ان میں ایک بزرگ سردار فتح خاں (مرحوم) منٹور تحصیل کہوٹہ والے بھی شامل تھے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ ایسی شخصیات میں سے زیادہ سے زیادہ حضرات سے ملاقات کی جائے اور ان کی زبانی وہ باتیں سنی جائیں جو مجلسِ اقبال میں بیٹھنے سے ان تک پہنچی تھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اقبال کی جو باتیں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ان لوگوں کی زبانی مل سکتی تھیں شاید اقبالیات پر چھپنے والی کتب میں بھی نہ مل سکتیں۔

اس کتاب کی تدوین و تالیف کے دوران اقبالیات پر شائع ہونے والی کتب اور رسائل و جرائد کا بھی سرسری سا جائزہ لینے کا موقع ملا، اور ایک بات کا احساس بڑی شدّت سے ہوا۔ علامہ عرشی خود تو تھے ہی ہر طرح کی پبلسٹی سے دور رہنے والے انسان جنہیں ٹی وی، ریڈیو اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے توسط سے شہرت و ناموری کے حصول کی کوئی تمنّا نہ تھی نہ ادبی تقاریب کی صدارت کا شوق تھا۔ لیکن ہم نے ایک ظلمِ عظیم اپنے آپ پر یہ کیا ہے کہ ایک ایسی فاضل اور بزرگ ہستی جو ۴ جون ۱۹۸۵ء تک ہمارے درمیان موجود رہی اور جس سے بڑھ کر فکرِ اقبال کو سمجھنے والا شاید ہی کوئی دوسرا موجود ہو۔ ہم نے اس سے اپنی نئی نسل کے لیے اقبال کے حوالے سے وہ سرمایہ کتابی شکل میں منتقل نہیں کرایا جس کی ہمیں بے حد ضرورت تھی اور جو جانے والے کے ساتھ ہی اِس طرح چلا گیا کہ اب اس تک رسائی ممکن نہیں رہی۔

اس باب میں شامل مقالات کی تعداد یوں تو صرف ۱۸ ہے لیکن میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ عرشی کے قلم سے نکلے ہوئے یہ ۱۸ مقالات اقبالیات پر لکھی سینکڑوں ضخیم کتابوں پر بھاری ہوں گے۔ یہ مقالات جو ماہنامہ "البلاغ" امرتسر۔ ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی۔ اقبال ریویو لاہور اور روزنامہ "امروز" لاہور میں وقتاً فوقتاً چھپ چکے ہیں انہیں اس کتاب میں یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

ہمارے یہاں علمی و ادبی شخصیتوں کے قد بڑھانے اور گھٹانے کا کام کچھ اس انداز سے

رواج پاگیاہے کہ اپنی پسندیدہ شخصیّت کو قدآور ثابت کرنے کے لیے حالؔی واقبال سے موازنہ کرکے مؤخرالذکر حضرات کے قدوقامت کو گھٹانے کی ناکام کوششیں کی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں تو کیا کامیاب ہوں گے البتہ تعصّبات اور جانب داری کے در آنے سے حقائق کے پس منظر میں چلے جانے کے خدشات ضرور پیدا ہوجاتے ہیں جس کے نتیجے میں قومی اور ملّی سرمائے کا وہ زیاں سامنے آسکتا ہے جس کے نتائج ہمارے لیے خوف ناک ثابت ہوں۔

کئی دوسرے المیوں کی طرح یہ بھی ہمارا قومی المیہ بن چکا ہے کہ ہم علم وحکمت کے کسی خزینے کی قدر اس وقت کرتے ہیں جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے چھن چکا ہوتا ہے۔ اور آج بھی علامہ عرشی کے بچھڑ جانے کے بعد ہمیں یہ خیال بار بار ستا رہا ہے کہ کاش اور کوئی ادارہ نہیں تو اقبال اکیڈیمی ہی ہی عرشی امرتسری سے اقبالیات پر کوئی ایسا ٹھوس کام کرالیا ہوتا جس سے نہ صرف اقبال کے شاہین بلکہ پوری قوم مستفیض ہوسکتی۔

یقیناً عرشی امرتسری کا شمار ان محمود شناساں اقبال میں ہوتا ہے جنہوں نے فکر وفلسفہ اقبال کی روشنی سے معاشرے کو منور کیا۔ لیکن ہم نے اپنی نئی نسل کو ایسے قومی مشاہیر سے متعارف کرانے میں بڑی غفلت برتی ہے۔ حالانکہ یہ کام ایک قومی فریضے کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اقبالیات پر لکھی جانے والی کتب میں یہ کتاب ایک نہایت گراں قدر اضافہ سمجھی جائے گی۔

ڈاکٹر تصدّق حسین راجا

۶۲۹ - العین
سٹریٹ نمبر ۴۳
جی ۴/۱۰، اسلام آباد
فون: ۸۵۳۷۹۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانح اور تصانیف

علامہ عرشی امرتسری کا پورا نام محمد حسین اور تخلص عرشی تھا۔ والد محترم کا نام میاں دین محمد اور والدہ کا رحمت بی بی تھا۔ ۴ جون ۱۹۸۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا اور لاہور کے بادامی باغ میں دفن ہوئے۔ آپ کی صحیح تاریخ پیدائش کا کہیں اندراج نہیں ہے۔ تاہم بوقت انتقال اوسطاً عمر ۹۲ برس بنتی تھی اور اس حساب سے سنِ ولادت قریباً ۱۸۹۳ء بنتا ہے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں سکینہ بی بی اور معراج بی بی بقیدِ حیات ہیں۔ بیٹا جس کا نام محمد سعید تھا شیر خوارگی میں فوت ہو گیا تھا۔ دوسری بیوی بانجھ تھی جو علامہ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

علامہ عرشی ایک بلند پایہ عالمِ دین، فلسفی، شاعر ہفت زبان، محقق، نقاد، ادیب، حکیم اور ایک دل دردمند رکھتے تھے۔ ہر طرح کے تعصبات سے پاک زندگی بسر کی۔ کسی مدرسے سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود بڑی بڑی جامعات سے فارغ التحصیل افراد اور پروفیسر حضرات علم و حکمت کی گتھیاں سلجھانے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ فارسی۔ عربی۔ اُردو۔ ہندی اور پنجابی زبانوں میں عرشی امرتسری کو پوری پوری دسترس حاصل تھی۔ والد محترم کے کتب خانے میں صرف دو ہی کتابیں تھیں۔ ہیر وارث اور کلیات نظیر اکبر آبادی وہ کہا کرتے تھے کہ یہی دو میرے پہلے استاد تھے۔ وارث تو ان کے اندر رچ بس گیا تھا اور کتاب کا زیادہ حصّہ انہیں حفظ تھا۔ حکیم فیروز الدین طغرائی سے ۲ سال تک فارسی اور عربی گرامر پڑھی اور ان کی صحبت سے دینیات کا شوق پیدا ہوا جس کی تکمیل خواجہ احمد الدین امرتسری کی صحبت میں ہوئی۔ مولوی عقل دین بٹ سے قرآنِ حکیم کا ترجمہ پندرہ پاروں تک پڑھا۔ منطق کے چند اسباق مولانا ابو وفاء ثناء اللہ امرتسری سے پڑھے۔

عرشی امرتسری کی طبیعت میں تجسّس کا مادہ موجود تھا۔ تصوّف کا شوق ہوا تو قلندر شاہ نوشاہی کے مرید بن گئے۔ کچھ عرصے بعد امرتسر میں عبدالرزاق خاکی کی فارسی دانی کا چرچا سُنا تو ان کے پاس آنا جانا شروع ہوا۔ دہریت میں پھنس گئے اور اس کی تبلیغ بھی شروع کر دی تھی۔ آخر حکیم طغرائی نے ایک روز حضرت علیؓ اور ایک دہریے کے درمیان ہونے والے مناظرے کا ذکر فرمایا تو علامہ عرشی پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ اپنے دہریے پیر و مرشد عبدالرزاق خاکی سے جا کر اس کا ذکر کیا اور حضرت علیؓ کی دلیل کا توڑ پوچھا۔ وہ جواب نہ دے سکا، یوں اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم سے انہیں دہریت سے نکال کر اسلام کی طرف لے آیا۔ دہریت سے نکال کر مولویوں صوفیوں، سادھوؤں، پنڈتوں، نجومیوں اور مختلف فرقوں کے پیروکاروں سے ملے۔ مگر محض علمی پیاس بجھانے کے لیے ـــــ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں میاں ہدایت اللہ کی سہ حرفیوں کی گونج پورے پنجاب میں سنائی دے رہی تھی۔ یہ علامہ عرشی کے شباب کا زمانہ تھا۔ میاں صاحب سے ملنے گئے اور ان ہی کا یہ مصرع پڑھا :

ع شاہ رگ تھیں بہت نزدیک ہے اوہ تیرا اپنا قلب حضور ناہیں

پھر میاں ہدایت اللہ سے پوچھا کہ "یہ شعر آپ نے مرزا صاحب کی بیعت سے پہلے کہا تھا یا بعد میں؟" جواب ملا "بیعت سے پہلے بلکہ اس وقت تک تو مرزا کا نام ہی نہ تھا۔" عرشی امرتسری نے برجستہ کہا "جب آپ کو پہلے ہی پتہ تھا کہ اللہ شاہ رگ سے بہت قریب ہے تو پھر مرزا صاحب کے پاس کیا لینے گئے تھے؟" ہدایت اللہ نے غصّے میں آکر کہا "اوہ توں ہنے ای ایہو جیاں گلاں کردا ایں وڈا ہو کے کہیہ کریں گا؟" (تم اس عمر میں ایسی باتیں کرتے ہو تو بڑے ہو کر کیا کچھ کہو گے۔)

امرتسر مذہبی فرقوں اور مناظروں کا شہر تھا ایک بار ڈھاب کھٹیکاں امرتسر میں مسئلہ تناسخ پر خواجہ احمدالدینؒ اور آریہ سماج کے درمیان ایک مناظرہ ہوا۔ خواجہ صاحب نے دلیل میں ارشاد فرمایا کہ "آپ ہندوؤں کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ اس زندگی میں جو کوئی مختلف قسم کا پاپ کرتا ہے

وہ دوسری زندگی میں بکری۔ گائے۔ بیل۔ گھوڑا۔ کتا۔ بلی یا کسی اور جانور کے جیون میں آجاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تمہارے عقیدے کے مطابق اس جیون میں آدمی پاپ نہ کرے تو ان جانوروں کی موجودگی کے بغیر یہ کاروبار زندگی کیسے چل سکتا ہے اور جس پر ماتما کی کائنات کی بنیاد ہی پاپ پر ہو تو وہ کیسا پرماتما ہے"۔ علامہ کو بحث مباحثوں اور مناظروں میں بڑا لطف آتا تھا۔ فرماتے ہیں" میں اس ہار جیت کو صدق و کذب کا معیار اور مذہب کی آخری منزل سمجھا ہوا تھا اور اس چسکے کے لیے بہت کچھ مطالعہ بھی کرتا اور اس قسم کی مجالس یا اکھاڑوں میں شریک ہوتا۔ اس سے بچ نکلنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دین محمد قوال کو بنایا۔ ایک دن انہوں نے میری درخواست پر خواجہ غلام فرید کے چند دوہے سنائے۔ ان میں سے ایک یہ تھا:۔

یار رجھاون سکھ دے مُلّاں اتے سٹ گھت سب دلیلاں
عشق مجازی تے مشکل بازی اِہ کم نہیں کھیڈ بخیلاں
تیرے سر تے ڈھانڈ ہجر دا بل دا تے توں جانیں ٹھنڈیاں ہیلاں
یار فرید اجتھے اکھیاں لگیاں اوتھے حاجت نہیں وکیلاں

اس دوہے کا پہلا مصرع میرے دل میں میخ کی طرح ایسا گڑ گیا کہ مدت گزر گئی لیکن یہ اسی طرح پیوست ہے۔ میری بحث کی عادت ختم ہو کر رہ گئی اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے باطن کے کئی داغ دھبے نظر آنے لگے اور ان کو دھونے کی فکر لاحق ہوئی۔" اس کے بعد علامہ عرشی نے قرآن حکیم کی طرف رجوع کیا۔ جس کا ذکر اس قطعے میں یوں کرتے ہیں:۔

مجھ کو اِک دل ملا تڑپنے کو اور جلنے کو ایک آہ ملی
پھر پھرا کر ہر ایک در سے مجھے تیرے قرآن میں پناہ ملی

ایک جگہ اور "آخری منزل" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں قرآن کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"میرے اس سفر کی آخری منزل قرآن تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا میں پورے یقین کے ساتھ آپ کو کہتا ہوں کہ میں کوشش کروں تو بھی اپنی زبان و قلم سے اسے ظاہر نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید نے مجھے ایسی دنیا میں پہنچا دیا کہ دوسری کتابوں کے پیروکار اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ چیز لفظی ترجمہ جان لینے سے حاصل نہیں ہوئی۔ لفظی ترجمہ تو ابوجہل و ابولہب

مجھ سے بہت بہتر سمجھتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق ہے جسے حاصل ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی میں اس حقیقت سے بھی غافل نہیں کہ قرآن فہمی کی منزلیں کبھی ختم نہیں ہوتیں اور میں واصلانِ قرآن کی جوتیوں میں بیٹھنے کے بھی قابل نہیں۔ اس کو انکسار نہ سمجھئے۔"

بھارت کے مشہور ادیب چوہدری برہم ناتھ دت اپنی کتاب "ذکر و فکر" میں علامہ عرشی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"وہ میرے استاد بھائی ضرور ہیں مگر استاد کے جانشین بن کر استاد بن گئے، وہ پورے مسلمان ہیں میں نیم ہندو بھی نہیں، وہ نماز روزے کے پابند، میں پوجا پاٹ سے بیزار چوٹی زنّار سے فارغ، وہ جیّد عالم اُردو فارسی عربی کے استاد، شاعر بے بدل، ناثر عدیم المثال ہیں" (صہ ۴۷)

موصوف اپنی ایک اور تصنیف "ڈال ڈال پات" میں علامہ عرشی کو ایک چٹھی میں یوں لکھتے ہیں۔

"بیشک آپ ولی ہیں اگر آپ ولایت کے دعویدار بن جائیں تو میں سب سے پہلے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کروں گا لیکن آپ میں یہ جرأت کہاں؟ (صہ ۲۱)

علامہ عرشی ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے ظاہر داری کی ساری شکلیں انہیں ناپسند تھیں، انسانوں کو پرکھنے کے لئے اسوۂ حسنہ بطور کسوٹی استعمال کرتے تھے۔ آپ نے قرآن حکیم کا مطالعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تناظر میں کیا۔ تہجد کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتے اور پھر تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہو جاتے، اس کے بعد صبح کی سیر کے لئے نکل جاتے تھے کھانے کے اوقات کی پابندی سختی سے کرتے تھے اور کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیز مثلاً شکر یا گڑ ضرور کھایا کرتے تھے۔

علامہ اقبالؒ کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا جب وہ ملّت کی طرف سے مایوس ہو کر خاموش ہو گئے تھے۔ اس موقعہ پر جس شخصیت نے انہیں مہر سکوت توڑ کر دوبارہ اپنا ملّی فریضہ سرانجام دینے پر مائل کیا وہ عرشی امرتسری تھے جو خود اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان

علامہ اقبالؒ، علامہ عرشی، مولانا ظفر علی خان اور حکیم فیروزالدین طغرائی کے درمیان

اس موضوع پر جو معرکہ ہوا اس کی تفصیلات ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی نے عرشی نمبر ۱۹۸۵ء میں شائع کی تھیں۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ترکی کے سلطان خلیفۃ المسلمین تھے اتحادیوں کے اسیر تھے اور پورے عالم اسلام پر اتحادی ممالک مسلط ہو گئے تھے۔ مصر، ایران اور افغانستان بے دست و پا تھے تو عرب ممالک برطانیہ کے چنگل میں گرفتار ہو چکے تھے، اس صورتِ حال پر کفار اور مشرک مسرت و شادمانی کا اظہار کر رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ دورا بتلا اسلام کے لئے (خاکم بدہن) نزع کا عالم ثابت ہو کر رہے گا۔ ایسے میں علامہ محمد حسین عرشی امرتسری نے روزنامہ زمیندار میں علامہ اقبال کے نام ایک منظوم پیغام بزبان فارسی شائع کرایا جس کے چند اشعار یوں تھے:

یافت از تو مرکزی ہنگامۂ بی تاب ما ریختی تخم سکون در مزرع سیماب ما

لیکن ای اقبال ایں رنگین نوائی تا بہ کے

از نفس گرمی و از دل شعلہ زای تا بہ کے

خیز و صوتِ خود بہ آہنگِ رجز تبدیل کن

قطرہ می داری بیا در، در شرر تحلیل کن

خیز ازیں کنج متانت جلوہ ی بر ما فگن

ہاں بیا ہمچو سنائی گوی در میدان فگن

علامہ عرشی کا یہ پیغام روزنامہ زمیندار میں چھپا تو مولانا ظفر علی خان اخبار لے کر خود علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اقبال نے جواب دیا کہ میں اپنا پیام مثنوی "اسرار و رموز" میں دے چکا ہوں پھر بھی انہوں نے چند اشعار اخبار کے لئے فارسی میں لکھ کر دے دیئے جن میں سے دو اشعار یہ تھے۔

دانی کہ چیست شیوۂ مستانِ پختہ کار

عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست

دارم ہنوز از کرم ساقی حجاز!

آہے درد نہ تاب کہ خیزد ز سینہ مست

اقبال کے ان اشعار کی اشاعت کے بعد مولانا ظفر علی خان نے اس معاملے کو مزید چھیڑنے کی غرض سے کچھ اشعار کہے اور حکیم فیروز الدینؒ طغرائی امرتسری نے بھی جو علامہ عرشی کے استاد

تھے اسی زمین میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور علامہ اقبال نے سر تسلیم خم کر دیا اور ایک تازہ نظم بھی لکھی۔

اپنے بارے میں علامہ عرشی اپنے ایک مکتوب بنام مرزا بیضا خان میں لکھتے ہیں:

مکرمی مرزا بیضا خان، وعلیکم السلام ..... اپنے متعلق لکھوں تو کیا لکھوں قومی حیثیت سے نہ سیّد نہ مغل نہ افغان۔ علمی لحاظ سے نہ دیوبندی نہ ندوی نہ علیگ، ثروت اور دولت کے امتیاز سے قطعاً محروم نہ کوئی عہدہ و مرتبہ نہ ہی تجارت و وجاہت، اگر کوئی بات کہنے کے قابل تھی تو وہ حکیم صاحب[1] کے ذکر میں بیان کر چکا ہوں۔

یہ زندگی زندگی نہ سمجھو کہ زندگی سے مراد ہیں بس
وُہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں جو ان کی صحبت میں کٹ گئی ہیں

انیسویں صدی کے اواخر غالباً ۱۸۹۳ء میں ایک راعی گھرانے میں پیدا ہوا والد صاحب نے مجھے بھی محنت کش بنایا بس یہی ان کے نزدیک میری معراج تھی ایک مرحوم دوست شوکت امرتسری کے ذریعے میرا شعری ذوق بیدار ہوا اس ذوق نے مجھے حکیم صاحب (حکیم فیروز الدین طغرائی) تک پہنچایا۔ ان سے عروض، صرف و نحو، فارسی عربی اور اس زمانے کا منشی فاضل کا نصاب پڑھا اور اپنے ذوق کے مطابق کچھ اور کتابیں دیکھ ڈالیں، ترجمہ قرآن ۱۵ ویں پارے تک مولوی عقل بٹ مرحوم امرتسری سے پڑھا اور عربی کے کچھ قصائد و اشعار مولوی محمد عالم صاحب مدرس ایم۔اے۔او سکول سے حل کرائے، طب کا شوق ہوا تو حکیم زاہد علی صاحب، اکبر الہ آبادی سے نحو اور بعض عربی کتب طب پڑھیں، منطق کے کچھ اسباق مولانا ابو وفا ثناء اللہ مرحوم سے پڑھے ..... دینیات سے عقلیت کی طرف زیادہ رجحان رہا، عہدِ رسالت کے بعد سے آج تک جو فرقے مسلمانوں میں پیدا ہوئے اپنے آپ کو کلی طور پر ان میں سے کسی سے وابستہ نہ کر سکا جس کی جو بات قرآن حکیم، فطرت اللہ، تجربہ صحیحہ اور عقل سلیم کے مطابق نظر آئی قبول کر لی۔ جوانی کے آغاز میں کچھ دنوں ادبی محفلوں کی گرما گرمی میں حصہ لیا اس کے بعد دینی معرکوں میں دلچسپی لی۔ وقت کے ساتھ ذوق و رجحان میں تبدیلی آگئی۔ پچھلے دنوں اپنے حسب حال یہ رباعی کہی:

۱۔ حکیم فیروز الدین طغرائی۔

یک عمر چو موج در تصادم گشتیم
وقف ہنگامۂ طلاطم گشتیم
آخر چو گہر تہ نشین دریاست
اندر صدف خول خود گم گشتیم

علامہ عرشی کے ہندی کے استاد مہاشہ ہری امرتسری تھے، عرشی امرتسری کی پہلی تحریر جو روزنامہ امروز لاہور میں شائع ہوئی وہ ایک طویل تبصرہ تھا۔ تصانیف میں متفرق موضوعات پر تخلیقی کتب اور تراجم شامل ہیں، اُردو اور فارسی کلام بھی چھپ چکا ہے۔ فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ رسوا کیا مجھے (اردو شعری مجموعہ)
۲۔ نقش ہائے رنگا رنگ (فارسی شعری مجموعہ)
۳۔ مقدمہ حیات محمد: از محمد حسین ہیکل (ترجمہ)
۴۔ مقالہ شرح لفظِ دین از جرجی زیدان (ترجمہ)
۵۔ ملت ابراہیم خلیل۔ قرآن حکیم کی روشنی میں (شرح)
۶۔ احوال۔ حقیقتِ جنّات (شرح)
۷۔ علوم اسلام۔ حدیث کی روشنی میں (شرح)
۸۔ قربانی۔ تاریخ وصحف اولیٰ و قرآن حکیم (تحقیق)
۹۔ نقوشِ اقبال
۱۰۔ مسیحیت کی آغوش میں۔ (تحقیق)
۱۱۔ پیش گوئی قرآنِ حکیم
۱۲۔ تاویل وتنزیل۔ بہائی تحریک پر جامع کتاب (تحقیق)
۱۳۔ تصوف۔ مولانا حسین علی نقشبندی مجددی دیوبندی۔
۱۴۔ قرآن سے قرآن تک۔ تفسیر خواجہ احمد دین امرتسری (تلخیص)
۱۵۔ تفسیر۔ ڈاکٹر عبدالحکیم پٹیالوی (تلخیص۔ قلمی)
۱۶۔ تفسیر مولوی عبداللہ چکڑالوی (تلخیص۔ قلمی)

علامہ عرشی ماہنامہ البلاغ امرتسر، ماہنامہ البیان امرتسر، ماہنامہ فیض الاسلام، راولپنڈی کے

ایڈیٹر رہے ، روزنامہ امروز ، نظام المشائخ ، فاران ، پنج دریا ، اقبال ریویو ، سروش ، مہر و ماہ ، نگار ، چٹان ، ادبی دنیا ، لہران ، مدینہ ، پرواز ، اظہار ، المنبر میں دینی ، اخلاقی ، ادبی اور تاریخی مضامین لکھے ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی میں ۱۹۴۹ء تا ۱۹۸۵ء ایڈیٹر رہے ، آپ کی ادارت میں اس رسالے کے درج ذیل معرکۃ الآرا نمبر شائع ہوئے :

۱۔ قرآن کریم نمبر

۲۔ وحی نمبر

۳۔ سیرت نمبر

۴۔ صدیق اکبرؓ نمبر

۵۔ فاروق اعظمؓ نمبر

۶۔ علی المرتضیٰؓ نمبر

۷۔ امیر خسرو نمبر

۸۔ قائداعظم

۹۔ اقبال نمبر

ماہنامہ فیض الاسلام ، راولپنڈی میں علامہ عرشی نے معتکف ، عبداللہ فقیر "ع" اور ادارہ کے نام سے بیشمار مضامین لکھے ۔ اسی رسالے میں "مکتوب روحانیت" اور "معارف حدیث" کے مستقل عنوانات سے باقاعدگی سے لکھتے رہے ۔ علامہ عرشی کے جو آٹھ سو غیر مطبوعہ خطوط میرے مطالعہ میں آئے ان سے جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ عرشی امرتسری کی منظوم اور نثری تحریروں پر "آدمیت احترام آدمیست" کی مہر ثبت نظر آتی ہے اور ایک ایسے شخص کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جو بظاہر ضعیف و ناتواں اور منحنی سا نظر آتا ہے مگر اس کے اندر بیٹھا ہوا ہمیشہ بڑا مضبوط و توانا اور باہمت دکھائی دیتا ہے جو اس منحنی سے انسان کو نگر نگر قریہ قریہ لئے پھرتا ہے ، ان خطوط میں کبھی اس سے ہماری ملاقات لاہور میں ہوتی ہے ، کبھی شیخوپورہ میں تو کبھی نوشہرہ چھاؤنی میں ـــــ آج اسلام آباد میں تھا تو کل چک جمال (چکوال) میں براجمان دکھائی دیگا ۔ ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ کل ہی تو یہ بندۂ خدائے وحدہٗ لاشریک بدو کی ملہیاں میں تھا اور دوسرا خط بتا رہا ہے کہ دوسری شام وہ کراچی کے لئے روانہ ہو چکا

تھا۔اس سارے سفر میں ،اس ساری جہاں گردی میں ،ظاہر کے پردے میں جو مقصودِ سفر پنہاں ملتا ہے وہ ہے بندگان خدا کو رشد و ہدایت سے فیض یاب کرنا اور صراط مستقیم کی جانب رہنمائی ۔کس قدر خوش قسمت تھے وہ لوگ جو علامہ عرشی کے قریب رہے ،اس پیر و مرشد کے قریب جو اس دور کے روائتی پیر و مرشد سے خود تو دست بگریبان رہا مگر مخلوق خدا کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشن اور واضح راہ دکھاتا رہا۔ عرشی امرتسری نے انسان دوستی اور محبت کی ایسی شمع روشن رکھی جس پر جان نثار کرنے والے پروانوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو ، سکھ ،عیسائی ، دہریئے سبھی شامل تھے ،احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا صرف وہ نام جو مختلف دوستوں کو لکھے گئے خطوط سے جمع کئے ہیں۔ان کی ایک مختصر سی فہرست یہ ہے ،اس فہرست میں کوئی زمانی یا الفبائی ترتیب نہیں رکھی گئی :

علامہ اقبال ،مولانا جعفر شاہ پھلواری ،صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ، فیض ،عطا اللہ شاہ بخاری ،محمد دین تاثیر ،چودھری برہم دت قاصر امرتسری ،ملّا واحدی ،حکیم نیر واسطی ،حکیم محمد موسیٰ امرتسری ،خالد اسحٰق ایڈووکیٹ، شیخ محمد افضل ،ڈاکٹر محمد عیص عابد ،بابو کرم امرتسری ،میجر عبدالکریم خان ،میاں حیات بخش ،راجہ غلام قادر غبار ،رشید نثار ،کرنل خواجہ عبدالرشید ،وارث سرہندی ،پروفیسر سید عبدالرشید فاضل ،حفیظ جالندھری ، ماسٹر کرم بخش ،مرزا بیضا ،ولی وارثی ،مولوی ترنم ،—— اویس ابراہیم ۔

قیام پاکستان پر علامہ عرشی پہلے کراچی میں محمد احمد ٹبلا صاحب کے پاس پہنچے پھر تھوڑے عرصے بعد لاہور آگئے تھے ،بعد ازاں اپنے ہم زلف چودھری معراج دین کی ترغیب پر ساہیوال میں زرعی زمین خریدی اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ یہ زمین وفات سے قبل اپنے ہمزلف ہی کے ہاتھ فروخت کر دی اور اسکی قیمت کی شکل میں وصول ہونے والی رقم اپنے ورثا میں تقسیم کر دی۔اب علامہ عرشی کا ٹھکانہ لاہور میں گیتا بھون، لکشمی چوک لاہور کی اوپر والی منزل میں تھا اسے " دارالقرآن " بنا کر ماہنامہ البیان کا نیا ڈیکلریشن حاصل کر کے رسالے کا اجرا کیا ،جب مالی مشکلات کی وجہ سے یہ رسالہ بند ہو گیا تو آپ ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی سے منسلک ہو گئے ، قادر آباد اوکاڑہ میں ایک چھوٹا سا گھر بنوایا تھا جس میں رہتے بہت کم تھے ،موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنا ٹھکانہ بدلتے رہتے تھے لیکن یہ خیال زندگی بھر رہا کہ احباب میں سے کسی پر بوجھ نہ بنیں۔

باعمل علماء کے اس قحط زدہ دور میں عرشی امرتسری علم و حکمت کے پیاسوں کے لئے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ تھے۔" درویش خدامست "، کی اصطلاح جو صرف کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اس کی عملی تصویر

علامہ عرشی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ پنڈت برہم ناتھ دت قاصر نے علامہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے ایک کتاب "میرا بھائی" لکھی ہے جس میں علامہ عرشی کے علمی تبحر، انسان دوستی و محبت اور فکر و نظر کا ذکر بڑے خلوص سے کیا ہے۔ علامہ عرشی نے قرآن حکیم کا مطالعہ حضور نبی کریم صلعم کی زندگی کے تناظر میں کیا تھا اور آپ احیائے دین کے لئے عمر بھر سرگرم عمل رہے۔ اسلام کی مرکزیت کے لئے فرقہ بندی کسقدر مہلک ہے اس کا احساس علامہ عرشی کو بڑی شدت سے رہا اور انہوں نے ساری عمر ہر طرح کی فرقہ واریت سے آزاد رہ کر زندگی گزاری۔ علامہ عرشی کی زندگی حق گوئی و بے باکی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ ہر طرح کے صلہ و انعام کی خواہش سے بے نیاز جو بات ملک و ملت کے لئے سود مند سمجھی بلا خوف و خطر کہہ ڈالی۔ شاہوں سے اور شاہانہ انعام و اکرام کی تمنا و آرزو سے دامن بچا بچا کر زندگی بسر کی اور اس جہانِ فانی سے رُخصت ہونے پر تاسف و ملال کی جگہ نہ صرف لبوں پر تبسم رقصاں تھا بلکہ واصل حق ہونے کی تڑپ ایک عرصے سے بیقرار اور مضطرب کئے ہوئے تھی جس کا ذکر کئی احباب کے نام خطوط میں کیا ہے۔

غریقِ جلوۂ وحدت، خدا پرست، عاشقِ رسولؐ، مخلص و محب، انسان دوست، مبلغ کتاب و حدیث، بدعت و باطل سے برسرِ پیکار، تصویرِ صبر و شکر، زاہد و عابد حکیم، تاجدارِ شعر و سخن اور ممتاز معاصر اقبال یہ سارے عنوانات جمع کر لئے جائیں تو جو شخص اسرارِ کتاب کھولتا، کلام اقبال کی تشریح و تفسیر نہایت دلنشین انداز میں کرتا، رنجیدہ و غمگین احباب کے زخموں پر تسلی و تشفی کے مرہم کا پھایا رکھتا دکھائی دے وہ علامہ عرشی امرتسری ہوں گے۔ عشقِ رسولؐ اور پیروی رسولؐ اکرم کا اس سے زیادہ سچا اور بھرپور مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن عزیز و اقارب نے عمر بھر ایذا رسانی میں اور تکلیفیں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، ان کا نام لے لے کر اُن کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ سیّد غلام مصطفےٰ شاہ خالد گیلانی فرماتے ہیں کہ انہیں جنوری ۱۹۸۴ء سے جون ۱۹۸۵ء تک ہر ماہ باقاعدگی سے ۴۰۰/- روپے انجمن فیض الاسلام کے ذریعے ملتے رہے اور کوشش کے باوجود رقم بھیجنے والے کا نام معلوم نہ ہو سکا، علامہ عرشی کے انتقال کے بعد یہ عقدہ کھُلا کہ وہ فیض اسلام سے ملنے والے اپنے وظیفے کی رقم میں سے چار سو روپے گیلانی صاحب کو بھجوا دیتے تھے اور یہ تاکید کر دی تھی کہ شاہ صاحب کو اس کا علم نہ ہو کہ رقم کون بھجواتا ہے۔ عین ممکن ہے حیاتِ عرشی کے اس رخ کی اور بھی مثالیں موجود ہوں جو ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ ایسے غنی الطبع علمائے دین کی تعداد اس ملتِ بیضا میں بڑی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

تقسیم ملک سے علامہ عرشی کی امرتسر میں ایک چھوٹی سی زرگری کی دکان تھی جہاں شہر کے اہلِ علم و دانش حضرات کا مجمع لگا رہتا تھا، علامہ کھرے اور کھوٹے کی ملاوٹ کو حق و باطل کی تلبیس خیال کرتے تھے اور مناسب اُجرت پر حلال روزی کماتے تھے۔ علامہ کے ہاتھ میں چھوٹی سی ہتھوڑی ہوتی تھی جس سے زیور بھی ڈھلتے جاتے تھے اور گفتگو کہ طلسم معانی سے بھرپور ہوتی تھی سننے والوں کے قلوب کو ایک خاص شکل میں ڈھالتی جاتی تھی ایسا شاید اس لئے تھا کہ اس دکان پہ بیٹھنے والا شخص کوئی معمولی زرگر نہیں تھا جس کی دیانت اور عہد و پیمان کو گاہک شک کی نظر سے دیکھتے ہوں بلکہ یہاں تو وہ مرد قلندر براجمان تھا جو اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ

"ہتھ کار ول تے دل یار ول" (ہاتھ کام میں مصروف اور دل و دماغ یادِ محبوب سے بسے ہوئے)

علامہ عرشی اپنی دکان سے متصل درسِ قرآن دیا کرتے تھے جس پر "بین الاقوامی درس قرآن" کا بورڈ لگا ہوا تھا امرتسر بازار سرکی بنداں کی مسجد میں جمعہ کے روز خواجہ احمدالدین تفسیر قرآن پاک بیان فرماتے تو عرشی امرتسری وقفے کے دوران اٹھ کر سوال کیا کرتے تھے، خواجہ صاحب بڑی محبت سے جوابات دیا کرتے تھے، خواجہ صاحب کے احباب کا یہ حلقہ "امتِ مسلمہ" کے نام سے مشہور تھا، خواجہ احمدالدین اور مولانا ثناءاللہ کے درمیان تحریری مباحثے ہوا کرتے تھے اور دونوں طرف سے تحریر لے جانے والے میجر عبدالکریم خان ہوتے تھے۔

علامہ عرشی امرتسری کی ایک پہچان نہ صرف اقبال کے معاصر کے حوالے سے بنتی ہے بلکہ ان کا تعلق ان چند حضرات میں ہوتا ہے جو اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے بہت قریب تھے۔ قرآن حکیم، مثنوی مولانا روم اور کلام اقبال میں کئی باتیں وضاحت طلب ہوتی تھیں جن کی وضاحت کے لئے عرشی امرتسری نے علامہ اقبال سے راہ و رسم پیدا کی اور پھر یہ تعلق عمر بھر قائم رہا یہاں تک کہ اقبال مالکِ حقیقی سے جا ملے اور علامہ عرشی اکیلے رہ گئے۔ دونوں حضرات کی ملاقاتوں کے درمیان اگر زیادہ دنوں کا وقفہ آ جاتا تو اقبال بابا علی بخش کو بھیجتے کہ جا کر "مولوی کو بلا لاؤ"۔ علامہ اقبال عرشی صاحب کو محبت سے مولوی کہا کرتے تھے۔

اہل ہند کو اقبال کی بصیرت، معاملہ فہمی، استقبال پہ دور تک نظر اور دور اندیشی سے باخبر کرنے کے لئے عرشی امرتسری نے "اقبال کی پیش گوئیاں" لکھیں جس میں اقبال کے ایسے اشعار شامل کئے تھے جو ان پیش گوئیوں کے حامل تھے جو وقت گزرنے کے بعد صحیح ثابت ہوئیں۔

علامہ عرشی بلا کا حافظہ رکھتے تھے اساتذہ کے سینکڑوں شعر یاد تھے خود اُردو، فارسی، ہندی اور

پنجابی میں خوبصورت شعر کہنے پر قدرت کاملہ رکھتے تھے ، اس کی مثالیں ہمیں "تاثرات"[1] اور ان کے نجی خطوط سے ملتی ہیں جو وہ اپنے دوستوں کو لکھا کرتے تھے ۔اشعار کی تشریح ہمیشہ سامع کی علمی اور ذہنی استعداد دیکھ کر کیا کرتے تھے ۔ فارسی کے کلاسیکی شعراء کے کلام کا زیادہ حصّہ زبانی یاد تھا ، نظیری ، بیدل اور عرفی ان کے پسندیدہ شعراء میں سے تھے ۔علّامہ کا صوفی تبسم سے امرتسری کے ناطے بھی ایک تعلق استوار رہا حالانکہ عرشی امرتسری اور صوفی تبسم (امرتسری) دونوں کی دنیائیں مختلف تھیں دونوں کے مشاغل مختلف تھے ،صوفی صاحب کا ذکر آجاتا تو بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے ۔

ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

علّامہ عرشی جو دوسروں کی خدمت کے لئے سفر کی ساری صعوبتیں برداشت کر لیتے تھے اپنی ذات کیلئے کسی دوست کے سامنے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے ۔ ممتاز حسن[2] جیسے لوگوں سے دوستانہ تھا مگر طبیعت میں اس قدر استغنا اور قناعت و درویشی تھی کہ کبھی کسی مادی منفعت کے لئے ان سے نہیں کہا۔

عرشی امرتسری زندگی کے آخری ایام میں کم و بیش چھ سات برس تک ادارۂ فکرِ اسلامی کی پندرہ روزہ نشستوں میں باقاعدگی سے جاتے رہے ،مولانا سید جعفر شاہ پھلواری کے انتقال کے بعد جب مولانا عبدالرب مرحوم کے گھر پہ درس قرآن کی ذمہ داری عمر احمد عثمانی کے سپرد ہوئی تو اس درس میں قرآن پاک کی چند آیات کا ترجمہ و تفسیر عمر احمد عثمانی ہی بیان فرمایا کرتے تھے ۔ کبھی کبھی اس میں جناب طاہر المکّی بھی شرکت فرماتے تھے اس کے بعد علامہ عرشی کی دلنشین تقریر سامعین کے دلوں کی گہرائیوں میں اترتی جاتی تھی۔

علّامہ عرشی کہنے کو تو یہی کہا کرتے تھے کہ ان کی تعلیم تو مڈل پاس بھی نہیں لیکن قرآن و حدیث اور درس نظامی کی کتب کا اسقدر گہرا مطالعہ تھا کہ گفتگو کے دوران بڑے بڑے علماء کو یہی خیال گزرتا تھا کہ علّامہ کی نظر علوم متداولہ پر بڑی گہری ہے ۔ ماہنامہ فیض الاسلام میں علّامہ عرشی کے لکھے ہوئے مختلف کتب پر تبصرے چھپتے تھے اور اداریوں میں اہم ملکی مسائل اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ، حکومت کی حامیوں پر تنقید اور قرآنی آیات کی تشریح کے ساتھ ساتھ احادیثِ نبویؐ کی توضیح ہوا کرتی تھی یوں اندرونِ ملک

۱۔ ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی کا اداریہ " تاثرات کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔

۲۔ سی ایس پی افسر تھے اور ڈپٹی کمشنر رہے۔

اور بیرون ملک فیض الاسلام کے بے شمار قارئین اس رسالے کے ذریعے علم و حکمت موتیوں سے اپنی اپنی جھولیاں بھر بھر لیتے تھے ــــ کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت جہاں زیر تبصرہ کتاب کی خوبیوں کا ذکر فرماتے وہیں خامیوں کی نشاندہی بھی کر دیا کرتے تھے۔ الفاظ و محاورات کے استعمال پر ہمیشہ لکھنے والوں کی اصلاح فرماتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ انجمن فیض الاسلام کے باقاعدہ ممبر بنے اور ماہنامہ فیض الاسلام کے لئے پہلے "ذکر و فکر پھر تاثرات" کے عنوان سے اداریہ لکھتے تھے جو ۱۹۸۵ء تک جاری رہا۔

علامہ عرشی نماز کے بعد دعا فرماتے تو عموماً ابتدا سورہ الفاتحہ سے کرتے تھے اور "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" بار بار دہراتے اور پھر "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کو بار بار پڑھتے۔ سوز و گداز اور آہ و زاری میں ڈوبی ہوئی دعا کا ایک ایک لفظ بارگاہِ رب العزت میں شرفِ قبولیت پاتا نظر آتا تھا مبتدی بھی محسوس کرتے تھے کہ علامہ کی دعا عرش بریں تک پہنچ رہی ہے۔

تقسیم ملک کے وقت علامہ عرشی کی تمام کتب ضائع ہو گئیں جس کا صدمہ انہیں تمام عمر رہا، علامہ کو شروع ہی سے مطالعہ کی عادت تھی اور وہ ہمیشہ تدبر اور تفکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ شادی کے وقت آپ کے والد محترم نے بہو سے کہا کہ شوہر کی تمام کتابیں چھپا دو ورنہ یہ دیوانہ ہو جائے گا۔

علامہ عرشی کے بارے میں وارث سرہندی اپنی رائے کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔ "کسی کے کردار کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملے۔ مجموعی طور پر میرا اور عرشی صاحب کا کئی ماہ تک دن رات کا ساتھ رہا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، باتیں کرنا اور دوسرے مشاغل غرض ان کی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے جانچنے اور پرکھنے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ میں اس ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہر لحاظ سے ایک کھرے آدمی تھے، مگر کھردرے نہیں، اُن کے قول و فعل میں موافقت تھی، یہ ایک ایسی بات ہے جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے ورنہ عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ ع

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

مگر ان کا ظاہر اور باطن یکساں تھا، پابندیٔ وقت کے لحاظ سے بھی وہ مثالی آدمی تھے ان کا ہر کام مقررہ وقت پر ہوتا تھا۔"

۲۔ ماہنامہ فیض الاسلام، عرشی نمبر ۱۹۸۵ء

علامہ عرشی نہ اہلِ قرآن تھے نہ اہلِ حدیث، وہ ایک صحیح العقیدہ، حنفی العقیدہ مسلمان تھے، صوفیائے کرام سے ایک خاص عقیدت تھی، دعا کو بڑی اہمیت دیتے تھے، روحانی علاج کے بھی کسی حد تک قائل تھے، دعا کے فلسفے کے حوالے سے علامہ عرشی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

آؤ پھیلائیں احتیاج کے ہاتھ
متکبر ہے جو دعا نہ کرے

علامہ عرشی فکرِ اقبال سے بہت متاثر تھے اور اقبال کی صحبت سے پوری طرح فیضیاب ہوئے لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ علامہ عرشی نے اپنے بعد اقبالیات پر کوئی مستقل موضوع کی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ "بانگ درا" کی شرح علامہ عرشی مکمل کر چکے تھے جس کا مسودہ انجمن فیض الاسلام کے پاس محفوظ ہے مگر آج تک اسے کتابی شکل میں شائع نہیں کیا گیا۔

علامہ عرشی ایک طویل عرصہ تک مجالسِ اقبال کے خوشہ چیں رہ چکے تھے چودھری عبدالحمید کے نام خط میں اپنے اس شعر کی تشریح خود فرمادی ہے۔

ہم نے دنیا کو خوب دیکھا ہے
ہم کو دیکھا نہیں ہے دنیا نے

شعر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "..... مجھ سے زیادہ یہ شعر ملک صاحب[1] پر صادق آتا ہے نہ ان کی اولاد نے انہیں پہچانا اور نہ احباب نے لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ کسی کا شکوہ نہیں سب کی تعریف کرتے ہیں۔"

علامہ عرشی نے تلاشِ علم میں عالموں، پیروں، فقیروں اور جوگیوں تک سے مصاحبت اختیار کی، دہریت کے دور سے بھی گزرے۔ آخر ۶۵ سال کی عمر میں ایک عالم باعمل حضرت مولانا حسین علیؒ ساکن واں بھچراں ضلع میانوالی سے سلسلہ نقشبندی مجددی میں بیعت ہوئے، مولانا صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔

علامہ عرشی ایک درویش خدامست تھے، زندگی بھر بڑے بڑے عہدوں پر متمکن افسروں سے دور رہے کبھی کسی بڑے افسر سے ملنے کی کوئی سبیل اس افسر کی طرف سے نکلی بھی تو علامہ نے قصے،

۱۔ ملک جمال دین (امرتسر میں آپ مولوی بجلی کے نام سے مشہور تھے)

گاؤں کے لوگوں کے لئے بجلی، پانی، سڑک یا ہسپتال کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کہہ دیا، کبھی کسی ذاتی کام یا غرض کا اظہار نہیں کیا تھا۔ علامہ کا وجود ایک نعمت اور اللہ کی رحمت تھا وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو بقول سید عبدالرشید فاضل "رجالِ قوم" کہا جاتا ہے۔ علامہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں۔ "صوفیوں، سادھوؤں کے پیچھے بہت گھومتا رہا آخر تسکین اسی میں ملی " فاتبعونی یحببکم اللہ "۔ صوفیوں، سادھوؤں کے فنون بے اثر نہیں لیکن نجات کے لئے ضروری نہیں۔"

رئیس امروہی نے علامہ عرشی کی تلخیص "قرآن سے قرآن تک" (بیان للناس) پر اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

"علامہ[۲] محمد حسین عرشی نادر روزگار بزرگ ہیں موصوف نے حضرت[۱] خواجہ احمد الدین امرتسری مرحوم کی نایاب تفسیرِ قرآن " بیان للناس " (جسے قیام پاکستان سے قبل امتِ مسلمہ امرتسر نے سات جلدوں میں شائع کیا تھا) کی تلخیص تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات میں نہایت جامعیت سے " قرآن سے قرآن تک " کے پرلطف نام سے مرتب کی ہے اور کمال یہ ہے کہ علامہ عرشی نے تقریباً تمام قدیم و جدید تفسیروں سے ایسے مطالب بھی حواشی کی شکل میں لے لئے ہیں جن سے خواجہ صاحب مرحوم کی تشریح و تعبیر کی تائید نکلتی ہے ...... اس تفسیر کی نمایاں ترین منفرد خوبی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید سے ہی کی گئی ہے یعنی آئینے کو آئینے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے بڑی بھرپور کتاب ہے، خواجہ صاحب مرحوم نے جن مطالب کو سات جلدوں میں بیان کیا ہے علامہ عرشی نے انہیں ایک جلد میں پیش کر دیا ہے۔ علامہ عرشی امرتسری کا ایک شعر ہے:

آنکھ کی بولی آنکھ نے سمجھی
کیسے بول اور کیسی بات

سادگی کی یہی کیفیت گفتگو میں بھی اور معاشرتی زندگی میں نمایاں طور پر جھلکتی تھی، علامہ کے ایک دوست شیخ محمد افضل صاحب نے ایک بار سوال کیا " علامہ آپ طب کی تعلیم کے بعد شاعری کی طرف کیسے نکل گئے " علامہ نے جواب دیا۔ " طب میں نے شاعری کے لئے پڑھی تھی حکمت کے لئے نہیں۔"

علامہ عرشی حاجی محمد احمد ٹبلا صاحب کی دعوت پر ہر سال باقاعدگی سے کراچی جایا کرتے تھے

۱۔ علامہ اقبال نے بھی قرآنی تعلیمات میں فیض خواجہ احمد الدینؒ سے حاصل کیا تھا۔

۲۔ روزنامہ جنگ کراچی ۱۹۸۵ء

اور اس روایت کا آغاز دہلی سے ہوا تھا۔ دراصل علامہ کے ساتھ

گاہ ادھر گاہ ادھر حکم رہا وصل کی شب
ہم بچھاتے ہی اُٹھاتے رہے بستر اپنا

والا معاملہ رہا، کبھی شیخوپورہ میں تو کبھی لاہور، کبھی نوشہرہ، سیالکوٹ، جہلم، راولپنڈی، اور اسلام آباد۔ علامہ نے ایک طرح سے شہر شہر اور قریہ قریہ خود جا جا کر اپنا فیض بانٹا اور خوش نصیب تھے وہ لوگ جو فیضیاب ہوئے۔ علامہ نے قرآن پاک کا مطالعہ حضور صلعم کی زندگی کے تناظر میں کیا ہے اور سعدیؒ، حافظؒ، جامیؒ، رومیؒ، نظیری، بیدل، غالب، اقبالؒ، حالی، بلھے شاہؒ، بابا فرید شکر گنجؒ ان کے ملفوظات کو مہمیز لگاتے ہیں۔

حدیث نبوی ہے "اے عائشہؓ! جو لوگ دینی فرقے پیدا کرتے ہیں اور مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں یہ لوگ اہلِ بدعت ہیں اور اپنی خواہشوں کے غلام ہیں، یہ لوگ توبہ سے محروم ہیں، میں ان سے یہ مجھ سے بری ہیں" اور قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالےٰ ہوتا ہے۔

"جن لوگوں نے دین میں تفریق پیدا کی اور گروہ گروہ بن گئے، اے رسولؐ وہ تم سے کٹ کر الگ ہو گئے (یعنی تمہاری تعلیم اتحاد سے محروم ہو گئے)۔ علامہ عرشی نے ساری زندگی اس حدیثِ نبوی اور رشادِ ربانی کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائے رکھا۔ خود بھی ہر طرح کی فرقہ بندیوں دور رہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا دوسروں کو بھی اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

علامہ عرشی کی روحانی پیاس عمر بھر نہ بجھ سکی جس کا ذکر ایک[1] مضمون میں یوں کیا ہے: "راقم نے تلاوت قرآن کا معمولی سا ذوق حضرت خواجہ احمد الدینؒ امرتسری کی سال ہا سال کی صحبت سے حاصل کیا اور ذکر کی قدرے لذت مولانا حسین علی مذکور الصدرؒ کی خدمت سے حاصل ہوئی۔ نماز کی رغبت بھی ان بزرگوں کے فیضِ قربت اور اہل اللہ کی کتابوں کے کثیر مطالعے سے بہم پہنچی۔ اس سے پہلے بیشمار دروازوں کی خاک چھانی اور بے انداز کتابوں کا مطالعہ کیا تھا لیکن روحانی پیاس نہ بجھ سکی۔ ٹھیک ہی کہا ہے حضرت مولانا رومیؒ نے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

۱۔ "شاہ عبدالعزیز دہلویؒ": فیض الاسلام راولپنڈی جنوری ۱۹۵۱ء صہ ۲۸

علامہ عرشی مولانا رومیؒ کے علاوہ سحابیؒ[1] سے بھی متاثر تھے اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں: "میں سحابی سے بہت متاثر ہوں شاید اتنا ہی جتنا پیر رومیؒ سے، سحابیؒ صرف ایک شاعر ہی نہیں وہ ایک صاحبِ حال بزرگ ہیں جو اپنی وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ باطنی کو شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، وہ اپنی بھرپور جوانی میں دنیا کی لذات و خواہشات سے دستبردار ہو چکے تھے"۔

علامہ عرشی زاہد خشک نہ تھے ان کے قہقہے کی گونج تو کبھی کسی محفل میں نہ سنی گئی مگر جان محفل ہوتے تھے، بیٹھے بیٹھے کوئی ایسی پھلجھڑی چھوڑ دیتے تھے جس سے سننے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ جاتے لیکن وہ خود زیرِ لب مسکراہٹ سے آگے کبھی نہیں گئے تھے، بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بادلوں کی اوٹ سے ایک ساعت کے لئے بجلی چمک کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی ہو۔

قرآن فہمی میں علامہ عرشی اور علامہ اقبال دونوں کے پیر و مرشد خواجہ احمد الدینؒ تھے، اقبال نے اپنے خطباتِ مدراس کے سلسلے میں بھی خواجہ صاحب سے استفادہ کیا تھا۔ اس بات کا ذکر اقبال نے مکتوبات بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم میں کیا ہے، دینی مسائل پر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور گفتگو میں مابعد الطبیعیاتی مسائل پر طویل باتیں ہوئیں۔ خواجہ صاحب کے بارے میں اقبال اپنے خط بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم[2] میں لکھتے ہیں:-

"مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو ..... ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے البتہ دوسرے ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے"۔

منصور حلاج کے بارے میں علامہ عرشی کی اقبال سے ملاقات ایک اہم ملاقات تصور کی جاتی ہے، پہلے صوفی تبسم کے ذریعے دونوں طرف سے سوال جواب کا سلسلہ جاری رہا، عرشی مطمئن نہ ہوئے اور خود امرتسر سے لاہور آئے اور اقبال سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

۱۔ سحابیؒ کا زمانہ عباس اعظم صفوی کا عہد حکومت بتایا جاتا ہے وفات ۱۰۱۰ ہجری ہے۔ صائب نے اسے رباعی گویوں کا حاتم عظیم کہا ہے۔

۲۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کا تخلص پہلے اصغر صہبائی تھا۔ تبسم عرشی صاحب نے رکھا (مولانا عرشی: صوفی محمد گلزار تبسم، فیض الاسلام جون ۱۹۸۶ء)

علامہ عرشی کو فارسی سیکھنے کا شوق کس طرح پیدا ہوا، اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اپنے ایک خط میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کو لکھتے ہیں:

"..... حافظ مظہر الدین مرحوم کے والدِ محترم مولانا نواب[۲] الدین رامداسی اپنے زمانے کے سلطان الواعظین تھے، مثنوی مولانا روم بہت اچھی پڑھتے تھے، مولانا سے مثنوی سن کر مجھے فارسی سے عشق ہو گیا اور اس زبان کی تحصیل میں لگ گیا۔"

علامہ عرشی کے مضامین "طلوعِ اسلام" میں بھی چھپتے رہے ہیں، علامہ پرویز کے حوالے سے حکیم محمد موسیٰ امرتسری اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ر اگست ۱۹۸۷ء میں میجر عبدالکریم خان کو لکھتے ہیں۔

"میرے اور عرشی صاحب کے درمیان ایک بار دوران گفتگو ذکر غلام احمد پرویز صاحب کا چل نکلا تو عرشی صاحب نے فرمایا: اگر شاہ رفیع الدین دہلوی کا صرف ترجمہ قرآن الگ کر کے کسی عربی دان کو کہا جائے کہ اس کا عربی ترجمہ کر دو تو وہ جو کچھ بھی ترجمہ کرے گا قریب قریب قرآن کے مفہوم کے مطابق ہوگا مگر پرویز صاحب کے ترجمے کا اگر عربی ترجمہ کروایا جائے تو کچھ اور ہی کتاب تیار ہو جائے گی اور اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔"

علامہ اقبال اور علامہ عرشی ایک ہی ذوق و شوق کے مالک تھے جس کا ذکر علامہ اقبال کے مکتوب بنام عرشی مؤرخہ ۱۹ر مارچ ۱۹۳۵ء میں یوں ملتا ہے۔

"..... آپ اسلام اور اس کے حقائق کے لذت آشنا ہیں مثنوی رومیؒ کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیئے، شوق خود مرشد ہے میں ایک مدت سے مطالعہ ترک کر چکا ہوں اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔ افسوس ہے کہ ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

بہر حال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیئے مجھ سے کبھی کبھی ملتے رہیئے اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خیال میں نہیں ہوتے۔ یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے

۲۔ مولانا نواب الدین رامداسی اُردو کے مشہور ناول نگار نسیم حجازی کے خسر ہیں۔

ہے جس کو جاننے والے مسلمانان ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے۔۔۔۔۔"

علامہ عرشی اپنی اور اقبال کی ملاقاتوں کا ذکر اپنے مضمون "علامہ اقبال۔ ایک مردِ خدا مست"[۱] میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"۔۔۔۔میں اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے سوالات کی ایک مختصر سی فہرست بنا لیتا تھا اور حاضر ہو کر یکے بعد دیگرے عرض کرتا اور ان کے اشارات سے پوری طرح مطمئن ہو کر آگے بڑھتا جاتا۔ عموماً میں تنہا حاضر ہوتا تھا۔۔۔۔۔ آخری چند سال مرض کے ایام میں آپ کی روح مادی اثرات سے بہت کچھ آزاد ہو چکی تھی آپ کی صحبت میں ایک طالبِ حقیقت کو وہی حظ حاصل ہوتا تھا جس کی طرف عارف رومیؒ نے توجہ دلائی ہے:

یک زمانہ صحبت با اولیا۔۔۔۔

علامہ عرشی نے جامیؒ اور مولوی غلام رسول سے اپنی عقیدت و محبت کا ذکر نامۂ یعقوب بنام عزیزِ مصر کے حوالے سے یوں فرمایا ہے:

"۔۔۔۔۔۔۔۔جس خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کے دلوں کو درد و گداز کی نعمت سے نوازا ہے اس نے ان کو اس کے اظہار و بیان کی توفیق بھی بخشی ہے کہ اپنے سوزناک کلام سے پتھروں کو موم کر دیں۔ خال خال مصنف ایسے گزرے ہیں جو اپنے جذبات کا انجکشن اپنے الفاظ کے ذریعے دوسروں کے دلوں میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، انہی میں ایک ممتاز ہستی مولانا جامیؒ ہیں۔ کون مائی کا لال ہے جس کے سینے میں دل ہو اور وہ جامی کے اشعار گریہ یعقوب اور فغانِ زلیخا کا حال پڑھ کر بے تاب اور مجبورِ گریہ نہ ہو جائے۔ پنجابی زبان میں سب سے بڑھ کر یہ شرف مولوی غلام رسول کو حاصل ہوا۔ مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ میں نے جامیؒ کے حضور آنسوؤں کا جتنا خراج پیش کیا اس سے زیادہ مولوی غلام رسول کے قدموں پر نچھاور کیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ نامہ یعقوب پڑھا تو قاری و سامع دونوں ہی از خود رفتہ ہو گئے، گھگی بندھ گئی۔ پڑھنے اور سننے کا یارا نہ رہا۔ پھر تھوڑا دم لے کر آگے بڑھے تو وہی بادو باراں کا طوفان راہ روک کر کھڑا ہو گیا:

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب ۔۔۔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

۱۔ ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی اپریل ۱۹۷۴ء

تقسیمِ ملک کے وقت علّامہ عرشی اپنا کتب خانہ توحید باغ، امرتسر سے لاہور بحفاظت منتقل کرنا چاہتے تھے جس کے لئے انہوں نے ضمیر اظہر[1] صاحب کے بڑے بھائی کرنل رشید الدین خان کی خدمات بھی حاصل کیں لیکن کامیابی نہ ہوئی، ضمیر اظہر نے دورانِ ملاقات جناب عرشی کے امرتسر کے زمانے کے شب و روز کا ذکر بڑی محبت سے کیا اور ۳۸-۱۹۳۷ء کے ایک ایسے مشاعرے کے بارے میں بتایا جس کی صدارت سر عبدالقادر کر رہے تھے، علّامہ عرشی سادہ لباس میں تھے اور سر پر پگڑی باندھی ہوئی تھی، وہ خاموشی سے ایک بنچ پر بیٹھ گئے جو بہت پیچھے رکھا ہوا تھا۔ فیض احمد فیض نے انہیں دیکھ لیا اور پکڑ کر سٹیج پر لا بٹھایا، مشاعروں میں پنڈت ہری چند اختر، جوش ملیسانی، ساغر صدیقی، اختر شیرانی اور ضمیر جعفری شامل تھے۔ علّامہ عرشی نے بھی اپنی غزل سنائی اور خوب داد وصول کی۔ ضمیر اظہر نے ایک دعوت کا ذکر کیا جو فیروزالدین رازی کے ہاں تھی، عرشی نے بتایا کہ ان کے ساتھ چند نوجوان اور بھی ہوں گے، میزبان نے علّامہ عرشی کی فرمائش پر سرسوں کا ساگ پکوایا تھا، اس دعوت میں سیف الدین سیفؔ، ضمیر اظہر اور علاؤالدین[2] کلیم مرحوم شامل تھے۔

مجید جامی حضرت عرشی کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ "علّامہ عرشی مغلیہ دور میں ہوتے تو سعداللہ چنیوٹی اور عبدالحکیم سیالکوٹی کے ہم پلہ ہوتے، ایران ان کا مولد ہوتا تو سعدی، حافظ، صائب، کلیم، خیام، نظیری، عرفی اور انوری جیسے باکمالوں میں شمار ہوتے۔"

علّامہ اقبال نے ایک روز عرشی امرتسری سے فرمایا تھا "میں تو آپ کو مولوی سمجھتا تھا آپ تو بڑے عاشق مزاج نکلے"۔ اس کی تصدیق ایک ایسے واقعہ سے ہو جاتی ہے جس کے راوی شیخ محمد افضل ہیں، شیخ صاحب فرماتے ہیں ایک ملاقات کے دوران علّامہ عرشی نے کہا "میں نے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکا دیکھا جو کتاب کے مطالعہ میں غرق تھا، میں پاس کھڑا رہا، کافی دیر بعد اس لڑکے نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو میں نے کہا " من بہ تو مشغول و تو بہ صرف و نحو"۔

ایرانی سفارت خانے نے علّامہ عرشی کو یوم سعدی کی آٹھ سو سالہ تقریبات میں شرکت کے لئے کراچی مدعو کیا تھا جس میں حکومتِ ایران کی دعوت پر شیراز جانا بھی شامل تھا لیکن اس کا موقعہ ہی نہ آیا اور آپ

۱۔ ضمیر اظہر شاعری کرتے ہیں، امرتسر سے تعلق ہے اور عملہ ڈویژن سے ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

۲۔ علاؤالدین کلیم مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے انگریزی ادب کے استاد پروفیسر سراج کے چچازاد بھائی تھے۔

مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

وفات سے کچھ روز پہلے ایک عزیز ملازمت کے لئے راولپنڈی آئے اور واپسی پر میعادی بخار نے آلیا، دس روز بخار رہا، دو روز عالمِ استغراق میں رہے اور ۴ جون ۱۹۸۵ء کی شب بوقت گیارہ بجکر پانچ منٹ پر اپنے ربّ کے پاس واپس لوٹ گئے۔ ایک مردِ قلندر جو عمر بھر قوم کو اسرار و رموزِ زندگی سمجھاتا رہا وہ رخصت ہوا تو ذرائع ابلاغ نے ایک مختصر سی خبر بھی نشر نہ کی، علامہ عرشی ایسے محسنینِ ملت کا تو کچھ نہیں بگڑتا مگر ایسی بدقسمت اور ناسپاس قوم کو اس کوتاہی و غفلت کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ـــــ عرشی امرتسری رخصت ہوگئے، ہم اقبال کے ایک ممتاز معاصر، ایک مردِ قلندر، ایک صاحبِ علم و دانش اور ایک عالمِ باعمل سے محروم ہوگئے اور ریڈیو، ٹی وی خاموش رہے جبکہ کسی فلم ایکٹر کا انتقال ہو جائے تو ریڈیو، ٹی وی پر پروگراموں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ روزنامہ نوائے وقت نے دوسرے تیسرے روز ایک چھوٹی سی خبر شائع کی:!

قطعہ تاریخ وفات

ادیب شہیر، شاعر بے نظیر علامہ محمد حسین عرشی امرتسری المتوفی ۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ بمطابق ۴ جون ۱۹۸۵ء بروز چہار شنبہ۔

چل بسے عرشی قمر انا الیہ راجعون

یوم رحلت آپ کا سن پچاسی چار جون

مندرجہ بالا مضمون جناب راجا غلام قادر غبار مہتمم انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کو میجر عبدالکریم خان نے بھیجا تاکہ علامہ عرشی کی قبر کے کتبے پر کندہ کرایا جا سکے۔

علامہ نے وصیتِ عرشی کے عنوان سے درج ذیل ایک تحریر ڈاکٹر محمد عیض عابد کو ایک خط میں نقل کر کے بھیجی تھی۔

وصیّتِ عرشی

یہ وصیت سیّد عبدالرشید فاضل صاحب کے مکان پر کراچی میں بیٹھ کر لکھی اور ڈاکٹر محمد عیض عابد کو خط میں نقل کر کے بھیجی۔

"آج میں اللہ سے درست نویسی کی توفیق مانگتے ہوئے اپنے کچھ حالات لکھتا ہوں انہیں محفوظ رکھئے شاید کسی وقت کام دے جائیں۔

میں شاید بالغ نہیں ہوا تھا جب میرے والدِ محترم نے امرتسر دروازہ حکیماں میں ایک کچا کوٹھا بقیمت یک صد روپے خریدا۔ جس میں ساٹھ روپے اپنے پاس سے اور چالیس روپے میرے نانا (رحمۃ اللہ علیہ) سے لے کر ادا کیئے، پھر کچھ عرصے بعد دو سو روپے سود پر لے کر اس کو پکا بنایا اور اس میں اقامت اختیار کی، میرے دل کو سود خور کے تقاضے سخت دکھی کرتے تھے، میں نے اپنا کاروبار شروع کیا تو وہ قرض اُتارا۔ پھر مختلف شادیوں (بہن کی بیٹی کی دو شادیاں، اپنی دو شادیاں بھی) پر قریب قریب اپنی ہی کمائی خرچ کی۔ مکان کے اضافے میں جو رقمیں خرچ آتی رہیں (ہینڈ پمپ، برساتی، فرش وغیرہ) وہ بھی بتوفیقہٖ تعالےٰ مَیں ہی ادا کرتا تھا۔ پھر جب والدؒ نے اسے فروخت کر کے رقم ڈاک خانے میں رکھی اور ڈاک خانے کی کاپی ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں امرتسر میں ضائع ہوئی تو میری کوشش اور دت صاحب کی مدد سے بھارت سے اس کا ثبوت مہیا کیا اور یہاں کے ڈاک خانے سے حاصل کر کے والد صاحب کے پاس رکھوائی۔ بھائی کی اولاد پر صرف ہوتی رہی، یہاں تک کہ والد فوت ہو گئے۔ جو کچھ انہوں نے اپنی قبر کے لئے رکھا تھا وہ بھی سعید احمد کو دے دیا گیا۔ اس وقت کی شرعی تقسیم کے لحاظ سے یتیم پوتے پوتیوں کو کچھ نہیں مل سکتا تھا لیکن میرے والد کا تمام متروکہ ان کے پوتے پوتیوں کو پہنچا، مجھے اور میری بیٹیوں کو ایک کوڑی نہیں ملی اور ہم کو اس کی کوئی شکایت نہیں بلکہ مرحوم بھائی کی رحلت کے بعد اس کے یتیموں کی غریبانہ خدمت کرتا رہا اور اب یہ خیال ہے کہ گیتا بھون کے دو کمرے جو میرے قبضے میں ہیں سعید احمد کے قبضے میں آ جائیں اور اس کے بعد وہ میرے کسی متروکہ کا مستحق نہیں ہوگا۔ ہاں اگر کمرے میرے قبضے سے نکل جائیں تو وہ دوسرے وارثوں کے شرعی حصّے کا حق دار ہوگا۔ اس کے علاوہ گھر کے برتن وغیرہ اگر بیگم میرے بعد زندہ رہی تو اس کی ملکیت ہوں گے جسے چاہے دے۔ سکینہ بی بی یا سعید احمد کو اس مال کا لالچ نہیں کرنا چاہیئے۔ حسن آرا کی یتیم (عملاً) اولاد کو دے دیئے جائیں تو بہتر ہوگا یہ لوگ (حسن آرا معراج وغیرہ) میری اور بیگم کی جو خدمت خلوصِ دل سے کر رہے ہیں میں ان کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ کتابیں جو انجمن فیض الاسلام کی ہوں وہ انجمن کو پہنچ جائیں اور باقی ڈاکٹر عابد صاحب کو مل جائیں۔ یہ جو سلوک میں نے مرحوم بھائی کے یتامیٰ سے کیا فرض سمجھ کر کیا

۱۔ لاہور پہنچ کر ان کے لئے مکان اور گھریلو سامان کا انتظام کیا اپنے ایک افسر دوست بابو فضل کریم سے کہہ کر ملازمت دلوائی، دو مرتبہ پولیس کے شکنجے سے چھڑایا۔ کبھی کبھی نقد خدمت بھی کی۔ تینوں بھتیجوں خصوصاً چھوٹی بھتیجی کی شادی میں حصہ لیا زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔

اس کو بطور احسان جتلانے کی ضرورت نہیں ہاں اگر وہ یعنی سعید احمد میری وصیت پر مطمئن نہ ہو اور کچھ ناجائز لالچ کرے تو اس وقت مندرجہ بالا حقائق اس کے گوش گزار کر کے اس کو وصیت پر راضی ہو جانے کی کوشش کی جائے۔ اس تحریر کا متروکات سے متعلق حصہ الگ کاغذ پر نقل کر کے اس کی تین چار نقلیں اور بنا لی جائیں جن پر میں دستخط کر دوں گا اور وہ وصیت نامے کے ساتھ ٹانک دی جائیں گی۔

بقلم عرشی

مٹا سکے نہ گردش اسے زمانے کی
کھدا ہے وقت کے پتھر پہ نام عرشی کا

اقبال اور عرشی نے علمی و فکری نوادرات کا جو ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس کی موجودگی میں ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں مر کہاں سکتی ہیں، وہ زندہ رہتی ہیں اور قیامت تک تخلیق کا ایک ایسا عمل جاری رہتا ہے جس سے ایسے انسان سامنے آتے رہتے ہیں جن کی موجودگی اقبال و عرشی کو زندہ رکھتی ہے — اِس تخلیق کے سوتے کتابوں میں محفوظ اِن علمی چشموں سے پھوٹتے ہیں جن میں آبِ حیات کی تاثیر ملی ہو۔

من و اقبالؒ

تعارف دو قسم

علامہ اقبال مرحوم سے میرا تعارف دو طرح ہوا۔ اوّل قلمی، پھر عینی۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر اسلامی ممالک فرنگی استعمار کے جال میں سمٹتے اور گرفتار ہوتے جا رہے تھے۔ تمام عالمِ اسلام میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ہر طرف یاس کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ مدبرینِ عالم۔ اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان حالات میں علامہ اقبال (جن کی نظموں کا انجمن حمایت الاسلام کے عظیم اجتماعات میں ملک بھر کو ہر چیز سے زیادہ اور بے تابانہ انتظار ہوا کرتا تھا) ایک عرصے سے بالکل خاموش تھے۔ میرے دوست ماسٹر شیخ عبیداللہ امرت سری نے (جو علامہ اقبال کے انتہائی عقیدت مند تھے) مجھ سے کہا :۔

"علامہ کا غیر معمولی سکوت توڑنے کے لیے ایک نظم لکھو۔"

"میں نے کہا :۔" علامہ کو مخاطب کرنے کے لیے کسی بڑی شخصیت کی ضرورت ہے۔ میری کیا ہستی ہے؟ اور وہ میری عرض پر توجہ ہی کیوں دینے لگے؟"

شیخ صاحب بڑے مُصر قسم کے بزرگ ہیں۔ مجھے ان کے اصرار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور چند شعر لکھ کر "زمیندار" میں اشاعت کے لیے بھیج دیئے ـــــ اس زمانے میں ملک بھر میں تین ہی اخبار ایسے تھے جن کی اہمیت پورے ملک اور دوسرے ممالک میں بھی تسلیم کی جاتی تھی ـــ الہلال ہمدرد اور زمیندار۔ نظم شائع ہوئی تو دوسرے یا تیسرے ہی دن زمیندار ہی میں علامہ کا جواب شائع ہو گیا جس کے ساتھ مولانا ظفر علی خاں کا محاکمہ اسی وزن و قافیہ میں زینتِ اخبار تھا۔ میرے اور علامہ کے اشعار فارسی میں تھے۔ مولانا نے اُردو میں اظہارِ خیال فرمایا ـــ میری نظم کا مرکزی شعر یہ تھا:۔

اے توئی در آشیان و گلشنت برباد رفت
نغمہ ای ماندی و پرواز تو با صیاد رفت

علامہ کا مطلع یہ تھا :۔

دانی کہ چیست شیوۂ مستانِ پختہ کار　　عرشی! گمان مدار کہ پیمانہ ام شکست[1]

اس کے بعد علامہ کا سکوت ختم ہوا اور ان کی کئی غیر فانی تخلیقات ظہور میں آئیں۔ اس سکوت شکنی میں میرے ساتھ مولانا ظفر علی خاں اور استاذی حکیم طغرائی بھی برابر کے شریک تھے جنہوں نے میری تائید میں نظمیں لکھیں ـــــ یہ تھا میرا ان سے قلمی تعارف ـــــ اس کے باوجود مجھے اپنی ہیچ میرزی کے پیشِ نظر ان سے عینی تعارف کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

شاعر کی آگ میرے دل میں

تاہم یہ سعادت بھی میرے مقدر میں تھی۔ بات یہ ہوئی کہ ۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" شائع ہوا۔ میں نے بے تابانہ اشتیاق سے اس کو اوّل سے آخر تک دیکھ ڈالا۔ دورانِ مطالعہ میں میری آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے خاموش فریادوں کے ساتھ اس آگ کو اپنے اندر مشتعل پایا۔ جو شاعر محترم کے سینے سے نکل کر اشعار میں بھڑک رہی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں سیرِ افلاک میں شاعر کا ہم سفر ہوں اور ان کے الہامی مکالمات کو اپنے کانوں سے سن رہا ہوں۔ یہاں تک کہ فلک مشتری پہ حلاج، منصور حلاج سے ملاقات ہوئی۔ کلام حلاج کے بعض حصوں پر دل میں خلش پیدا ہوئی۔ میں نے پروفیسر صوفی تبسم سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے لاہور پہنچ کر میری بات علامہ تک پہنچا دی۔ انہوں نے جو کچھ فرمایا مجھے اس وقت یاد نہیں۔ لیکن میں اس پر مطمئن نہ ہو سکا۔ اسی طرح ادھر سے تردد، اُدھر سے توجیہہ ہوتی رہی۔ آخر صوفی صاحب نے کہا:

"یہ بات روبرو بیٹھ کر ہی صاف ہو سکتی ہے۔"

---

[1] :- یہ تقریر "یوم اقبال" منعقدہ ۱۶ / ۱۷ اپریل ۶۶ء کراچی کے لیے لکھی گئی تھی۔ منتظمین کی طرف سے صرف دس منٹ بولنے کی اجازت تھی۔ اسی وجہ سے اختصار کو ملحوظ رکھنا پڑا۔ بعض مقررین نے اس کی پابندی نہ کی اور دس کی بجائے پچیس منٹ تک پہنچ گئے۔ اس وجہ سے بعض دوسرے لوگوں کے لیے وقت نہ نکل سکا۔ اگلے روز ان کی تقاریر ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لی گئیں۔ جو منتظمین کی طرف سے روئیداد کی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ انہیں "پس ماندہ" تقریروں میں سے ایک یہ ہے جو قارئین "فیض" کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ قارئین کی سہولت، فہم اور اضافہ معلومات کے خیال سے اس کے ساتھ "تکملہ" ملحق کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اسے بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ علامہ سے بلا واسطہ یا بالواسطہ تعلق رکھنے والی ہر بات اب تاریخی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے بھی ان یادداشتوں کو حوالۂ قرطاس کرنا ضروری معلوم ہوا۔

[2] ۔ تاہم اوّلیت کا شرف شیخ عبید اللہ امرت سری ہی کو حاصل ہے جو اس کے اوّلین محرک تھے۔ حکیم صاحب کا قطعہ "تکملہ" میں دیکھئے۔

یعنی تعارف

سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس میں ہچکچاہٹ تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ صوفی صاحب میرا تعارف کرائے بغیر یہ مسئلہ چھیڑ دیں گے اور سرسری طور پر میں اپنے شکوک عرض کر دوں گا۔ چنانچہ ہم چند احباب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ۸ ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے۔ جب آپ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ صوفی صاحب نے میرے منشا کے خلاف جاتے ہی میرا تعارف کرا دیا۔ بات شروع ہوئی۔ چھ سات مرتبہ اِدھر سے سوال اُدھر سے جواب کا سلسلہ چلا۔ آخر میں میں نے محسوس کیا کہ وہ اس پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ میرا ان سے یہ تشنہ سا مکالمہ "حلاج و اقبال کے عنوان سے "نقوش اقبال" اور بعض دوسرے جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔

تلاشِ سالکِ باخبر

اس کے بعد پھر کچھ مدت تک ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء کے آغاز میں مجھے ایک صحرائی خلوت (ضلع منٹگمری کے کھیتوں) میں مثنوی رومی کے مطالعے کا موقع ملا۔ میں اس سے نہایت متاثر ہوا۔ دورانِ مطالعہ بعض جگہ اشکالات پیش آئے اور کسی سالک باخبر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خود رومی بھی بار بار اس قسم کے مشورے دیتے تھے:۔

یار باید راہ تنہا مرو — از سرِ خود اندریں صحرا مرو[1]

میں نے اپنی واقفیت کے مطابق اِدھر اُدھر تجسس کی نگاہ ڈالی تو " جاوید نامہ" اور "بالِ جبریل" کے خالق کے سوا مجھے کوئی ہستی نظر نہ آئی جو رُومی کے معاملے میں معاون ہو سکے۔ میں نے ایک خط کے ذریعے حضرت علامہ کو اپنے اضطراب و اشکال سے آگاہ کیا اور تسکین و اطمینان کے لیے مدد چاہی۔ آپ ان دنوں جاوید منزل میں منتقل ہو چکے تھے اور علالت کے سبب پریکٹس سے بھی دست کش ہو گئے تھے۔ خطوں کے جواب میں آپ کبھی تاخیر یا کوتاہی نہیں فرماتے تھے۔ علالت کے باوجود اپنے قلم سے فوراً جواب عنایت فرماتے تھے۔ چنانچہ تیسرے یا چوتھے ہی دن جواب آگیا۔ جس میں[2] اور باتوں کے علاوہ یہ الفاظ بھی تھے جو مجھے دعوت ملاقات دے رہے تھے۔

مکتوب علامہ

"قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیئے، مجھ سے بھی کبھی کبھی ملتے رہیئے۔"

اس کے ساتھ ہی بزرگانہ انکسار کرتے ہوئے لکھا:۔

اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں بلکہ اس واسطے کہ ایک قسم کا شوق رکھنے والوں

---

[1] ۔ یہ روحانی سفر تنہا مناسب نہیں، راستے سے باخبر ساتھی ضرور ہونا چاہیئے۔

[2] ۔ علامہ کا مکمل خط تکملے میں دیکھیے۔

کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوتے۔ یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے۔"

ملاقاتیں

اب ان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا جن میں وہ مجھے اپنے حسنِ ظن کی بناء پر جو بھی سمجھتے ہوں لیکن میں باقاعدہ درس کے بغیر اپنے آپ کو ان کا شاگرد اور رسمی بیعت کے بغیر ایک مرشد ہی سمجھتا رہا۔ جب بھی امرت سر سے لاہور آتا تو ریل میں بیٹھے ہوئے علمی، دینی، ادبی وغیرہ سوالات مرتب کر لیتا اور سٹیشن سے اترتے ہی سیدھا جاوید منزل پہنچتا۔ گلے کی مستقل تکلیف کے سبب معالجوں نے آپ کو کم گوئی کی تاکید کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود میرے ہر سوال پر علم و معرفت کے ابر گہربار بن جاتے تھے۔ جب تک میں خود ہی بس نہ کرتا، آپ کے فیض وارشاد کا سلسلہ جاری رہتا۔ آپ سے رخصت ہو کر میں (لاہور میں) اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو جاتا۔

ذکر میرا، ان کی محفل

اظہارِ حقیقت کی خاطر چھوٹے منہ سے بڑی بات کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ وہ عظیم ہستی جس کے دروازے پہ دُنیائے امارت و سیاست اور عالم علم و فراست کے اکابر و اعاظم نیاز مندانہ حاضر ہوتے تھے۔ اپنے غریب و مسکین چاہنے والوں کے اخلاص و عقیدت کے بھی سچے قدردان تھے۔ مجھے ان کی یہ ادا کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ صوفی تبسم جو اس عالمی مجلس میں موجود ہیں ان کو بھی یاد ہو گا کہ جب کبھی میری حاضری میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی تو صوفی صاحب (جو میرے امرت سری ہمسائے اور عزیز ترین دوست ہیں) کے ذریعے پیام آجاتا کہ:۔

"حضرت علامہ یاد فرما رہے ہیں۔ مولوی صاحب (راقم) مدت سے نہیں آئے کیا سبب؟"

یاد رہے کہ علامہؒ مجھے میری دینی دلچسپی کی وجہ سے "مولوی" کہا کرتے تھے حالانکہ میں کسی لحاظ سے بھی اپنے آپ کو اس لقب کا اہل نہیں سمجھتا۔ جب میں جاوید منزل پہنچتا اور علی بخش اجازت کے لیے اندر جاتے تو اسی لفظ سے اطلاع دیتے کہ

"امرت سر والے مولوی صاحب آئے ہیں۔"

فراغت ہوتی تو فوراً حاضری کی اجازت مل جاتی۔ کوئی صاحب پہلے سے بیٹھے ہوتے تو علی بخش کی چارپائی پہ بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا۔

رحلت کے بعد

آپ کی رحلت کے بعد اعزّہ واحباب کی کثرت کے باوجود لاہور سے میری دلچسپی بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ وہ پیاس جو اس چشمۂ علم وعشق سے بجھتی تھی اب اس کو بجھانے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ لاہور ـــــ اپنی لاکھوں کی آبادی والا لاہور مجھے سنسان اجاڑ اور ویران دکھائی دینے لگا۔ علامہ کے امرت سری عقیدت مند جو میرے ان کے مراسم سے واقف تھے میرے پاس اسی طرح افسوس کرنے کے لیے آتے تھے جیسے اس شخص کے پاس جس کا کوئی نہایت قریب بزرگ وفات پا گیا ہو۔

لاہور میں آج بھی کیا نہیں ہے ؟ اس تاریخی شہر کی گود میں بڑے بڑے عالم، فاضل، درویش صوفی، سیاست دان، شاعر اور ادیب سب ہی موجود ہیں۔ جلسے ہوتے ہیں۔ محفلیں جمتی ہیں۔ لیکن وہ درویش خدامست جس کے سینے سے اللہ کی آواز ایک ہوک بن کر اٹھتی تھی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ـــ نہیں خاموش نہیں ہوا۔ اس کے نغمے صدیوں تک ان فضاؤں میں گونجتے رہیں گے۔ لیکن صدیوں تک مادرِ گیتی ایسے فرزندِ جلیل کو جنم نہیں دے سکے گی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیم از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

تین بزرگ

ہر انسان کی سیرت وکردار کی تعمیر وتکمیل میں پس منظر اور ماحول کے بے شمار عناصر شامل ہوتے ہیں لیکن بعض موثرات اپنی اہمیت وخصوصیت کے لحاظ سے انمٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی معمول کے مطابق مجھے بھی بہت سی تصانیف، مصنفین اور دوسرے مختلف اشخاص سے واسطہ رہا لیکن زندہ شخصیتوں میں سے تین بزرگوں سے میں اتنا متاثر ہوا کہ بس انہی کا ہو کر رہ گیا۔

اوّل :۔ استاذ شعر وادب حکیم الشعراء حکیم فیروز الدین احمد فیروز طغرائی امرت سری۔

دوم :۔ استاذ تفسیر خواجہ احمد الدین امرت سری۔

اور آخری مرجع وماوائے طلب تھے۔ علامہ اقبال (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین)

جن کے ساتھ ایک ایک نشست کا اثر کیف وسرور بن کر کئی کئی دن تک قلب وروح پر طاری رہتا۔ امرت سر پہنچتا تو خاص احباب میرے سفر لاہور کی روداد سننے کے لیے منتظر ہوتے۔ میں علامہؒ کی

باتیں سناتا تو وہ بھی اسی رنگ میں رنگے جاتے جس کو لئے ہوئے میں جاوید منزل سے نکلا تھا ـــــ وہ رنگ کیا ہوتا تھا۔ انہی کے الفاظ پر اس کی نشاندہی کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں :-

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر — خوش تر آں درسے کہ گیری از نظر
ہر کسے زاں مے کہ می ریزد نظر — مست می گردد باندازِ دگر[1]

---

[1] ـ استادوں سے تم سینکڑوں کتابیں پڑھتے ہو۔ ان سے بہتر وہ درس ہے جو نظرِ صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق مردانِ خدا کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ

کے ملازمِ خاص علی بخش سے ایک ملاقات

علامہ اقبال کے ملازمِ خاص علی بخش کو ملے ہوئے مجھے کافی عرصہ ہوگیا تھا۔ علامہ کے مرض الموت میں آخری ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی رحلت کے بعد "جاوید منزل" کی طرف قدم ہی نہیں اٹھتا تھا۔ پچھلے دنوں مزارِ اقبال کے مجاور سے علی بخش کا پتہ پوچھا، تو اس نے بتایا کہ جاوید منزل ہی کے ایک گوشے میں مقیم ہے۔ چنانچہ میں ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ آنے والا ہے۔ دو چار روز ٹھہر کر پھر گیا تو پھر بھی یہی معلوم ہوا کہ ابھی نہیں آیا۔ آخر ۷ دسمبر ۱۹۵۳ء کی صبح کو پھر ادھر کا رخ کیا۔ کوٹھی میں پہنچا، ساتھ ایک رفیقِ سیر بھی تھا۔ ایک کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک نوجوان نکلا، اس سے علی بخش کا پتہ پوچھا۔ وہ امید دلا کر باہر نکل گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ علی بخش کو بلانے جا رہا ہے۔ چند منٹ انتظار کیا۔ آخر کمبل میں ملفوف ایک بوڑھا آدمی کوٹھی کی دوسری جانب سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ چہرے کا نچلا نصف حصہ کمبل میں چھپا ہوا تھا پاس پہنچا تو میں نے بڑھ کر کہا "علی بخش" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "مجھے نہیں پہچانا؟" اس نے کہا "نہیں"۔۔۔ میں نے بتایا کہ میں فلاں فلاں وقتوں میں فلاں دوست کے ساتھ آیا کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے "ہاں" تو کہہ دی لیکن شاید پوری پہچان پھر بھی نہیں آئی۔ آخر پندرہ برس کا زمانہ گزر گیا اور پھر ایک ایسا بوڑھا آدمی جس کی نظر سے علامہ کو ملنے والے ہزاروں آدمی گزرے ہوں، کس کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔ جو لوگ قریبی ہوں اور بار بار ملیں وہی یاد رہ سکتے ہیں۔ میں اپنے شہر سے کبھی کبھار لاہور آتا تو علامہ کی زیارت کر لیا کرتا۔۔۔ لیکن آخر میں مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ علی بخش مجھے پہچان گیا ہے۔

یہ تو اخبارات سے معلوم ہوا تھا کہ علی بخش کو علامہ کا ملازم ہونے کی وجہ سے حکومت پاکستان نے ایک مربع زمین لائل پور کے علاقے میں عطا فرمائی ہے۔ آج اس کی اپنی زبان سے معلوم ہوا کہ پونے تین سال کی تگ و دو کے بعد اب جا کر اس کا قبضہ حاصل ہوا ہے۔ اس نے نام لے لے کر بتایا کہ فلاں فلاں عہدیدار افسر اور وزیر میری بڑی ہی حمایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پنجاب کے موجودہ وزیرِ اعلیٰ کی حمایت بھی

مجھے حاصل تھی۔ سبھی لوگ علامہ کی عقیدت کی وجہ سے میرے خیر خواہ تھے۔ علاقہ متعلقہ کے ڈپٹی کمشنر بنفسِ نفیس میرے معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ہر طرف امیدیں ہی امیدیں ہر گوشے میں سہارے ہی سہارے ـــ لیکن پٹواری اور تحصیل دار کے طلسم کو کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی تھی۔ مجھے اس کام میں پونے تین سال لگ گئے۔ سات آٹھ سو روپیہ بھی خرچ[1] ہوا۔ ناجائز قابض ان دوزخ کے فرشتوں کو کچھ دے دلا کر خوش کر دیتا تھا اور وقت پر اِدھر اُدھر غائب ہو جاتا تھا۔ قبضے کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر اب خدا خدا کر کے یہ مشکل حل ہوئی۔"

میں نے کہا ـــ بھائی جب تم کو اتنی مدت، اتنا روپیہ اور اتنے رسوخ کے بعد کامیابی ہوئی تو جن کو یہ چیزیں حاصل نہیں اس ملک میں ان کا کیا حال ہوگا؟ ـــ اس تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کیا سچ مچ پٹواری، تحصیل دار اور نائب تحصیل دار کے پیٹ میں جو جہنم بھڑک رہی ہے اس ملک کے غریب ہمیشہ ہی اس کا ایندھن بنتے رہیں گے۔ خداوندانِ اقتدار کو ان کی خدا ناترسی اور حرام خوری کا کبھی کوئی علاج نہیں سوجھے گا؟ لاکھوں کاشت کار اور ان کے بیوی بچے اس ذریت ابلیس کے پاؤں کے نیچے ہمیشہ ہی کچلے جاتے رہیں گے۔؟

اے خدا اس ملک پر رحم کر! اس ملک کے حکامِ اعلیٰ کی آنکھیں کھول! مجھے ڈر ہے کہ غریبوں کی آہوں کا دھواں جمع ہوتے ہوتے فضا میں گھپ اندھیرا نہ پیدا کر دے۔

یہ کہانی لمبی تھی جو علی بخش نے تفصیل سے سنائی۔ اس کے بعد میں نے پوچھا ـــ یہ جو آج کل اخبارات میں علامہ اور ان کے والد کے مرزائی ہونے کی بابت بیانات شائع ہوتے ہیں ان کے متعلق تمہاری معلومات کیا ہیں۔؟

اس نے کہا ـــ میں ۱۸۹۴ء سے علامہ کے ہاں ملازم ہوں۔ یہ زمانہ ان کی نوجوانی کا تھا۔ بھائی دروازہ میں ہمارے ہاں روزانہ شام کو ان کے چند مخصوص دوست (شیخ عبدالقادر مرحوم وغیرہ) جمع ہوتے۔ مختلف قسم کی باتیں ہوتیں۔ بعض میری سمجھ میں آتیں اور بہت سی میری عقل سے بالاتر ہوتیں مرزائیت کا جب کبھی اس صحبت میں ذکر آتا تو علامہ ہمیشہ ہی اس کی مخالفت کرتے۔ باقی رہے ان کے والد محترم، تو میں نے ان کو بھی ہمیشہ اس فرقے کے خلاف ہی پایا۔ ملازمانہ تعلق سے پہلے کے حالات کا

---

[1] ۔ رشوت نہیں دی ورنہ شاید اتنی دیر نہ لگتی۔ یہ صرف کرایوں کا خرچ ہے۔

مجھے کچھ علم نہیں۔

ایک بات اس نے میرے پوچھنے کے بغیر خود ہی بتائی کہ بعض لوگ اس سے کچھ شبہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ بڑا صاحب زادہ آفتاب اقبال زمانہ طالب علمی میں بہت شوخ و شنگ اور ناہموار قسم کا بچہ تھا۔ علامہ اس کی روش سے تنگ دِل تھے۔ ان کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اسے قادیان کے سکول میں داخل کرا دیں، وہاں ماحول اچھا ہے اور تعلیم میں دینیات کا عنصر بھی داخل ہے۔ بس وہ چند سال وہاں تعلیم پا کر دلّی وغیرہ اور پھر ولایت چلا گیا۔ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہا۔

لاہوری پارٹی کے بعض نامور لیڈروں کا ذکر کر کے علی بخش نے کہا کہ وہ علامہ کے ہاں آتے جاتے تھے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی تھیں۔ ایک خاص صاحب سے علامہ کہتے "کیوں بھئی خوب ہو رہی ہے" وہ کہتے — "ہاں جی کیا کریں پیٹ کا دھندا ہے لیکن ہے مزے دار، دور دور ملکوں کی سیر کرتے ہیں تنخواہیں لیتے ہیں۔ سفر خرچ الگ ملتا۔ خوب گزرتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

آخر میں میں نے علی بخش سے پوچھا — علامہ نماز پڑھتے تھے؟ — اس نے کہا — تہجد اور فجر باقاعدہ پڑھتے تھے، تلاوتِ قرآن بھی التزام سے کرتے تھے۔"

میں نے کہا — "بعض وقت ایسا ہوا ہے کہ میں ان کے پاس بیٹھا ہوتا تھا اور نماز کا وقت آجاتا تھا، میں تم سے لوٹا مصلّیٰ وغیرہ منگوا کر نماز پڑھ لیتا تھا، مگر ان کی محفل اسی طرح جمی رہتی تھی۔"

علی بخش نے کہا — ہاں ٹھیک ہے، فجر و تہجد کے سوا دوسرے اوقات کی نمازوں میں آنے جانے والوں کی وجہ سے تساہل بھی ہو جاتا تھا۔

مکتوبِ اقبالؒ

کی روشنی میں موجودہ صورتِ حال

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ آج ہم میں موجود نہیں۔ لیکن ان کی دور رس بصیرت کا تمام سرمایہ بمصداق

"نوشتہ بماند سیہ بر سفید"

ہمارے پاس محفوظ ہے۔ انہوں نے جو کچھ اس وقت حال کے سٹیج پر اور استقبال کے پردے میں دیکھا آج ان کی رحلت کے بیس سال بعد ہماری نگاہیں اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا گراں قدر حصّہ سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے میں صرف کیا۔ ان کے معاصرین اور پیش روؤں میں اکبر۔ حالی۔ سرسید اور ان کے رفقاء بھی اپنے اپنے رنگ میں یہ خدمت انجام دیتے رہے تھے لیکن ہماری اکثریت کی گراں خوابی کا یہ عالم رہا کہ آخر انہیں با چشمِ نم کہنا پڑا ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

"متاعِ کارواں" تو بہت پہلے جا چکا تھا، اس سے بہت زیادہ ماتم اس بات کا تھا کہ "اہلِ کارواں" احساسِ زیاں سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ بقولِ حالیؔ خدا نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے

مگر وہ مرض جس کو آساں سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں ؎

نازک زمانہ

مرض کی یہ تشخیص صرف برصغیر کے مسلمانوں سے متعلق نہیں تھی بلکہ تمام عالمِ اسلام اس کا شکار ہو چکا تھا۔ علامہ جمال الدین افغانی اور شکیب ارسلان ایسے چند حساس آدمی تھے جن کے راستے میں اغیار کے علاوہ خود مسلمانوں کی طرف سے بے پناہ رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھیں۔ اگر ایک آواز جگانے والی اٹھتی تھی تو سو تھپکیاں سلانے والی اس آواز کو بے اثر کرنے کے لیے حرکت میں آجاتی تھیں۔ آخر جب علامہ کا زمانہ آیا اور انہوں نے اپنے پیش روؤں کی آوازیں آواز

ملائی اور جسدِ ملّی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ تشخیص کی کہ :۔

" اسلام کے لئے اس ملک (غیر منقسم ہندوستان) میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں ۔۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت اور عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں "

یہ علامہ کے ایک مکتوب کا اقتباس ہے جو انہوں نے ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا۔ سطورِ بالا کے ساتھ ہی ان کے قلم سے ایک عجیب بات زیبِ قرطاس ہوئی جو انہی کی بصیرت سے مختص معلوم ہوتی ہے فرماتے ہیں :۔

" عوام میں جذبہ موجود ہے مگر عوام کا کوئی بے غرض رہنما نہیں "

بے غرض رہنمائی تو سرسیّد اور ان کے چند ساتھیوں کے بعد قریباً ختم ہو چکی تھی لیکن قوم کے اندر جذبے کی موجودگی کا سراغ لگانا اقبال ہی کے مقدر میں تھا۔ اقبال نے اپنے کلام منثور و منظوم میں کئی جگہ اس کا اظہار کیا ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ذرا پیچھے مُڑ کر

یہ نم کی کمی بے غرض قیادت کا رونا ہے۔ دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ سرسیّد کے زمانے میں بے پناہ داخلی رکاوٹوں کے باوجود قوم کے ہوش مند طبقے نے پورے اخلاص و ایثار سے ان کی سیاسی و تعلیمی کوششوں کا ساتھ دیا۔ ان میں ایسے فراخ دل اصحاب بھی تھے جو بعض دینی مسائل میں سرسیّد سے قطعاً متفق نہ تھے لیکن ان کی مستقل قومی و ملکی تحریکوں سے عمر بھر وابستہ رہے۔ ان کے بعد کلکتے سے "الہلال" اور دہلی سے "ہمدرد" اور "کامریڈ" کی آواز بلند ہوئی تو اس پر مسلمانوں نے لبیک کی صدا بلند کی۔ پنجاب میں "زمیندار" نے صورِ اسرافیل کا کام کیا۔ اس کے سائے میں پل کر بہت سے روزنامے اور بہت سی انجمنیں وجود میں آئیں۔ عوام نے قریب قریب ہر تحریک کا جان و مال سے ساتھ دیا۔ تحریک خلافت اور تحریک احرار کے ہنگامے اور قائدینِ احرار

کی دعوت پر مسلمانوں کی سرفروشی اور مالی ایثار کی داستانیں، ہماری تاریخ کا اہم جزو بن کر رہ گئیں اس کے ساتھ ساتھ خاکسار اور نیلی پوش تحریکوں نے جنم لیا۔ ہمارے عوام کے جذبے نے ان کی آبیاری بھی اپنے خون سے کی۔ تحریک خلافت کے بطن سے ایک تحریک "ہجرت" کے نام سے شروع ہوئی۔ اس میں ہمارے عوامی جذبے نے جن بے پناہ قربانیوں کا ثبوت دیا اس کی مثال تلاش کرنا آسان نہیں۔ قیام پاکستان کے بعد "ختم نبوت" کے نام سے جو ہنگامہ کھڑا کیا گیا اس میں بھی جانباز جوان سر ہتھیلی پر لے کر میدان میں آگئے۔

کانگرس میں جب تک مسلمان شامل نہیں ہوئے تھے کانگرس ایک بے جان جماعت تھی۔ مسلمانوں کی شمولیت نے اس کو ایک حرکتِ فعال بنا دیا۔ یہ تحریکیں قریب قریب ہمارے سامنے ظہور میں آئیں اور اپنی ہوش ربا تجلّیاں دکھا کر مختلف شکلوں میں منتقل ہوتی رہیں۔ ان سے پہلے بھی جب کبھی مسلمانوں کو اسلام کے نام پر کسی مقصد کے لیے للکارا گیا، ان کے خون میں حرارت اور جوش پیدا ہو گیا۔ وہ ہر راہرو کے ساتھ جہاں تک ممکن ہوا اپنی پوری رفتار سے چلے۔ چنانچہ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی حرکتِ جہاد نے ملک و ملت کے اطراف میں جو گونج پیدا کی وہ اب تک دب نہ سکی۔ آج بھی ہم اس کے اثرات کو عظیم و ضخیم مجلدات کی شکل میں قوم سے خراج تحسین و قبول حاصل کرتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

جب ہم ان حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر اپنے حال و ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں علامہ نے یہ خیالات اس وقت ظاہر فرمائے جب مسلمانوں کے ہاتھ انگریز اور ہندو دونوں کی دوہری رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے راستے کی یہ دونوں رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ اب وہی لیگ جس سے اس بے بسی کی حالت میں معاشی مشکل کے حل کی امید کی جا رہی تھی، خود مختار ہو گئی۔ اس نے حکومت حاصل کر لی اور اسلامی آئین کو اپنانے کا فیصلہ بھی کر لیا لیکن اس کے نفاذ کی نوبت نہ آج آئی ہے اور نہ ہی کل اس کی کوئی امید ہے۔ عام مسلمان کی حالت جو علامہ کے زمانے میں تھی آج اس سے بدرجہا زیادہ زبوں و نزار ہے۔ برسرِ اقتدار طبقہ، اس کا نام مسلم لیگ ہو یا کچھ اور، فلاح عامہ سے بالکل بے گانہ ہے۔ اسلام سے اُسے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ان کے دل و دماغ اور رگ و ریشہ میں فرنگی نقالی رچ چکی ہے۔ ان سے خیر کی امید آج بالکل نہیں کی جا سکتی۔ علامہ کے لفظوں میں :۔

"تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی
مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔"

جیسے جیسے پاکستان کی عمر میں ایک ایک سال کا اضافہ ہوتا جارہا ہے ان الفاظ کی صداقت زیادہ سے زیادہ عریاں ہو کر سامنے آتی جارہی ہے۔ کروڑوں کی آبادی میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں نکلے گا جو پاکستانی قیادت پر مطمئن ہو۔ حالانکہ انگریز کے زمانے میں جہاں ہمارے دل انگریز دشمنی کے جذبات سے معمور تھے وہاں ہر فرقہ و جماعت میں کچھ ایسے لوگ بھی نکل آئے تھے جو انگریز کی خیر چاہتے تھے۔ ہم ان کو ٹوڈی وغیرہ کے القاب سے ملقب کرتے تھے لیکن ان کی "ٹوڈیت" کو جنبش نہیں آتی تھی۔ اور یہاں تو یہ حال ہے کہ خود اہلِ اقتدار اپنی خلوتوں کی گفتگو میں ملکی حالات پر سخت غیر مطمئن ہیں۔ ذمہ دار افراد کی تقریروں میں بھی اس بے اطمینانی کا نمایاں اظہار ہو چکا ہے لیکن اس اعتراف کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی کہ اس بے اطمینانی کی ذمہ داری خود ان پر ہی عائد ہوتی ہے جو عوام کے سامنے معصوم بن کر اس کا نوحہ پڑھتے ہیں۔

مرض بڑھتا گیا

ہر شخص جو اقتدار کی کرسی پر بیٹھتا ہے چند بار بار کے رٹے ہوئے فقرے بطور تبرک تلاوت کر دیتا ہے کہ:۔

"مہنگائی دور کی جائے گی، رشوت کا قلع قمع کیا جائے گا۔ نظم و نسق درست کیا جائے گا۔ بد دیانتی اور غداری کا خاتمہ کیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

لیکن ان مواعید و بشارات کے بعد ہوتا کیا ہے؟ مہنگائی اور بڑھ جاتی ہے۔ نظم و نسق میں مزید ابتری پھیل جاتی ہے۔ غریب کی پشت دشوار ترین زندگی کے بوجھ سے اور زیادہ کبڑی ہو جاتی ہے۔ غنڈہ گردی کا کوئی سدِ باب نہیں ہوتا۔ آمیزش اغذیہ کا کوئی چارہ نہیں کیا جاتا۔ چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ عوام اس کی وجہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ خود اربابِ اقتدار میں غالب عنصر ایسے لوگوں کا ہے جو اِن افعالِ شنیعہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو کیسے سزا دیں۔ وہ خود غرضی اور ذاتی منفعت کے چکر سے نکل ہی نہیں سکتے۔ جب تک حکومت کا پورا ڈھانچہ تبدیل نہیں ہو گا، جب تک بالکل نئے ذہن کے لوگ برسرِ اقتدار نہیں آئیں گے یہی ہوتا رہے گا۔ گیارہ برس سے ہماری خارجہ پالیسی ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی براہِ راست

انہی لوگوں پر ہے جو حکومت کے ستون کو کہیں قرار و استحکام پکڑنے ہی نہیں دیتے۔ اندرونِ ملک اضطراب کے باعث اور بیرونِ ملک رسوائی کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ یہ برسرِ اقتدار رہیں لیکن یہ چند لوگ اقتدار کی کرسیوں سے کچھ ایسے چپک گئے ہیں کہ ان کو اکھاڑ پھینکنا مشکل ہو رہا ہے۔ قوم کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا ہے۔ آخری سہارا انتخاب کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔

آخری سہارا

لیکن یہ لوگ انتخاب کو صحیح معنی میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ یہ موقع ہے ان لوگوں کے آگے بڑھنے کا جن سے علامہ مرحوم نے اپنے الفاظ ذیل میں کچھ امید باندھی تھی۔

"جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس (اسلام) کی
حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔"

اگر انتخاب کے موقع پر اہلِ احساس منظم ہو کر میدان میں نہ آ گئے تو قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی مزید ایک مدت کے لئے گرفتارِ گرداب ہو جائے گی جس کی سزا سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔

علامہ کا اضطراب

آج پاکستان اور دوسرے اسلامی ملک جس دوراہے پر کھڑے ہیں علامہ نے اپنے لفظوں میں اس کا اظہار اس وقت کیا تھا اور آج زندہ ہوتے تو آہیں بھر بھر کر یہی کہتے کہ :-

"میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا
اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے
ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔"

آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم اپنے آپ کو آزادی کا اہل ثابت نہیں کر سکے، اور دولتیں اہلیت کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ اونچے طبقوں کے لوگ برائے نام اونچے ہیں۔ علم و اخلاق اور عمل کے لحاظ سے ان میں کوئی اونچائی نہیں۔ علامہ نے اس حقیقت کو واشگاف کہہ دیا تھا :-

عالماں از علم قرآں بے نیاز — صوفیاں درندہ گرگ و مود راز
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب — چشمہ کوثر بجوئند از سراب
بے خبر از سرِ دیں اند ایں ہمہ — اہلِ کیں اند۔ اہلِ کیں اند ایں ہمہ

کرگساں را رسم و آئیں دیگر است
سطوتِ پروازِ شاہیں دیگر است

کوئی شبہ نہیں رہتا کہ علامہ مرحوم کا یہ قول کہ :۔

"عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں"

طلوعِ مقصد

بالکل حق و صداقت پر مبنی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں ہمارا یہی مقام تھا۔ قومی قیادت کی باگیں جن ہاتھوں میں تھیں وہ عموماً بے غرضی کے وصف سے محروم تھے۔ جوانانِ ملت کی بے پناہ قربانیاں بے مصرف ہو رہی تھیں۔ اگر کسی تحریک میں کچھ لوگ اخلاص کی گرمجوشی رکھتے تھے تو شعور کی کمی ان کی مساعی کو پروان چڑھنے میں مانع ہوتی تھی۔ ہر اہم معاملے میں بالخصوص اقوام کی دینی و سیاسی قیادت میں شعور و اخلاص دونوں بدرجۂ اتم ہونے چاہئیں۔ صرف شعور ہو اور اخلاص نہ ہو تو کام نہیں بنتا اور اخلاص شعور کے بغیر بھی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا ــــ پھر جب علامہ کی تحریک، مشورت اور رہنمائی سے قوم کو قائداعظم کی صورت میں ایک با اخلاص اور ذی شعور قیادت مل گئی تو اس نے ہزارہا رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا کر وہ مقام حاصل کر لیا جو اس کے لئے مشیت ایزدی میں مقدر ہو چکا تھا۔ اب اس دولت کے حصول کے بعد اس کی حفاظت و ترقی کا اہم مرحلہ درپیش تھا۔ اس کی تاسیس و تقویم کے لیے قائداعظمؒ کو چند سال کی مہلت مل جاتی تو یہ مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے ہو جاتا۔ ان کی رحلت کے بعد خان لیاقت علی خاں مرحوم ایک حد تک ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن قضائے مبرم نے انہیں بھی مہلت نہ دی۔ ان کی شہادت کے بعد سے اب تک قوم پھر اسی مقام پر آ پہنچی جس کی اطلاع عامہ مرحوم نے ۱۹۳۷ء میں دی تھی کہ :۔

"کوئی بے غرض رہنما نہیں"

منحوس سایہ

اس بے غرض رہنمائی کے فقدان کا منحوس سایہ یہاں تک پھیلا کہ اب ہر طرف یاس و جمود کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ بلاشبہ من حیث الملک پاکستان نے بعض اہم گوشوں میں خاصی ترقی کر لی ہے لیکن "بے غرض رہنمائی" کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ "ترقی" سمٹ سمٹا کر چند خاندانوں کی داشتہ ہو کر رہ گئی ہے۔ عوام کے حصے اس میں سے کچھ آیا ہے تو وہ روز افزوں افلاس، بے روزگاری مہنگائی بلکہ ضروریاتِ زندگی، ضروریاتِ صحت اور ضروریاتِ تعلیم کی کمیابی اور آگے بڑھ کر بعض صورتوں

میں نایابی ہے۔

خود غرض قیادت کی اصلاح اور عوام کو بیکار رجحانات میں آگے بڑھانے کا کام تین مؤثر گروہ کر سکتے تھے۔ وہ گروہ کون ہیں؟ علماء کرام، صوفیہ عظام، جدید تعلیم سے مرصع لیڈر اور اخبار نویس۔ انگریز کے زمانے میں یہ گروہ غلط یا صحیح کچھ نہ کچھ اپنی زندگی کا ثبوت دیتے تھے۔ اس پر بھی علامہ نے نظریہ اکثریت سے ان کے متعلق یہ فیصلہ کیا تھا کہ :۔

"علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیہ، اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔"

آج حصول آزادی کے گیارھویں برس، علامہ کے اس قول سے بیس برس بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء و صوفیہ بالعموم پہلے سے زیادہ جامد ہو چکے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی اپنی زندگی کا ثبوت دیتا ہے تو وہ فروعی عقائد میں مسلمانوں کی باہمی جنگ آرائی کی صورت میں۔ حفظ و بقائے ملّت اور اصلاح حالات کے لیے کوئی متحدہ کوشش نہ آج ہو رہی ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ باقی رہے اخبار نویس اور تعلیم یافتہ لیڈر — اس میں شک نہیں کہ پاکستان بھر میں چند روز نامے ایسے ہیں جو حکام کو ٹوکنے اور عوام کی حمایت کرنے میں ایک حد تک اپنا فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ ان کو اس راہ میں مشکلات بھی پیش آتی رہی ہیں۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ اخبار نویسوں سے الگ ایک فرقہ تعلیم یافتہ لیڈروں کا ہے۔ ان کا نصب العین عموماً آج بھی وہی ہے جو آج سے بیس برس پہلے تھا۔

"یعنی خود غرض ذاتی منفعت اور عزت"

بلکہ یہ نصب العین اب جنون کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ لوگ اس فکر سے بے نیاز ہو چکے ہیں کہ اگر خدانخواستہ پاکستان پہ آنچ آئی تو ان کا ملعون نصب العین اور یہ خود کہاں رہیں گے؟ یہ غافل جس کشتی کے تختوں کو اپنے گھر کے ایندھن کے لیے اکھاڑے ہوئے لیے جا رہے ہیں انہیں اس کا ہوش نہیں کہ یہ خود بھی اس میں سوار ہیں۔ اور درحقیقت یہی ان کا اور ان کی آئندہ نسلوں کا گھر ہے۔

معیشت

اسی ۱۹۳۷ء میں علامہ مرحوم نے اپنے ایک مکتوب میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ:۔

"آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لیے وقف ہیں اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصّہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ الناس کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ روز بروز لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلے کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلے کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین کو کما حقہ نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر ایک کا حق معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے۔"

عظمتِ قرآن بنظرِ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ نے مذاہبِ عالم کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا۔ تاریخِ ممالک کی ورق گردانی کی۔ کفر و الحاد کی وادیوں کو چھان مارا۔ فلسفے کے قدیم و جدید مکتبہ ہائے فکر کو ناقدانہ نگاہ سے دیکھا۔ قوانین و دساتیر کی باریکیوں کو پرکھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا سینہ علوم و اسرار کا بہت بڑا خزانہ تھا۔ گویا اسرارِ کائنات کے بے شمار دروازے اللہ تعالیٰ نے ان پر کھول دیئے تھے۔

یہ سب کچھ جاننے کے بعد ان کی عمیق و دقیق فکر کو پناہ ملی تو قرآنِ حکیم میں ملی۔ ایک امّی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی پیش کردہ کتاب پر ایک فاضل اجل اور علامہ دہر کا مطمئن ہو جانا اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا اس کے مندرجات سے دل کا مسحور اور آنکھوں کا اشک بار ہو جانا..... کتاب مجید کا یہ زندہ و تابندہ معجزہ نہیں تو کیا ہے۔ آج کل کے کور باطن دانش وروں کو کبھی اس نکتے پر غور کرنے کی توفیق نہیں ملی.....

آئیے آج کی صحبت میں علامہ کے ان اشعار پر نظر ڈالیں جو انہوں نے قرآن حکیم کی عظمت سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم　　حکمت اولا یزال است و قدیم

حکمت والا قرآن زندہ اور زندگی بخش کتاب ہے۔ اس کی حکمت ازلی و ابدی ہے جو کبھی زوال پذیر نہیں ہو گی..... "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" (کستوری وہ ہے جو خود کہے کہ میں کستوری ہوں نہ کہ عطار اس کی تعریفیں کرے) قرآن خود کہتا ہے .....

(انفالؑ) لوگو! رسولؐ تم کو ابدی زندگی (قرآن) کی طرف دعوت دے رہے ہیں..... یہی بات سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی نے کہی تھی..... "تم لوگ مُردوں سے علم حاصل کرتے ہو اور میں زندۂ جاوید سے" وہ زندہ جاوید اللہ تعالیٰ کے سوا اور اس کا علم قرآنِ حکیم کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے؟..... علامہ اپنے آپ کو "قلندر" کہتے ہیں ؎ "اگرچہ مُو نہ تراشد قلندری داند"

اور قلندر کے لیے مشہور و مسلّم ہے کہ ؎ "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید"

قلندر سنی سنائی نہیں ۔ بلکہ چشم دید بات کہتا ہے ۔ انہوں نے قرآنِ پاک کے متعلق جو کچھ کہا ہے تجربہ و مشاہدہ کی بناء پر کہا ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

کائناتِ زندگی کے اسرار کا مخزن قرآن ہے ۔ اس کی قوت بخشی ہے فانی کو بقاء حاصل ہو جاتی ہے یہ بھی قرآن کے اپنے ہی دعویٰ کا ترجمہ ہے ۔ آیات پیش کرنے لگوں تو بات طویل ہو جائے گی ۔

حرف او را ریب نے تا دیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

یہ بھی پہلی سورت (بقرہ) کی پہلی آیت کا ترجمہ ہے ۔ یعنی دنیا بھر میں صرف یہی ایک کتاب ہے جس کا یہ دعویٰ ۱۴سو برس سے فضائے عالم میں گونج رہا ہے کہ "لاریب فیہ" یہ کتاب ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے ۔ آج تک کوئی کتاب یہ دعویٰ نہیں کر سکی .... اور پھر بڑے بڑوں نے اس دعویٰ کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا ہے ۔ نام گنوانے لگوں تو ایک بڑی کتاب بن جائے گی ۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃ اللعالمینؐ

یہ دونوں مصرعے بھی دو آیتوں سے لئے گئے ہیں ۔ یعنی اس آخری اور مکمل پیامِ ربانی کے بعد اب وحیٔ نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے ۔ اس کے لانے والے کسی خاص قوم ، ملک اور زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہر قوم ، ہر ملک اور ہر عہد کے لیے رحمتِ عام بن کر آئے ہیں ۔ اب اس کی تاثیر دیکھئے !

رہزناں از حفظ او رہبر شدند   از کتابے صاحبِ دفتر شدند

بدوی عرب اور ان کے بعد مختلف اقوام و ممالک کے جرائم پیشہ لوگ اس کی تاثیر سے دنیا بھر کے ہادی و مرشد بن گئے ۔ پھر اس ایک کتاب کے فیض سے انہوں نے تصانیف کے انبار لگا دیئے جو ختم ہونے پر ہی نہیں آتے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری و ساری رہے گا ۔

اور آگے بڑھیئے آسمان سے بلند تر اور پہاڑ سے زیادہ گراں بار شعر کہہ گئے ہیں ۔

آں کہ دوش کوہ بارش بر نتافت   سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

یہ وہ کتاب ہے کہ پہاڑ اس کی عظمت و تاثیر کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے اور اس کی آیات

کے شکوہ و دبدبہ سے آسمان کا پتہ پھٹ کر رہ گیا۔ لو انزلنا ھٰذا القرآن علی جبل لرایتہٗ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ (حشر ع ۳) اگر ہم یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو اس کو پھٹتے اور دبتے ہوئے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتا۔ ؎

حیف اگر تاثیر اس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو کوہ جس سے "خاشعاً متصدعاً" ہونے کو ہے

عزیزانِ من! ایک اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیش کردہ کتاب کی تعریف و توصیف میں ایسے اشعار کون کہہ رہا ہے؟ مشرق و مغرب کے قدیم و جدید علوم پر حاوی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ اس کتاب کا، اس کے لانے والےؐ کا اور اس کے بھیجنے والے کا بے مثل معجزہ نہیں تو کیا ہے؟۔ اور سنیئے

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است این کتابے نیست چیزے دیگر است

میں بلند آواز سے پکار کر کہتا ہوں، وہ بات جو میرے دل کے اندر سے نکل رہی ہے کہ یہ محض ایک کتاب نہیں ہے — "یہ چیزے دیگر" ہے۔ اس "چیزے دیگر" کا مفہوم لفظوں میں نہیں سما سکتا — کوئی شخص اس کتاب میں ڈوب کر، اس میں غوطہ لگا کر، اس کے مقصد کو مدعا کو اپنی روح و قلب میں جذب کرکے اور اس کے ارشادات کو اپنے اعضاء و قویٰ پر طاری کر کے دیکھے — پھر وہ جس دنیا میں پہنچ جائے گا — وہاں اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ "چیزے دیگر" کیا ہے — ہم نے بڑے بڑے واعظ، معلّم، صوفی، مفسّر اور فقیہ و محدث دیکھے۔ لیکن اس "چیزے دیگر" کا عرفان کم بہت ہی کم دیکھنے میں آیا۔ جس کی طرف علامہ نے تجربتہً اشارہ کیا ہے — ایک اور پتے کی بات جو غالباً کسی نے نہیں کہی ان کے دل سے اٹھ رہی ہے ؎

مثل حق پنہاں وہم پیدا است او زندہ و پائندہ و گویاست او

اللہ تعالیٰ کی طرح اس کی کتاب بھی "ھو الظاھر و الباطن" — حیّ لا یموت ہے اور بلند آہنگ ہے — منادیاً ینادی للایمان ان آمنوا بربکم۔ پکارنے والا ایمان لانے کے لیے پکار رہا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ (آل عمران ع ۲۰) "یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی اُونچی آواز سے دنیا کو پکارا یا قرآن کریم جس کی آواز گھر گھر میں پہنچ گئی — (عثمانیؒ)

صد جہاں تازہ در آیات اوست عصر ہا پیچیدہ در آفات اوست

آنے والے ہر دور کے لیے اس میں رہنمائی موجود ہے۔ اس کے لمحات میں طویل طویل زمانوں کے

علوم و ضروریات پنہاں کر دی گئیں۔

علامہ کو اس بات کا دکھ عمر ستاتا رہا کہ نہ صرف عام مسلمانوں بلکہ ان کے رہنماؤں نے بھی قرآن کو محض ایک رسمی تبرک بنا دیا ہے اور اس کے بلند ترین مقاصد سے کوئی سرو کار نہ رکھا۔

بآیاتش ترا کارے جزیں نیست — کہ از "یاسینؔ" او آساں بمیری

یعنی اس زندگی بخش کتاب سے آسانی سے مرنے کا کام لیا گیا۔ مرنے والا مر رہا ہے اور مولوی صاحب اس کے سرہانے بیٹھ کر سورۃ یٰسین کی تلاوت فرما رہے ہیں کہ جان کنی کی تکلیف میں کمی ہو جائے۔ اللہ! اللہ! نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور نہ سننے والے کو اور اس کے لواحقین کو کوئی خبر کہ یہ کیا ہے؟ کہتے ہیں —— ایک پہاڑی بڑھیا جان کنی کی حالت میں مبتلا تھی —— نہ جان نکلتی تھی اور نہ کوئی افاقہ کی صورت پیدا ہوتی تھی —— اس تاخیر دو رنگ کو دیکھ کر اس کے ان پڑھ بیٹے نے کہا :۔

"اماں لے محمدؐ دے داناں اللہ تیری مشکل آسان کرے"۔ یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لو (یا ان کا کلمہ پڑھو) اللہ پاک تمہاری مشکل آسان کرے —— بڑھیا نے کہا "اوہ کون آہا؟" وہ کون تھا؟ —— بیٹے نے جواب دیا: "مہارا پیغمبرؐ آہا" ہمارا پیغمبرؐ تھا۔

بڑھیا بولی —— ساری عمر پرائے مرد دا ناں نہیں لتا ہن مرن ویلے کیوں لواں؟ یعنی عمر بھر کسی غیر مرد کا نام میری زبان پر نہیں آیا۔ اب موت کے وقت یہ کیوں کر ہو؟ (معاذ اللہ)

اسی طرح ایک نو مسلم عشق قرآنی سے متاثر ہو کر حمائل شریف گلے میں ڈالے گاؤں گاؤں پھرتا تبلیغ کر رہا تھا۔ ایک دور دراز گاؤں میں پہنچا۔ وہاں ہندو، سکھ اور مسلمان آباد تھے۔ پوچھتا ہوا ایک مسلمان کے دروازے پر پہنچا —— اندر سے آواز آئی —— "باہر ہی ٹھہرو۔ اندر نہ آنا"۔ ایک آدمی نکلا اور حمائل شریف کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ اس کو باہر ہی کہیں رکھ آؤ —— ابھی چند دن ہوئے، ہماری ایک بڑی بوڑھی مرگئی —— اس دن مُلّا قرآن کو لائے اور پڑھا تھا —— آج پھر تم لئے آرہے ہو۔

یعنی اس گھر میں (یا ان گھروں میں) قرآن اسی دن آتا ہے جب کسی کی روح پرواز کر رہی ہو —— خیریت و عافیت کے دنوں میں اس کو اندر لانا خطرناک سمجھا جاتا ہے —— یہ ہے ہمارا برتاؤ اس کتاب زندہ کے ساتھ جس کی طرف علامہ نے اشارہ فرمایا ہے۔

اب ہمارے اہالیان طریقت کا حال ملاحظہ فرمائیے!

صوفی پشمینہ پوش حال مست　　از شراب نغمۂ قوال مست

پشمینہ پوش صوفی وجد و حال اور قوالی کے سرتال کی شراب میں مست ہو رہا ہے۔

آتش از شعر عراقی در دلش　　در نمی سازد بقرآن محفلش

شعر و شاعری سے اس کے دل میں گرمی پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن اس کی مجلس کو قرآن موافق نہیں آتا ۔ صوفی کے بعد مولوی صاحبان پر تبصرہ فرماتے ہیں۔

واعظ دستاں زن افسانہ بند　　معنی او پست و حرف او بلند

از خطیب دو یلمی گفتار او　　با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

واعظ داستان گوئی اور افسانہ سرائی میں مشتاق ہے۔ بلند اور سریلی آواز میں سامعین کو مسحور کرتا ہے لیکن اس کے کلام میں کام کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ کلام اللہ کی بات نہیں کرتا ۔ خطیب بغدادی اور امام دیلمی کی باتوں کا سہارا لیتا ہے ۔ حدیث کی اقسام ضعیف ، شاذ اور مرسل اس کی معلومات کا سرمایہ ہیں۔

صوفیوں اور واعظوں سے مایوس ہو کر علامہ فقہاء کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ اس متقدس گروہ پر آپ کا تبصرہ حسب ذیل ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اب ان لوگوں کی طرف آئیے جو اٹھتے بیٹھتے قرآن، قرآن کی رٹ لگاتے ہیں۔ قرآن کے درس و تفسیر کو اپنا اثاثہ حیات بناتے ہیں۔ اسی پر لکھتے اور اسی پر بولتے ہیں۔ علامہ کی نگاہ عمیق ان کے باطن میں جھانکتی ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے بلا خوف لومتہ لائم ان کی زبان حقیقت ترجمان پر آجاتا ہے۔

؎ صاحب قرآن و بے ذوق طلب　　العجب، ثم العجب، ثم العجب

یعنی قرآن پکارنے والوں کا یہ حال ہے کہ سچی تڑپ اللہ تعالیٰ سے حقیقی ربط و تعلق، قومی اصلاح کا والہانہ جذبہ ان کے ہاں بھی مفقود ہے۔ یہ حالات دیکھ کر تعجب پر تعجب ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو خاشع و متصدع کر دینے والا کلام الٰہی ان کے دلوں پر کیوں اثر نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے پہلے سے کہہ رکھی ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۔ بقرہ ع ۹

ترجمہ:۔ تمہارے دلوں کی سختی یہاں تک پہنچ گئی کہ پتھر کی مانند ہو گئے۔ بلکہ پتھر سے بھی سخت تر۔ کیوں کہ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں۔ اور ان سے کچھ نہ کچھ پانی نکلتا ہے اور بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

عالمِ اسلامی پر ایک عالم گیر جمود طاری دیکھتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں۔ ؎

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است　　　ملت اندر خاک او آسودہ است

ایک بوسیدہ و فرسودہ دنیا ہماری نگاہ کے سامنے ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ملت اسلامی اس کی خاک میں مدفون ہو کر رہ گئی ہے۔ دنیا بھر کو زیرِ شمشیر لانے والے فتح مند اور کشور کشا مسلمان کہاں گئے اور کیوں ختم ہو گئے؟ اس سوال کا جواب اس شعر میں دیتے ہیں۔ ؎

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد　　　یا مسلمان مُرد یا قرآن بمُرد

مغلوں اور کردوں کی گرم جوشیاں ختم ہو گئیں۔ بڑے ہی دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ یا تو مسلمان (بحیثیت مسلم) موت کا شکار ہو گئے ـــــ یا (معاذ اللہ) قرآن کے حیات بخش تاثر میں کمی آ گئی ـــــ (نہیں نہیں ہرگز نہیں)

نماز و روزہ و قربانی و حج　　　سبھی باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

یعنی اسلام کی ہر چیز زندہ و پائندہ ہے۔ ہم جو حاملینِ اسلام کہلاتے ہیں۔ حاملین رسوم و رواجات رہ گئے ـــــ اصل اسلام کو فراموش کر بیٹھے۔ ہمارے اسلاف حقیقی مسلمان تھے ان کو اسلام نے غیر فانی عروج بخشا اور ہم اس کے ترک سے خوار و زبوں ہوئے۔ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر　　　اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

علامہ نے ترکِ قرآن کا مرثیہ بار بار دہرایا ہے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

مسلمانو! تم زمانے کی گردش کو اپنی ذلت کا سبب کہتے ہو۔ لیکن اصل سبب یہ ہے کہ تم نے عملاً قرآنِ مجید کو چھوڑ رکھا ہے۔ تمہارے کاروبار، حکومت، سیاست، تجارت، تعلیم، خانقاہ و

مسجد تک میں (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) قرآن کا عمل دخل نہیں رہا۔ بقول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم (بر روایت خدائے کریم تعالیٰ)

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (الفرقان رکوع ۳)

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا ـــــ "اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو مہجور کر دیا۔"

"آیت میں مذکور اگرچہ صرف کافروں کا ہے۔ تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس پر عمل نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی تصحیح قرأت کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کرکے دوسری لغویات (جن کو ہم نے دین کا درجہ دے رکھا ہے) یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجران قرآن (ترک قرآن) کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔ (شیخ الاسلام عثمانی)

اے چو شبنم بر زمین افتندهٔ ‏ ‏ ‏ ‏ در بغل داری کتاب زندهٔ

(اے قوم!) جو شبنم کی طرح زمین پر گری ہوئی ہے۔ مخالفین (یہود، نصاریٰ اور اشتراکیوں) نے تجھے پامال کر رکھا ہے ـــ تیرے پاس ایک زندگی بخش نسخہ، ایک زندہ کتاب موجود ہے۔ اس کے سہارے سے دوبارہ زندگی حاصل کر ـــ تو نے اس کی بجائے فرقہ وارانہ رسوم کو ایمان کا درجہ دے رکھا ہے۔

اے گرفتار رسوم ایمانِ تو ‏ ‏ ‏ ‏ شیوہ ہای کافری زندانِ تو

تیرا ایمان لایعنی، مسرفانہ، نمائشی اور گمراہ کن رسموں میں جکڑا ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تو مسلمان کہلاتے ہوئے کفر صریح کے قید خانے میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔

قطع کردی اَمر خود را در زُبُر ‏ ‏ ‏ ‏ جادہ پیمائی الی شئٍ نکُر

"زُبُر" کے معنی ٹکڑے اور صحیفے ہیں۔ یہاں دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔ (یعنی اے قوم!) تو نے اپنے اتحاد آموز دین کو پارہ پارہ کر دیا۔ یا کتاب اللہ کو چھوڑ کر بہت سی مختلف کتابوں کو اپنے اپنے فرقے کی بنیاد بنا لیا اور ایسے راستے پر چل پڑی جو تباہی و ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی

ے یہ صندوق کتب اب مجھ سے یارب اٹھ نہیں سکتا ‏ ‏ ‏ ‏ یہ مذہب ہے تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا

برادرانِ عزیز! ذرا سوچیئے! اگر یہی کتابوں کا انبار (بلکہ جہاز در جہاز کتابوں کے لدے ہوئے) دین کے نام پر بدوی عربوں کو پیش کئے جاتے کہ بھئی عمر بھر ان کے مطالعے میں کھپاتے کھپاتے مر جاؤ تو کوئی

ایک بھی ایسے اسلام کو قبول کرنے کی ذمہ داری نہ اٹھاتا۔ یہ موٹی سی بات ہمارے فرقہ پرست بزرگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی ؟ جس کو علامہ بار بار اپنے اردو، فارسی اور انگریزی کلام میں سمجھاتے ہیں ؟ اور بڑا زور دے کر حتمی طور پر فرماتے ہیں۔ ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

مسلمانوں کا بغیر قرآن بحیثیت مسلمان اس زمین پر زندہ رہنا ناممکن ہے، محال ہے قطعی طور پر ناشدنی ہے تم کہتے ہو کہ قرآن میں فلاں مسئلے کی تفصیل نہیں۔ اقتصادیات کا حل نہیں ہے۔ دستور وقانون کی کوئی شکل نہیں ہے۔ عبادات کے طور طریقے واضح نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے لیے دوسری کتابوں اور دوسرے "ازموں" کی مدد لینی پڑے گی۔ لیکن علامہ مذہبی کتابوں، قانونی دفتروں اور تمام مروجہ "ازموں" کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں ؎

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب   تو ازو چیزی کہ می خواہی بیاب

تم ذرا تلاوتِ قرآن کا حق تو ادا کر کے دیکھو، پھر تم پر کھل جائے گا کہ تمہاری ہر دینی و دنیاوی ضرورت بنیادی اور اصولی طور پر اسی سے حاصل ہو جائے گی۔ یہ تمہاری عقل و فکر کی رہنمائی کرے گی اس کی قائم کردہ حدود میں عقل و شوریٰ کی مدد سے تمام مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مختصر تفسیر القرآن کا خاتمہ اس شعر پر کیا ہے۔ ونعم ما قیل (کیا ہی اچھی بات ہے جو کہی گئی ہے) ؎

اوّل و آخر قرآں زچہ "با" مد "سین"   یعنی اندر دو جہاں رہبرِ ما قرآن "بس"

یعنی قرآن حکیم کی ابتدا حرف "ب" (بسم اللہ) سے ہوئی اور خاتمہ حرف "س" (والناس) پر ہوا۔ یہ دونوں حرف مل کر "بس" بن جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کافی۔ بہت۔ کثرت سے۔ تمام۔ کل (علمی اردو لغت از وارث سرہندی)

اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جہانوں میں قرآن حکیم ہمارا کافی و کامل رہنما ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمیں دوسرے رہنماؤں کی ضرورت نہیں۔ بقول اقبال اس سے ہماری ہر ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ ع "تو از و چیزے کہ می خواہی بیاب"

پاکستان اور دوسری اسلامی حکومتوں کی کشتیاں اسی وجہ سے ڈگمگا رہی ہیں کہ ان کو اپنے حکومتی د

غیر حکومتی امور میں قرآنِ حکیم کا سہارا حاصل نہیں ہے۔ علامہ اس کو ایک انقلابی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔

؎ چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

یعنی قرآن حکیم افراد وجماعت کے اندر محض جذباتی اور ہنگامی انقلاب پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ اگر کوئی فرد اس کی تعلیم کو روح کے عمق میں داخل کرلے۔ اپنی رگ رگ میں سمولے۔ اپنے افکار واعمال کو اس کے سانچے میں ڈھال لے تو وہ ایک بدوی گڈریے کی سطح سے اٹھ کر فاروق اعظمؓ بن جائے گا۔ اس کی شخصی تبدیلی ایک عالم کی بابرکت تبدیلی کا باعث ہوجائے گی۔

علامہ اپنے شعر میں ایک دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تاریخی یا واقعاتی دلیل کی طرف اشارہ کردیتے ہیں، جیسا کہ زیرِ نظر شعر میں واضح ہورہا ہے اور "شود" جو مضارع بمعنی "حال" وارد ہوا ہے کہہ رہا ہے کہ یہ محض کوئی ماضی کی کہانی نہیں ہے۔ بلکہ کتاب مجید کی دوامی تاثیر یہی ہے اب بھی اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا، انشاء اللہ۔ ناممکن ہے کہ آگ اس زمانے میں جلانے والی چیز ہو اور دوسرے دور میں ٹھنڈک پہنچانے والی بن جائے۔ اشیائے کائنات کے طبعی خواص کی طرح قرآن عزیز کی انقلاب انگیز اور زندگی بخش خاصیت ہمیشہ ہمیشہ اپنی تاثیر دکھاتی رہے گی۔ اس کی مزید وضاحت دیکھئے ؎

بندۂ مومن آیاتِ خداست ایں جہاں اندر برادچوں قباست

کتاب اللہ پر صحیح معنی میں ایمان لانے والا انسان اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت بن جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو آیات میں غوطے لگانے اور ان پر عمل کرنے والا مجسم آیت کیوں نہ بن جائے؟ اسی معنی میں بقول عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مجسم ومتشکل قرآن تھے۔ (کان خلقہ القرآن)

مومن جب آیت اللہ بن جاتا ہے تو وہ جامد وترقی ناپذیر نہیں رہتا بلکہ اس کے ہر امروز سے اس کا فردا بہتر ہوتا جاتا ہے۔ (الحدیث) اس کے نزدیک زندگی کا ہر دور لباس کی حیثیت رکھتا ہے جو پرانا ہوکر بدلتا رہتا ہے لیکن جسم برقرار رہتا ہے ؎

چوں کہن گردد جہانے برتنش می دہد قرآں جہانے دیگرش

جب ایک عالمی دور (لباس کی طرح) فرسودہ ہوجاتا ہے تو قرآن حکیم اس کو نئی دنیا عطا فرماتا ہے یعنی ہر ارتقائی دور کی رہنمائی کرتا ہے۔

یک جہانے عصر حاضر را بس است　　گیر اگر در سینہ دل معنی رس است

موجودہ زمانہ جس کو اپنی ترقی پر بہت ناز ہے۔ اس کے لیے بھی قرآن کا عطا کردہ ایک جہاں ایسے ہی کافی ہے جیسے گذشتہ زمانوں میں کافی ثابت ہوتا رہا ہے اگر اس میں ابدی زندگی نہ ہوتی تو کسی پرانے میوزیم میں کتبات و مخطوطات کی گرد میں پٹا پڑا ہوتا جس کو زائر و سیاح اہرام میں مدفون قدیم استخوان کی طرح ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھ جایا کرتے۔

قرآن حکیم کی زندگی بخش تاثیر کو آشکار کرنے کے لئے خانقاہ و حجرہ کی روش سازگار نہیں صرف تجوید قرآت و درس و تلاوت اور امید ثواب پر قانع ہو جانا ہی قرآن کا مقصود و حاصل نہیں ہو سکتا ؎

داد قرآن کی نہ دو بھائی! عمل اس پر کرو　　پیش درگاہ خدا داد کی حاجت کیا ہے؟ (اکبر)

چناں چہ علامہ فرماتے ہیں :-

اے کہ می نازی بقرآن حکیم　　تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم!

قرآن خوانی اور قرآن دانی کے دعوی دار کب تک حجروں میں مقفل بنے رہو گے؟

در جہاں اسرار دیں را فاش کن　　نکتۂ شرع مبیں را فاش کن

میدان میں نکلو! بڑے بڑے مفکروں، فلسفیوں، قانون دانوں اور حکمرانوں کو بتاؤ کہ عالمی مشکلات کا حل قرآن میں موجود ہے۔ ذرا اس پر عمل کر کے دیکھو۔ اس کام کے لیے پہلے ضرورت اس کی ہے کہ قرآن کو پیش کرنے والا خود اپنے اندر کے ابلیس کو پہچانے ؎

کشتنِ ابلیس کار مشکل است　　زانکہ او گم اندر اعماق دل است

اندرونی ابلیس کو قتل کرنا سخت دشوار ہے اس لیے کہ وہ رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ بقول حدیث شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کر رہا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ ؎

خوش تر آں باشد مسلمانش کنی　　کشتہ شمشیر قرآنش کنی

اس کو مسلمان بنا لیا جائے۔ یعنی اس کی گردن پر قرآن کی تلوار رکھ دی جائے۔ خواہشاتِ نفسانی کو قرآنی احکام کے سامنے مغلوب کیا جائے ؎

جز بقرآن ضعیفی روباہی است　　فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

قرآنی راہنمائی کے بغیر جنگ جوئی اور شجاعت بزدلی کے مترادف ہے۔ ؏

"جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

قرآن جس فقر (صدیقی و فاروقی) کی تعلیم دیتا ہے، اصل شاہنشاہی وہی ہے — قرآنی فقر کی مزید تشریح فرماتے ہیں۔

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر　　فکر را کامل نہ دیدم جز بذکر

قرآن حکیم کا فقر آج کل کی گداگری، خانقاہیت، مجاوری اور پیشہ ورانہ پیری مریدی نہیں۔ ان چیزوں کا تو وجود ہی نزول قرآن کے زمانے میں نہیں تھا بلکہ بعد میں صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین تک اس قسم کے کاروباری فقر سے بالکل ناآشنا تھے۔

قرآن کا فقر (بقول اقبال) ذکر اور فکر دونوں کے امتزاج سے مکمل ہوتا ہے۔ نہ فکر محض اور نہ ذکر محض فقر کہلا سکتا ہے۔ ذکر صرف حرکتِ زبان کا نام نہیں — بقول شاعر ؎

رام رام کر نیدیاں جبھ گھس گئی　　اندر رام نہ رچیا اہ کیہ دھاڑ پئی

زبان سے "رام رام" کا ورد کرتے رہے یہاں تک کہ زبان گھس گئی۔ لیکن یہ درد زبان سے آگے حلق کے نیچے اتر کر قلب و روح تک نہ پہنچ سکا۔ یہ کتنا بڑا ڈاکہ پڑ گیا؟ علامہ قرآنی ذکر کی تشریح فرماتے ہیں ؎

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب　　کار جان است ایں، نہ کار کام و لب

ذکر کی حقیقت کیا ہے؟ ذوق و شوق کو سطحی چادر اور رسمی نمود و نمائش سے بچا کر صحیح راستے پر ڈال دینا۔ یہ زبان اور ہونٹوں کا کام نہیں بلکہ یہ روح میں اتارنے اور سمو لینے کا عزم ہے۔ قرآن حکیم کا ایک نام "ذکر" بھی ہے۔ یعنی یہ ساری کتاب اور اس میں جو کچھ مندرج ہے سب ذکر ہی ذکر ہے۔ اگر حکام و عوام اس پر عامل ہو جائیں تو سب کے سب "ذاکرین" میں شامل ہو جائیں اور یہ فکر کی شمولیت کے بغیر نامکمل ہے۔ اسی وجہ سے قرآنِ حکیم نے ذکر اور فکر کی طرف بار بار دعوت دی ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسے "ذاکرین" کا اللہ کے نزدیک کتنا بڑا مرتبہ ہے۔

فاذکرونی اذکرکم واشکروا لی ولا تکفرون (بقرہ ع ۱۸)

تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور میرے شکرگزار رہو اور ناشکری نہ کرو۔

ذرا سوچیئے جس کو بڑا آدمی یاد کرے اسے کتنی خوشی بلکہ فخر ہوتا ہے پھر جسے ساری کائنات کا مالک یاد فرمائے اس کی خوش قسمتی کی کوئی انتہا ہو سکتی ہے؟ اور یہ بات بندے کے اختیار میں دے دی

گئی ہے کہ وہ جب چاہے اپنے خالق و مالک کی یاد کی سعادت حاصل کر لے۔ اگر وہ اپنی زندگی کو ذکرِ حقیقی (قرآن) کے مطابق بنالے تو کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے محروم نہیں ہو سکتا۔ بقول شیخ الاسلام عثمانیؒ

"..... تم کو لازم ہے کہ زبان سے، دل سے، فکر سے، ہر طرح سے ہم (خدا) کو یاد کرو اور اطاعت کرو، ہم تم کو یاد کریں گے یعنی نئی نئی رحمتیں اور عنایتیں تم پر ہوتی رہیں گی، ہماری نعمتوں کا شکر خوب ادا کرتے رہو اور ہماری ناشکری اور معصیت سے بچتے رہو۔"

علامہ بار بار قرآن ہی کی طرف آتے ہیں :۔

برخود از قرآن اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

اگر تم ابدی زندگی چاہتے ہو تو قرآنِ پاک سے استفادہ کرو، اس کو اپنے معمولات میں شامل کر لو۔ میں نے اس کے معانی و مطالب میں آبِ حیات کا مشاہدہ کر لیا ہے۔

اقبالؒ کے کرم فرما

دیکھا تو نہیں، سنا ہے کہ ایک شاعر نے شیخ سعدی کے "پند نامہ کریما" کو مسدس کی صورت میں تضمین کیا اور اس کے تمام اشعار کو امام حسین رضی اللہ عنہ کا مرثیہ بنا دیا۔

ایک اور ایسی ہی بات سننے میں آئی ہے کہ ایک فاضل نے نحو کی مشہور کتاب "کافیہ" کی ایسی شرح لکھی کہ اسے تصوف کی کتاب ثابت کر دیا۔ اس سے ان لوگوں کا مقصد کسی کو دھوکا دینا نہیں تھا بلکہ اپنی ذہانت کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت مہیا کرنا تھا کہ ہم چاہیں تو کسی مصنف کو اس کے اصلی اور واضح مقصد و موضوع کے خلاف بھی استعمال کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

یہ تو خیر انسانوں کی آپس میں تفریحات تھیں۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ بعض ضرورت سے زیادہ بے باک لوگوں نے خدائے جبار و قہار کے ساتھ بھی ایسی جسارت کرنے سے پرہیز نہیں کیا۔

تحریر و تصنیف کی پوری دنیا میں جو ہزارہا سال کو محیط ہے ایک اور صرف ایک کتاب ہے۔ اللہ کی کتاب جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے اس کے نزول کو چودہ صدیاں گزر گئیں۔ اس کے کسی لفظ، حرف، زیر، زبر، پیش، جزم یا تشدید میں آج تک کوئی تبدیلی یا کمی بیشی نہیں ہو سکی۔ حالانکہ قبل و بعد کے بے شمار مصنفوں کی کتابوں کے مختلف نسخوں میں الفاظ و عبارات کے کثیر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً "مثنوی معنوی" کا جو نسخہ پروفیسر نکلسن نے مرتب کیا ہے انہوں نے قدیم و جدید قلمی و مطبوعہ نسخے مہیا کر کے ان میں سینکڑوں اشعار الحاقی ثابت کئے اور سینکڑوں ایسے جو قدیم ترین نسخوں میں ملتے ہیں۔ لیکن عام مطبوعہ نسخوں میں موجود نہیں۔ پنجاب کے مشہور شاعر وارث شاہ کو کوئی بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ اس کا کوئی نسخہ اس وقت موجود نہیں ہے جس کو وثوق سے تمام و کمال اس کی تصنیف کہا جا سکے۔ میاں ہدایت اللہ، پیراں دتا اور استاد سوختہ امرتسری کے اضافہ شدہ نسخے بازار میں عام ملتے ہیں۔

اقبال اکادمی میں ایک خصوصی نشست مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۷۵ء میں پڑھا گیا۔

بائبل، جسے کتابِ مقدس کہا جاتا ہے، کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو اس میں بھی ایسی ہی دھاندلی مچی ہوئی ہے۔ کئی اناجیل جن کے صرف نام رہ گئے ہیں غائب کر دی گئیں۔ عبارات میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔ آج تک یہ بھی تحقیق نہیں ہو سکا کہ بائبل کے مختلف صحیفے کس کس زبان میں نازل ہوئے تھے ان کا ربانی متن کہیں موجود بھی ہے یا نہیں۔؟

ہمارے ہاں بھی کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو خدا کے حفاظتی بند کو توڑ کر قرآنِ حکیم کے اندر تو نہ گھس سکے لیکن انہوں نے باہر سے ممکن حد تک گولہ باری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ کئی آیتیں بلکہ سورتیں تک تصنیف کر ڈالیں اور مشہور کر دیا کہ یہ قرآن ہی کا حصہ تھیں۔ لیکن (نعوذ باللہ) قرآن سے نکال دی گئی ہیں۔ ایسی ایک سورت عہدِ عالم گیری کی تصنیف "دبستان المذاہب" میں موجود ہے جس کا نام "سورۃ نورین" لکھا ہے۔ اس میں قرآنی آیات کی فقالی کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بھی آپ نے سنا ہو گا کہ بعض لوگوں کے نزدیک اصل قرآن میں بہت سے پارے تھے۔ بعد میں تیس رہ گئے، اور بعض کے نزدیک متعدد سورتیں قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ سنا ہے کہ وہ مزید پاروں والا قرآن کسی کتب خانہ میں موجود ہے اور دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ستم گری کی تفصیل دیکھنی ہو تو "اہلِ سنت پاکٹ بک" ص ۲۲ سے ص ۵۹ تک مطالعہ فرمائیے۔ (تصنیف علامہ دوست محمد قریشی)

اس کے علاوہ ایک دوسری طرح کا حملہ قرآن کریم پر یہ کیا گیا کہ اس کے معانی و مطالب ایسے بیان کئے گئے جن کا عربی لغت و محاورہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو محمد حسین الذہبی کی کتاب "التفسیر والمفسرون" مطبوعہ قاہرہ میں دیکھیے جو تین مجلدات پر مشتمل ہے۔ اس میں اقسام تفسیر پر مورخانہ بحث کی گئی ہے۔ اس وقت اس کی تیسری جلد پیشِ نظر ہے جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تفسیر کی مشہور قسموں میں سے بعض کے نام سنیے :۔ تفاسیر امامیہ اثنا عشریہ، اسماعیلیہ باطنیہ، زیدیہ، خوارج، صوفیہ، اشاریہ، فلاسفہ، فقہا وغیرہ وغیرہ۔

اشاری قسم کی تفاسیر میں سے ایک تفسیر "التاویلات النجمیہ" بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ یہ سات مجلدات پر مشتمل ہے۔ اس کے دو مصنف ہیں :۔ شیخ نجم الدین (متوفی ۶۵۴ھ) اور علاء الدولہ (مولود ۶۵۹ھ) ان کے علم و فضل اور زہد و ورع کی بہت تعریف کی گئی ہے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں :۔ ہر آیت کے سات بطن ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ ان کے

نام یہ ہیں :۔ بطن قالبیہ ، نفسیہ ، سرّیہ روحیہ ، خفیہ اور حقیہ۔ لہٰذا ہر آیت کی سات تفسیریں ہوئیں جو ایک دوسری کے خلاف ہیں۔ مفسّر کے اپنے الفاظ یہ ہیں : علی ھذہ بطون اسبعتہ بسبع تفسیرات، کل یخالف الاخر (ص ۶۱)، حالانکہ قرآنِ حکیم اپنے بے اختلاف ہونے کو وحی الٰہی ہونے کی دلیل میں پیش کرتا ہے ــــ لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا (نساء ۸۲)

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں :۔ ہر آیت کے ستر بطن ہوتے ہیں بلکہ سات سو تک" ذرا سا نمونہ بھی چکھ لیجئے۔ سورۂ یوسف کی آیت قال نسوۃ فی المدینۃ ...... میں ذکر زنانِ مصر کا ہے جو عزیز مصر کی بیوی پر طعن کرتی تھیں کہ وہ اپنے غلام سے شغف رکھتی ہے۔ صاحبِ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہاں عورتوں سے مراد انسانی جسم کے اندر نفسانی، بہیمی، درندہ اور شیطانی صفات ہیں۔ اور عزیز کی بیوی سے مراد دنیا ہے اور اپنے جس غلام کو وہ اپنے دام میں لانا چاہتی تھی وہ قلب ہے" وغیرہ ذالک۔

ایک اور مفسر القاشانی ہے جس کو بعض لوگ صوفی اور بعض باطنی کہتے ہیں۔ اس کا نام عبدالرزاق (متوفی ۷۳۰ ھ) ہے۔ اس کی تفسیر الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلداً آمنا وارزق اہلہ من الثمرات کی تفسیر میں فرماتے ہیں : " بلد یعنی شہر سے مراد سینہ ہے جو قلب کا حرم ہے اور ثمرات یعنی پھلوں سے مراد روح کے معارف، حکمتیں اور انوار ہیں۔"

لکھنؤ کے نوابی دور کے متعلق ایک کتاب "بادشاہ بیگم" کے نام سے تھوڑا ہی عرصہ ہوا شائع ہوئی ہے۔ اس میں مشہور آیت ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم یعنی تم میں سے اللہ کے نزد زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے، کے معنی یہ لکھے گئے ہیں کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ تقیہ کرنے والا ہے۔

ان نمونوں سے اندازہ کیجئے کہ پورے کلام مجید کو کس طرح لغت و محاورۂ عرب، تفسیر نبوی ؐ، صحابہؓ، تابعین اور جمہور مفسرین سے بے نیاز ہو کر کہاں سے کہاں لے گئے۔ بقول علامہ اقبال :۔

ہوئے اس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق ــــ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کوئی صدیوں پرانے فلسفی شاعر یا مصنّف نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے، جاننے اور ملنے والے کئی کہن سال اشخاص ابھی

تک زندہ اور اس مجلس میں بھی موجود ہیں جن میں سے ایک یہ فقیر بھی ہے جو اس وقت آپ کے سامنے حاضر ہے۔ آخر یہ موجود اشخاص بھی، جن کی تعداد کم سے کم ہوتی جا رہی ہے، اپنی آخری منزل سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے علامہ کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی آنکھوں سے ان کے اعمال و عقائد پنہاں نہیں رہ سکتے تھے اور علامہ کے بعد خود ان کی لازوال تصانیف ان کے دین و مذہب اور افکار و خیالات کی سچی ترجمانی کرتی رہیں گی۔

لیکن فارسی کی مشہور کہاوت "دروغ گویم بر روئے تو" ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو علامہ کی تصانیف سے ایسے مطالب نکالتے ہیں جو ان کی اپنی فکر و عقیدہ کا ترجمان تو ہو سکتے ہیں، لیکن علامہ کی طرف ان کی نسبت بہتان صریح کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔

ہر انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں۔ وہ ماں کے پیٹ سے بالغ اور پختہ کار ہو کر پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی جسمانی ساخت اور وضع قطع کی طرح اس کے فکر و خیال میں بھی ارتقائی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ایک مغربی فلسفی نے کہا ہے کہ جو شخص اپنے خیالات نہیں بدلتا وہ دماغ نہیں رکھتا انسان گائے، بھینس نہیں ہے جو اپنے روز اول سے آج تک وہی ہے جو ہزارہا صدیاں پہلے تھی اور ایسی ہی ہمیشہ رہے گی۔

ایک صحبت میں علامہ نے کہا تھا:۔ "ذہنی لحاظ سے ایک شخص پر اس وقت موت طاری ہوتی ہے جب نئے افکار قبول کرنے کی صلاحیت اس میں نہیں رہتی۔"

اگر ایک نابغۂ روزگار شخص کبھی پہلی جماعت میں تھا اور عام بچوں کی طرح ننگ دھڑنگ پھرتا تھا تو اس کی اس حالت کو اس کی پوری زندگی پر تو منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ اپنے بچپن، جوانی، طالب علمی اور پھر پختگی اور بڑھاپے تک پہنچتے ہوئے مختلف ادوار سے گزرے اور وسعتِ مطالعہ و تجربہ کے ساتھ اپنے خیالات میں ارتقائی تبدیلیاں بھی کرتے رہے چنانچہ "باقیات اقبال" کے نام سے ان کا جو مجموعہ کلام ان کی رحلت کے بعد شائع ہوا ہے انہوں نے اس کی تمام منظومات کو اپنے کلام میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا جیسے غالبؔ نے اپنے "نسخۂ حمیدیہ" کی اشاعت کا خیال ترک کر دیا تھا۔

اس کا مطلب صاف ہے کہ علامہ ان خیالات سے دست کش ہو چکے تھے جن کی اشاعت

ان کو پسند نہ تھی۔ پھر ان کی جو نظمیں اور کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں بھی وہ بڑی احتیاط سے مقدم و مؤخر کے فرق کو واضح کرنے کے لیے سنینِ تصنیف درج کرتے رہے ہیں تاکہ قاری کو ان کے ارتقائی مدارج کا علم ہوتا رہے۔ اس قسم کے قبل و بعد کے تضاد و تخالف کو انہوں نے خود بھی محسوس کیا ہے۔

عجب نہیں جو پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشان نہیں تو کچھ بھی نہیں

یعنی انسانی خیالات میں اس قسم کا تفاوت فطری ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:۔

"آج کل اکثر تحریروں اور تقریروں میں اقبال کے کلام کے حوالے نظر آتے ہیں۔ لیکن کہنے والا اپنی حمایت میں کچھ اشعار چن لیتا ہے اور اقبال کو اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے:۔

متفق گردید رائے بوعلی با رائے من

"اقبال میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے وہ یا ارتقائے فکر کا نتیجہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف عبور کر گیا۔ جس طرح انسان طفولیت سے شباب اور شباب سے شیب کی جانب بڑھتا ہے علامہ خود فرماتے ہیں کہ:۔ "میں تشکیک اور تفلسف کی ظلمات میں سے ہوتا ہوا ایمان و یقین کے آبِ حیات تک پہنچا ہوں"۔ اسے تضاد نہیں کہہ سکتے۔ یہ ارتقا کوشش زندگی ہے"۔[1]

اب اگر کوئی منکرِ خدا مادہ پرست علامہ کے دورِ متشکک و تفلسف کے کسی شعر یا فقرہ کو پیش کر کے ان کو اپنا ہم خیال دہریہ یا متشکک ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو نہ صرف ان کے ساتھ بلکہ اپنے ضمیر کے ساتھ بھی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسی طرح ان پر ایک ایسا دور بھی آیا جب وہ وجودی صوفیہ کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ اگرچہ بعد میں اس کی سخت مخالفت کی اور اس کو الحاد و زندقہ تک کہہ دیا[2] لیکن فلسفہ وحدۃ الوجود کے بعض سطحی قائل ان کی پوری شاعری اور پوری زندگی پر اس عقیدے کی مہر لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے

---

[1] ایضاً، ص ۴۳۷

[2] شیخ عطاءاللہ، مرتب، "اقبال نامہ" حصہ اوّل، ص ۴۴: سراج الدین پال کے نام تیسرا مکتوب ۱۹ جولائی ۱۹۱۴ء

کلام میں سرمایہ داری کی مخالفت کی اور قرآنی تعلیمات کی بنا پر کی، جیسے کہ ہمارے قدیم بزرگ بھی حرصِ مال کی مذمت کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن بے خدا سوشلزم کے لفظی حامی جن کا عملاً اس سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ علامہ کو سوشلسٹ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف فرقے جو آپس میں سخت بیر رکھتے اور ایک دوسرے کو ضالی، ملحد، کافر اور واجب القتل تک کہنے سے دریغ نہیں کرتے سب اپنی اپنی تقریر و تحریر میں اپنے مطالب کے مطابق علامہ کا کوئی نثری فقرہ یا شعر ڈھونڈ نکالتے ہیں اور علامہ کی عام تعلیم اور زندگی کے سیاق و سباق سے الگ کر کے علامہ کے عقیدت مندوں اور عوام کو دھوکا دینے کی جسارت کرتے ہیں۔ حالانکہ علامہ نہ کسی سیاسی ازم کے معتقد تھے اور نہ کسی مخصوص اسلامی فرقے میں محدود تھے۔ وہ قرآنِ پاک کی اس نصِ صریح سے واقف تھے کہ فرقہ پرستی شرک کے مترادف بلکہ بعض صورتوں میں اس سے بھی بدتر ہے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد کے خطبۂ صدارت کی تمہید ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عام مسلمانوں سے الگ اپنا کوئی ٹولہ بنانا پسند نہیں کرتے تھے اور کسی مخصوص مکتبِ فکر و خیال کے پیرو بھی نہیں تھے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔ "میں کسی جماعت کا رہنما نہیں، نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں"۔[۴] ایسے پر معنی لفظ کسی معمولی دماغ میں پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف اسلام کے پیرو تھے۔ اسلام ان کا دین تھا، اسلام ان کی سیاست تھی، اسلام ان کی زندگی، اسلام اور صرف اسلام ہی کی طرف انہوں نے پوری دنیا اور خصوصاً مسلمانوں کو دعوت دی۔ ان کے کان میں یہ لازوال آواز آرہی تھی:۔

"ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعاً لست منھم فی شی" (انعام: ۱۶۰) یعنی جن لوگوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور بہت سے فرقے بن گئے (اے رسولؐ) تیرا ان سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ یعنی امت اپنے پیغمبر سے کٹ گئی۔ اس کے روحانی و اخلاقی فیضان سے محروم ہو گئی۔ جیسے ندی اپنے منبع سے محروم ہو جائے تو خشک ہوتی ہے۔ کیا اقبال اپنے آپ پر اور اپنی قوم پر یہ عذاب گوارا کر سکتے تھے۔

اور سنیے:۔ لاتکونوا من المشرکین: مسلمانو! تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ اب یہاں کوئی بھی اپنے آپ کو مشرک ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ لیکن قرآنِ پاک نے اس لفظ کو شرح

---

[۴] "مضامین اقبال" ص ۷۰

کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ وہ اس کے بالکل متصل واضح کر دیتا ہے کہ مشرک کی پہچان کیا ہے۔ من المشرکین من الذین فرقوا دینہم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیہم فرحون (روم: ۳۱ - ۳۲) مشرکین وہ ہیں جنہوں نے پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہو گئے بہت فرقے۔ ہر فرقہ اپنے اپنے فرقہ وارانہ خیالات کو صحیح اور دوسروں کو غلط ثابت کرتے رہنا بھی من جملہ صفاتِ شرک ہے۔

کیا ایسے مصنوعی اور انسانوں کے ساختہ پرداختہ اسلام کی طرف اقبال ایسا وسیع العلم شخص ساری دنیا کو دعوت دے سکتا تھا؟ اور خود مسلمانوں کے جنگ آزما فرقوں کو انہی میں سے کسی ایک پر جمع کرنے کا غیر ممکن خیال بھی کر سکتا تھا!

ہمارا یہ پارہ پارہ ہونا دیکھ کر ان کے منہ سے اس قسم کی فریادیں نکلتی رہتی تھیں:

رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نہ رشت　　کعبہ را کردند آخر خشت خشت

کیا وہ کسی ایک خشت کو ہاتھ میں لے کر کہہ سکتے تھے کہ یہی کعبۂ مکرمہ ہے۔ اس کی طرف رخ کر کے سجدہ کرو۔ اور سنیئے! قرآن اس سے آگے بڑھتا ہے۔ وہ جو تاریخی واقعات بیان کرتا ہے اس کا مقصد محض تاریخ یا اس کے سنین و شہور بتانا نہیں ہوتا۔ ان میں ہمارے لیے ہدایت، موعظت اور حکمت کے جواہرات ہوتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام پر خفا ہو رہے ہیں کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پوجا کرتے دیکھا اور منع کیوں نہ کیا۔ یہ ایک شرک جلی تھا اور ہارون پیغمبر کے سامنے ہو رہا تھا وہ خاموش کیوں رہے؟ اس حکیمانہ سکوت کی وجہ خود انہی کی زبان سے سنیئے:۔

انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی (طٰہٰ: ۹۴) (اے موسیٰ!) میں ڈرا کہ تو کہے گا کہ (اے ہارون!) تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات یاد نہ رکھی [۵]

ظاہر ہے کہ اگر اس موقع پر ہارون علیہ السلام اس مشرکانہ حرکت کے خلاف تقریر کرتے تو کچھ لوگ ان کے ساتھ ہو جاتے اور کچھ دوسرے اپنی ضد پہ اڑے رہتے۔ اس طرح قوم میں پھوٹ پڑ جاتی۔ انہوں نے وقتی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک شرک کے خلاف اقدام نہیں کیا۔ لیکن پھوٹ کو گوارا نہیں کیا۔ یعنی پھوٹ کو اس سے بھی بدتر سمجھا۔ خدائے زمین و آسمان ہم مسلمانوں کو صدیوں پہلے گزرا

۵۔ شاہ عبدالقادر دہلوی لکھتے ہیں کہ موسیٰ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ قوم کو متفق رکھیو۔

ہوا واقعہ کیوں سنا رہا ہے؟ اس میں کیا مصلحت اور سبق ہے؟ کاش مسلمان سمجھیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی مستند کتاب "اقبالِ کامل" میں علامہ کے ذاتی حالات میں ایک ذیلی عنوان "مذہب" قائم کرتے ہیں۔ اس میں لکھتے ہیں :۔

وہ مذہب کے پُرجوش مبلغ ہو گئے اور یورپ سے پلٹنے کے بعد وہ برابر مذہب کی تبلیغ کرتے رہے لیکن یورپ سے پلٹنے کے بعد انہوں نے جس مذہب کی تبلیغ کی وہ فرقہ آرائی سے بلند تھا۔ وہ اس اسلام کے داعی تھے جس کی دعوت خود قرآن مجید نے دی تھی..... ان کے اشارات بلکہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقیٰ صرف قرآن تھا۔ مثنوی رموزِ بے خودی میں فرماتے ہیں :۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآن زیستن

ہمارے صوفیہ کے ہاں قوالی میں علامہ کا کلام تصوف کی تائید میں وجد و حال کا مورد ٹھہرایا جاتا ہے لیکن خود علامہ کا تبصرہ اس پر کیا ہے؟ غور سے سُنیئے!

صوفی پشمینہ پوشِ حال مست　　از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش　　در نمی سازد بقرآں محفلش

"یعنی علامہ شعر بازی کی بجائے قرآنِ حکیم کو زیبِ مجالس بنانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے واعظ برسرِ منبر اپنی پسندیدہ روایات کے ساتھ علامہ کے اشعار کو اپنے فرقے کی تائید میں پیش کرتے ہیں اور علامہ انہیں بھی قرآن مجید کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں :

واعظ دستان زنِ رخسانہ بند　　معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دلمی گفتار او　　با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

صد جہاں باقی ست قرآں ہنوز　　اندکے خود را در آیاتش بسوز

"یعنی ہر دینی، اخلاقی، علمی اور سیاسی مقصد کے لیے اس کو رہنما بناؤ، اس کی حدود میں رہ کر عقلی، فکری اور شورائی ترقیاں کرو۔"[۶]

۶۔ "اقبال کامل"۔ ص ۵۵

علامہ چشمِ پُرآب اور قلب پُرگداز کے ساتھ قرآنِ حکیم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ وہ قرآنِ پاک کو ایک عالم گیر اور غیر زمانی دعوت کا داعیٔ عظیم سمجھتے تھے۔ قرآن نے خود کم از کم بائیس مرتبہ "یا ایھا الناس" کہہ کر پورے عالم انسانیت کو پکارا ہے۔ چھ بار "امتِ واحدہ" کا مطالبہ دہرایا ہے ہر دور اور ہر ملک و ملت کے انسانوں کو "نفسِ واحدہ" سے ان کی تخلیق تین بار یاد دلائی ہے۔ سات مرتبہ بنی آدم اور یا بنی آدم کہہ کر تمام نوعِ انسانی کے ایک کنبہ ہونے پر مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین، پیغمبرِ قرآن کا وصف رحمۃ اللعالمین اور خود قرآن کی شان ذکر للعالمین وارد ہوئی ہے۔ غور فرمائیے! جس عالی دماغ نابغۂ روزگار کی رگ رگ میں ایسی وسیع النظر اور محیط الکل کتاب کی آیات رچ چکی ہوں کیا وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص و محدود ٹولی یا انسانوں کے بنائے ہوئے کسی ازم میں محصور و مقید کر سکتا ہے ؟۔ وہ ازم جو کل بنے اور تجربے کی کسوٹی پر آ کر آج فیل ہو رہے ہیں کارل مارکس کی اشتراکیت کا جو تصوّر اس کے ذہن میں تھا آج اس کے نام نہاد پیروؤں کے کسی گوشے میں رائج نہیں۔ جتنے ممالک اشتراکیت کا دعویٰ کرتے ہیں سب اپنے اپنے ملک میں ایک دوسرے سے رقابت و ضدیت کی حد تک مختلف ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام قبل زمانۂ نوح علیہ السلام سے آخری نبوّت تک اپنے اٹل اصول کے لحاظ سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ آج تک کسی منافر رسول نے کسی متقدم نبی کی تنقید و تردید میں ایک لفظ نہیں کہا، سب ہی اپنے سے سابق انبیاء کی تائید کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ ایک برہان۔ قاطع ہے۔ اس حقیقت پر کہ اسلام انسانی دماغوں کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کا ماخذ و منبع ایک ہی واحد مطلق ذات ہے جس کی بات زمانہ گزرنے کے ساتھ ناقابل عمل نہیں ہو جاتی۔ قرآن بار بار اس عظمت و ابدیت کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ لاریب فیہ ــــ لا تبدیل لکلمات اللہ ــ لن تجد اللہ لسنۃ تبدیلا۔ علامہ اسی کا ترجمہ کرتے ہیں:

حرف او را ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

جو لوگ علامہ کو اپنے ساتھ خود ٹولے یا جماعت کا موید ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو قرآن اور علامہ دونوں کو نہیں سمجھتے یا جان بوجھ کر اپنی کسی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لیے وضع و جعل کے مرتکب ہوتے ہیں اور علامہ کو اپنی آڑ بناتے ہیں۔

علامہ جس پیغمبر ــــ فداہ امی و ابی ــ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق سے سرشار تھے وہ خود بھی کسی

نئے فرقے کے بانی نہیں تھے۔ کاش ہم قرآنِ پاک کو اس وسیع النظری سے دیکھتے جس کا وہ متقاضی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حضورؐ کی سیرتِ پاک کا مطالعہ کرتے! ارشاد ہوتا ہے: قل ما کنت بدعا من الرسل (احقاف: ۹) اعلان کر دیجئے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا۔ اس کی تفسیر علامہ عثمانیؒ کی زبان سے سنیے: ''میری باتوں سے اس قدر بدکتے کیوں ہو؟ میں کوئی انوکھی چیز لے کر تو نہیں آیا۔۔۔۔''

سورۂ انعام کی آیہ ۸۸ میں اٹھارہ انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ اجمالاً ان کی صفات، مراتب اور فضیلت کے بیان کے بعد فرمایا ہے: ہدیناھم الے صراطٍ مستقیم۔ ہم نے ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔ اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر مخاطب فرمایا ہے: اولائک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ ــــ یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت کی، سو تو ان کے طریقے پر چل۔ اس موضوع پر کہ اسلام کوئی نیا فرقہ نہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی نئے مذہب کے بانی و موجد نہیں تھے۔ آیات جمع کی جائیں تو ایک الگ مبسوط تصنیف بن جائے۔ تاہم تھوڑی سی روشنی اور دیکھ لیں: '' ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا (نحل ۱۲۳) پھر ہم نے تجھ کو حکم بھیجا کہ ابراہیم کے دین پر چل جو ایک طرف کا ہو رہا تھا۔

اس کی تفسیر میں لکھا ہے: ''۔۔۔۔ مقصد یہ ہے کہ حلال و حرام اور دین کی باتوں میں اصل (یعنی بنیاد) ملت ابراہیم ہے۔۔۔۔۔۔ آپؐ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا تاکہ اصل ملتِ ابراہیمی کو جو غفلت اور تحریف و تصرف بے جا کی دست برد سے ضائع ہو چکی تھی از سرِ نو زندہ اور روشن کیا جائے۔ اور شرک کی تمام رگیں کاٹ دی جائیں۔''

یہاں یہ حال ہے کہ ہٹلرازم ختم، فاشزم ختم، کمیونزم مسخ ــ کل پیدا ہوئے، آج جاں بلب اور اسلام ــــ بقول شاعر ؎

زاہد ز دیں برآمد و صوفی ز اعتقاد ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

وہی ایک بات جو سینکڑوں، ہزاروں برس کے بُعدِ زمانی اور سینکڑوں ہزاروں کوس کے بُعد ہائے مکانی کے باوجود کہتے چلے آرہے ہیں اور کہنے والوں کی بولیاں بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ وہ بات آج بھی زندہ و پائندہ ہے اور رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔

اگر علامہ سیاستاً سوشلسٹ اور مذہباً وجودی یا کسی بھی ایسے فرقے سے منسلک تھے جو قرنِ اوّل

کے بعد کی صدیوں میں پیدا ہوا تو کیا وہ تمام انبیاء جن کے متفقہ و مسلمہ دین کی طرف علامہ دعوت دے رہے تھے، سب کے سب سوشلسٹ یا ہمارے کسی نو پیدا فرقے کی جزئیات کے پابند تھے۔ خدارا انصاف کیجئے! خزف کو صدف اور صدف کو خزف کہنے والے کدھر جا رہے ہیں، اور علامہ کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلانے کے لیے کتنا بڑا جھوٹ پھیلا رہے ہیں؟ اور اسلام و قرآن کی روشنی سے محروم چند لوگ عقیدت مندانِ اقبال کو بھی اپنی تیرہ و تار فضا میں ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی ابتدائی وحی سے لے کر آخری وحی تک یہی فرماتا آ رہا ہے کہ "میں ایک ہوں، میرا کوئی شریک نہیں، تمام الہامی کتب اسی پیغام سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن انہی کتابوں کا دم بھرنے والے کروڑوں انسان کہتے ہیں کہ: "نہیں جناب! آپ ایک نہیں ہیں۔ تین ہیں"؛ وہ فرماتا ہے "میں بے مثل ہوں" اور یہ کہتے ہیں کہ "نہیں تیرا ایک بیٹا بھی ہے اور بیٹا باپ کے مثل ہوتا ہے اسی طرح اقبال یہ کہتے رہے کہ میں "مسلم" اور صرف "مسلم" ہوں، لیکن ان کے بعض شارح فرماتے ہیں کہ "نہیں جناب، آپ سوشلسٹ ہیں، وجودی ہیں" (وغیرہ وغیرہ) اب اس کا کیا علاج؟ سونا تو کسوٹی کی گواہی پیش کرتا ہے کہ "سونا ہوں" لیکن کچھ لوگ رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ "یہ تو پیتل ہے۔ کسوٹی اس کی اصلیت نہیں سمجھ سکی"۔

تاہم علامہ کی ان آوازوں کو کس طرح دبایا جا سکتا ہے جن میں وہ بار بار دلِ دردمند کے ساتھ قرآن سے لوگوں کی دوری اور بے نیازی کا ذکر کرتے ہیں:

در مسلمانانِ مجو آں ذوق و شوق
آں یقیں، آں رنگ و بو آں ذوق و شوق

عالماں از علم۔ قرآں بے نیاز
صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز

یہ تو مذہبی لوگوں کا حال ہے اب فرنگی مآبوں کی تعریف بھی سُن لیجئے۔

ہم مسلمانانِ افرنگی مآب چشمۂ کوثر بجوئند از سراب

یہ سراب کیا ہے؟ وہی تو ہے جس کی طرف مختلف ازم دعوت دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرنگی مآب

مسلمان توریت و انجیل کے داعی تو نہیں ہیں۔ ان کے متعلق آخری فیصلہ یہ ہے کہ :

بے خبر از سرِّ دین اند ایں ہمہ　　اہلِ کیں اند اہلِ کیں اند ایں ہمہ

خدارا سوچیے سرِّ دین بتانے والا شخص سوشلسٹ ہو سکتا ہے ؟

سوشلزم مذہب کو افیون کہتا ہے، خدا کی نفی کرتا ہے، یعنی "لا" کو اپنی آخری منزل سمجھتا ہے لیکن علامہ کہتے ہیں :

نہادِ زندگی میں ابتدا "لا" انتہا الا
پیامِ موت ہے جب "لا" ہوا "الا" سے بے گانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

علامہ جس مسلک کو پیامِ موت کہتے ہیں علامہ کے کرم فرما ان کو ایسی موت کا پیام بر ثابت کرنے پر تل گئے ہیں۔ بانیٔ اشتراکیت کارل مارکس پر علامہ کی تلخ تنقید کو ان کے کلام سے کون خارج کر سکتا ہے ؟

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل　　یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل !
زانکہ حق در باطل او مضمر است　　قلبِ او مومن، دماغش کافر است

اب اس حق کے اوپر چڑھے ہوئے باطل اور دماغی کفر کی شرح بھی علامہ ہی کی زبان سے سنیئے :

غربیاں گم کردہ اند افلاک را　　در شکم جوئند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک　　جز بہ تن کارے نہ دارد اشتراک

یعنی بادام کے چھلکے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ اس کے اندر جو مغز ہے اس کی کچھ خبر نہیں :

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس　　بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است　　بیخ او در دل، نہ در آب و گل است

بعض لوگوں نے مادیت سے کلی روگردانی کو اپنا مسلکِ حیات اور ذریعۂ نجات سمجھا۔ اس کو علامہ اصطلاحاً ذکر کہتے ہیں اور بعض نے اپنی تمام استعدادیں مادیت ہی میں کھپا دیں۔ ان کے خیال میں دراصل مادیت کچھ ہے ہی نہیں۔ اس کا نام فکر ہے۔ علامہ اقبال اسلام کی روشنی میں ترکِ دنیا اور غرقِ دنیا

دونوں کے خلاف ہیں۔ وہ توسط و اعتدال کی راہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

فکرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر　　　فکر را کامل ندیدم جز بذکر !

ذکر کی تشریح کرتے ہیں :

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب　　　کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب

یعنی صرف اللہ اللہ کہتے رہنے سے ذکر کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ذکر تو روح کی گہرائیوں میں اتار لینے کی چیز ہے جس کا مظہر انسانی زندگی کے تمام اخلاق و اعمال بن جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے انفاق فی سبیل اللہ کا ایک مکمل نظام قائم کیا ہے جس کی تشریح ہمارے معاشیات کے ماہر علماء کئی کتابوں کی شکل میں کر چکے ہیں۔ علامہ اس کا ذکر جا بجا کرتے ہیں :

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ　　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ !

جب قرآن کے اندر زر و مال کی افراط و تفریط کا علاج و قانون موجود ہے تو ہم کو قرآن سے باہر دہریت میں اس کی تلاش کی کیا ضرورت ہے ؟

افسوس تو اس بات کا ہے خود مسلمانوں نے بقول علامہ اپنی عملی زندگی سے قرآن کو خارج کر رکھا ہے۔ اگر وہ اس پر عامل رہتے اور اقوامِ عالم ان کے قابلِ رشک قرآنی معاشرے کو دیکھتیں تو خود بخود اسلام کی طرف منجذب ہو جاتیں۔ قرنِ اول میں اس کے ثبوت ملتے ہیں جب مسلمان اپنے اعلیٰ کردار سے اغیار کے دل جیت لیتے تھے۔ علامہ اسی بے عملی اور مقصودِ قرآن کا ذکر فرماتے ہیں :

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است　　　رسم و آئینِ مسلماں دیگر است !

در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست　　　مصطفیٰؐ در سینۂ او زندہ نیست

زبانی زبانی عشقِ رسولؐ کے دعوے اور ہماری نعتیہ شاعری عمل کا بدل تو نہیں ہو سکتی۔

اقبال اور وحدۃ الوجود : علامہ کے ایک شارح فرماتے ہیں : آخر عمر میں حضرت اقبال بھی وجودی ہو گئے تھے"۔ ۷

"علامہ نے ڈاکٹر نکلسن کی خواہش پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ فرمائیے :

" قرآنِ مجید میں خدا کے سوا دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ فتبارک اللہ احسن

---

۷ ۔ شاہ محمد عبد الغنی، "قرآنی تصوف اور اقبال"۔ ص ۴۹ ۔

الخالقین ۔۔۔۔۔ ان سب (وجودی صوفیہ) کا خیال تو یہ ہے کہ خدا یا حیاتِ کلی میں جذب ہوجانا ہی انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ اسی میں اس کی نجات ہے"۔ بقول غالب، "عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا"

"لیکن اقبال کے نزدیک انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود اپنی انفرادی ہستی کو فنا کردینا نہیں بلکہ اسے قائم رکھنا ہے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر انفرادیت پیدا کرے اور زیادہ سے زیادہ بے عدیل بنے"۔[۸]

مزید لکھتے ہیں۔

"قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہوجائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرے۔" (صفاتِ الٰہیہ کے جذب کرلینے سے مراد ہے)[۹]

اسی کو تخلق باخلاق اللہ کہا جاتا ہے اور قرآن کی زبان سے صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغہ (بقرہ، ۱۳۸) فرمایا گیا ہے یعنی ہم نے قبول کرلیا رنگ اللہ کا، اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے؟ (شیخ الہند)۔

مسلمانوں میں وحدۃ الوجود کے اولین مرشد شیخ اکبر کو علامہ نے ہندو فلسفہ ویدانت کا ہم نوا قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں: "مسئلہ انا" کی تحقیق وتدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب وغریب مماثلت ہے، اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی ہے اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابنِ عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی ۔۔۔۔۔ وہ مسئلۂ وحدۃ الوجود کے اَن تھک مفسر تھے۔ انہوں نے اس کو اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنادیا"۔[۱۰]

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ شیخ سے پہلے اسلامی تخیل میں اس مسئلے کا وجود نہیں تھا[۱۱] اور یہ بھی کہ یہ قرآن سے مستنبط نہیں بلکہ گیتا کی تفسیر کے مماثل ہے۔ علامہ مزید وضاحت کرتے ہیں: تصوّف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے "لمعات" میں فصوص الحکم محی الدین ابنِ عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ (جہاں تک مجھے علم ہے) فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ اس پر میں انشاء اللہ مفصّل

۸۔ پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل، "ترجمانِ خودی"۔ ص ۱۸۱۔
۹۔ ایضاً، ص ۱۸۲۔ ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۶

لکھوں گا"۔۱۲

مولانا اسلم جیراجپوری کے نام ایک خط میں علامہ لکھتے ہیں:

"تصوف سے مراد اگر اخلاص فی العمل مراد لی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔" ۱۳

کیا ان اقتباسات کے خلاف علامہ نے اپنے کسی مقالہ میں اس خیال سے رجوع کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے وحدۃ الوجود کو اسلامی اور قرآنی چیز قرار دیا ہو؟ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تو یہ علامہ پر افترا ہے۔ اب آئیے ان آیات کی طرف جن سے بعض شارحینِ اقبال نے وحدۃ الوجود کا اثبات کیا ہے:

(۱) فلم تقتلوهم ولكن الله قتلهم، وما رميت إذ رميت ولكن الله رمى"۔ (انفال۱۷)

مسلمانو! تم نے ان کفار کو قتل نہیں کیا، لیکن اللہ نے قتل کیا، اور اے رسولؐ! تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جب پھینکی تھی، لیکن اللہ نے پھینکی۔

ہم ان آیات کی تشریح میں شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، جن کا تفسیری حاشیہ سلف و خلف کا مستند خلاصہ ہے، سے استفادہ کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"تم بے سروسامان، قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمہارے زورِ بازو سے کافروں کے ایسے ایسے مُنڈ (بہادر) مارے جاتے۔ یہ تو خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے، اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بظاہر کام تمہارے ہاتھوں سے لیا گیا۔ اور ان میں فوق العادۃ قوت پیدا کر دی جسے تم اپنے کسب و اختیار سے حاصل نہ کر سکتے تھے۔"

قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات ہیں جن میں خالقِ اسباب ہونے کی حیثیت سے عام انسانی اعمال و افعال کا فاعل اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بتایا اور انسان کی نفی فرمائی ہے، مثلاً "افرءيتم ما تحرثون ء انتم تزرعونه ام نحن الزارعون" (واقعہ، ۶۳-۶۴): دیکھو تو جو تم بوتے ہو کیا تم اس کی

۱۲۔ شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، حصہ اوّل، ص ۴۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔

زراعت کرتے ہو یا ہم زراعت کرنے والے ہیں؟ یہاں استفہام انکاری ہے، یعنی دراصل اللہ حقیق مزارع ہے۔

(۲) "ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیہم" (فتح، ۱۰):

جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔

یعنی نبیؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنا گویا خدا سے بیعت ہے۔ کیونکہ نبی صلعم خدا ہی کی طرف سے بیعت لیتا ہے۔ اسی کے احکام کی تعمیل و تاکید بیعت کے ذریعے کراتا ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ: رسول کا مطیع اصل میں اللہ تعالیٰ کا مطیع ہے۔

(۳) "وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" (البقرہ، ۱۱۵):

اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مشرق و مغرب، سو جس طرف تم منہ کرو، وہاں ہی اللہ متوجہ ہے (ترجمہ شیخ الہند)

یعنی یہود و نصاریٰ کا جھگڑا تھا۔ ہر کوئی اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ مخصوص کسی طرف نہیں بلکہ مکان اور جہت سے منزہ ہے۔ اس کے حکم سے جس طرف منہ کرو گے وہ متوجہ ہے تمہاری عبادت قبول کرے گا۔

(۴) "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" (ق، ۱۶): ہم (یعنی خدا) اس (یعنی انسان) سے نزدیک تر ہیں، اس کی رگ جان سے۔

مطلب یہ کہ ہم (باعتبار علم کے) اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں۔ یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے، ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے۔ بقول سحابی نجفی ؎

آں کس کہ تو حال خود باو می گوئی
آگاہ نہ کہ او بتو بنمودہ ترا

انسان بطن مادر سے نکلتا ہے تو کچھ نہیں جانتا، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے جلانے اور جنوانے سے اپنے آپ کو اور دوسری مخلوقات کو جاننے لگتا ہے۔

(۵) "ہو معکم اینما کنتم واللہ بما تعملون بصیر" (حدید، ۴): تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس کو دیکھتا ہے۔ یعنی کسی وقت تم سے غائب نہیں، بلکہ جہاں کہیں ہو

اور جس حال میں ہو وہ خوب جانتا ہے اور تمام کھلے چھپے اعمال کو دیکھتا ہے۔

(۶) "ہو الاول والآخر والظاہر والباطن وہو بکل شئی علیم" (حدید ۳) :

وہ سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی جب کوئی نہ تھا وہ موجود تھا، اور کوئی نہ رہے گا وہ موجود رہے گا۔ عرش سے فرش تک اور ذرّہ سے آفتاب تک ہر چیز کی ہستی اس کی ہستی کی روشن دلیل ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی کنہ ذات اور حقائقِ صفات تک عقل و ادراک کی رسائی نہیں۔ ظاہر (بمعنی غالب) ایسا کہ اس سے اوپر کوئی قوت نہیں۔ باطن ایسا کہ اس سے پرے کوئی موقع نہیں۔ جہاں اس کی آنکھ سے اوجھل ہو کر پناہ مل سکے۔ حدیث میں ہے: وانت الظاہر فلیس فوقک شئی وانت الباطن فلیس دونک شئی۔

(۷) "وفی الارض آیات للموقنین و فی انفسکم افلا تبصرون (ذاریات ۲۰، ۲۱)

اہلِ یقین کے لیے زمین میں اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ (شیخ الہند)

یعنی انسان اگر خود اپنے اندر یا روئے زمین کے حالات میں غور و فکر کرے تو بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ ہر نیک و بد کی جزا و سزا ضرور مل کر رہے گی، جلد یا بدیر۔

یہ ہیں ان آیات کے سیدھے سادے معنی جو صحابہؓ سے لے کر آج تک مفسر و مترجم سمجھتے چلے آرہے ہیں اور سیاق آیات بھی انہی کی تائید کرتا ہے۔ پھر کیا تمام صحابہؓ نے یا کسی ایک ہی صحابیؓ نے ان آیات میں سے کسی ایک آیت سے وحدۃ الوجود کا مسلک سمجھا تھا؟

قرآن حکیم اپنے آغاز سے اخیر تک خالق و مخلوق کو الگ الگ بتاتا ہے۔ سورۂ فاتحہ سے اعوذ برب الناس تک دیکھتے جائیے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ ایک عابد ہے، دوسرا معبود۔ ایک منگتا ہے، دوسرا داتا۔ ایک پناہ مانگ رہا ہے، دوسرا پناہ دینے والا۔ ایک جنا ہوا اور جننے والا، دوسرا لم یلد و لم یولد۔ ایک بیمار، دوسرا شافی، بقول حضرت ابراہیم :- اذا مرضت فہو یشفین، (شعرا، ۸۰) : ایک مرتا ہے اور دوبارہ زندہ ہو کر دوزخ یا بہشت میں جاتا ہے، دوسرا وہ ہے جو سزا و جزا دیتا ہے۔ خدارا بتائیے کہ مرنے کے بعد تک تو یہ فرق اور دوئی موجود رہتی ہے۔ پھر وحدۃ الوجود کا قطرہ دریا میں کب فنا ہوگا؟ علامہ کے سامنے یہ سب آیات تھیں۔ وہ روزِ حشر کی پرسش کے تصور سے لرزتے تھے۔ اس عاجز نے ان کو ذکرِ آخرت پر روتے اور سسکیاں بھرتے دیکھا ہے۔ ان کا

مشہور رباعی نما قطعہ ہے :

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر　　از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

اور یہ بھی فرمایا :-

مکن رسوا حضور خواجہ ما را　　حسابِ من ز چشم او نہاں گیر

ہاں اگر وحدۃ الوجود کے کوئی اور فلسفیانہ معنی ہیں تو اسلام جو ایک عملی دین ہے۔ ایسی پیچیدگیوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود　　پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

خود قرآن نے بے کار بحثوں سے روک دیا ہے : لیس کمثلہ شئی (شوریٰ، ۱۱) : اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ یعنی ذات، صفات اور احکام میں کوئی اس کا مماثل نہیں۔ نہ اس کے دین کی طرح کوئی دین ہے نہ اس کا کوئی جوڑ ہے نہ ہمسر اور ہم جنس (عثمانیؒ) فلا تضربوا للہ الامثال (نحل، ۷۴) :- مت چسپاں کرو اللہ پر مثالیں۔ تفکروا فی خلق اللہ و لا تفکروا فی اللہ : اللہ کی مخلوقات میں غور فکر کرو، لیکن اس کی کنہِ ذات میں مغز پچی نہ کرو۔ بقول مولوی غلام رسولؒ :-

حادث کیا قدیموں جانے ؟ جے لکھ اُڈے ہوائیں
ڈب مریندیاں عقلاں حیرت دے دریائیں

اور بقول سعدی :

چہ شب ہا نشستم درین دہر گم　　کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم !
درین ورطہ و چ کشتی فرو شد ہزار　　کہ پیدا نشد تختۂ بر کنار

یہ ہیں ان تمام آیات کے سیدھے سادے معانی و مفاہیم جو تمام قدیم و جدید ثقہ مفسرین کے نزدیک بلا اختلاف چلے آرہے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق علامہ نے کہا ہے :

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

زیادہ اشعار کی بھرتی اور مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص جس نے علامہ کے کلام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا جانتا ہے کہ ان کی شاعری میں حضرت کا آغاز عشق حجاز سے ہوا :

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے میری

اور پھر زندگی بھر وہ اسی عشق کے زیرِ اثر اسلام و مسلمین کی خدمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا انجام بھی اسی آرزو پہ ہوا :

آرزو دارم کہ میرم در حجاز

سرود رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید !

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

اب ان کی وفات کے سالہا سال بعد کچھ لوگ ان کی تمام فکر و کاوش کا قبلہ ماسکو کو بنانا چاہتے ہیں اگر وہ ہم میں موجود ہوتے تو یہ لوگ ایسی جسارت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اگر کوئی سر پھرا ایسی حرکت کرتا تو وہ اس سے پوچھتے کہ تم مجھ کو مجھ سے زیادہ جاننے والے، بلکہ مجھ کو میرا نقیض ثابت کرنے والے کہاں سے پیدا ہو گئے ؟"

وہ تو اپنی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں عمر کی آخری منزل میں حرم، حجاز اور یثرب ہی کا ورد کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ چنانچہ ملا سے گریزاں ہونے کا سبب بھی یہ بتاتے ہیں :

ازاں بگریختم از مکتبِ او　　کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

حرمِ کعبہ سے اپنے روحانی رشتے کا ذکر کرتے ہیں :

حرم تا در ضمیر من فرو رفت　　سرودم آنچہ بود اندر ضمیرش

بسترِ مرض پہ لیٹے ہوئے بھی دنیائے خیال میں سفرِ یثرب کی تیاری ہو رہی ہے :

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ　　سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ

طویل بیماری اور عالم پیری ــ بیک وقت دونوں کا حملہ ہو رہا ہے۔ اس پر بھی عزم و ہمت کی بلندی دیکھئے :

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم　　نوا خواں از سرودِ عاشقانہ

چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام　　کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

یعنی ان کے طائرِ روح کا اصلی نشیمن یثرب ہے۔ اس کے سوا دنیائے آباد کا کوئی شہر انھیں اپنی گیلوں کی طرف نہیں کھینچ سکتا۔

محترم سامعین ! ایسے شخص کو کوئی شخص سوشلسٹ ثابت کرنا چاہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بصارت سے محروم ہے اور دوسروں کی آنکھوں میں بھی مٹی جھونکنا چاہتا ہے یا پھر جان بوجھ کر :

بدو زد طمع دیدۂ ہوش مند

کا مصداق بن رہا ہے۔ قرآن حکیم نے ایسے ہی لوگوں کی شان میں فرمایا ہے :

"لھم قلوب لایفقھون بھا و لھم اعین لا یبصرون بھا و لھم آذان لا یسمعون بھا" (اعراف : ۱۷۹) :

ان کے دل تو ہیں، ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور آنکھیں بھی ہیں، اس کے باوجود دیکھتے نہیں۔ کان بھی رکھتے ہیں، ان سے صحیح بات نہیں سنتے۔

قوم اقبال کا فرض ہے کہ ایسے ہاتھوں سے قلم چھین لے جو اقبال کو مسخ کر رہے ہیں۔ یہ بات حکومت پاکستان کے منشاء کے عین مطابق ہوگی جس کے آئین میں اسلام کی اہمیت کا اعتراف موجود ہے کہ اس ملک میں کوئی خلافِ اسلام بات برداشت نہیں کی جائے گی۔

یارب زسیلِ حادثۂ طوفاں رسیدہ باد
بُت خانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

مقالہ ختم ہوا، اس کی تکمیل کے بعد علامہ کے وحدۃ الوجودی ہونے کے خلاف مجھے چند سطور اور مل گئیں۔ وہ بھی مناسب حال ہونے کی وجہ سے پیش کرتا ہوں۔ ان کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال نے پچھلے دنوں ایک طویل تقریر کی۔ اس میں انہوں نے کہا :

"اقبال نے اپنی زندگی کا آغاز ایک وحدۃ الوجودی، ہندوستانی قوم پرست اور مطلق پرست کی حیثیت سے کیا۔۔۔۔۔۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قیام یورپ کے دوران ہی وحدۃ الوجود لادین نیشنلزم اور وطن پرستی کے نظریات کو ترک کر دیا۔ اقبال نے محسوس کیا۔۔۔۔۔۔ چونکہ اسلام اپنی ذات میں اکمل ہے، یہ اپنے سے جدا کسی ازم یا نیشنلزم اور دوسرے ازم کو برداشت نہیں کرتا۔" [۱۴]

اس اقتباس سے ان کے غیر وحدۃ الوجودی ہونے کے ساتھ ہی غیر سوشلسٹ ہونے کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ اور آگے بڑھیں تو یہ سطور ملتی ہیں :۔

۱۴۔ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۷۵ء

" انسان ایک معین خودی اور ایک شخصیت کا حامل ہونے کے باعث خدا سے علیحدہ و منفرد ہے ۔ انسان آزاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسان اور خدا انتہائی متحرک و فعال شخصیات کے حامل ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ممتاز و منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ رفیق و دمساز بھی ہیں ۔ پانی کے قطروں کے بحر میں ضم ہو جانے کی مثال کا اطلاق صرف انہی خودیوں پر ہوتا ہے جو اپنے استحکام و فروغ میں ناکام رہتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کا مقدر انفرادیت کی حدود سے نجات پانا نہیں بلکہ اس کا مزید اور واضح تعین ہے۔"

اس اقتباس میں مروجہ تصوف کے اس عقیدے کی واضح تردید ملتی ہے کہ :

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اپنے ابدی اصول و اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے اغیار کے ہنگامی افکار کی پیروی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" دستِ سوال دراز کرنا دوسروں سے بسر اوقات کے ذرائع مانگنے تک محدود نہیں بلکہ اس میں دوسروں کی فکری دریوزہ گری بھی شامل ہے جو انجام کار نقل اور تقلید کرنے اور بالآخر غلامی و محکومی تک نوبت پہنچا دیتی ہے۔ غلامی سے افراد اور معاشرے فنا ہو جاتے ہیں۔"[۱۵]

علامہ کی یہ ثابت شدہ صراحتیں اور وضاحتیں ہیں جن کی علامہ ہی کے ہم وطن و ہم عصر بلند ترین آواز سے تکذیب و تردید فرما رہے ہیں :

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

۱۵۔ ایضاً ، مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۷۵ء ۔

اقبالؒ اور حکیم فیروز طغرائی

علامہ اقبال کے معاصرین کا شمار اور تذکرہ آسان نہیں۔ یہاں ان کے صرف ایک معاصر مولانا حکیم فیروز الدین احمد فیروز طغرائی امرتسری کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ حکیم صاحب نے اردو میں فیروزؔ اور فارسی میں طغرائی تخلص اختیار کیا۔ انہوں نے علامہ کی بعض خاص نظموں کے جواب میں نظمیں لکھیں جن میں سے کئی اس دور کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول روزنامہ "زمیندار" میں قدر و احترام کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ مولانا ظفر علی خان ان کی مشق سخن اور ذہانت و طباعی کے معترف تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی ان کے مجموعہ نظم "کلام فیروز" پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں دادِ سخن دی تھی۔ علامہ کی پہلی مثنوی "اسرارِ خودی" میں خواجہ حافظ کے خلاف لکھے گئے اشعار پر ملک میں ہنگامہ برپا ہوا۔ حافظ کو صوفی سمجھنے والے تصوف کے حامیوں نے بہت کچھ لکھا۔ حکیم صاحب نے بھی حافظ کی حمایت اور علامہ کی مخالفت میں ایک رسالہ بنام "لسان الغیب"[عـ] تحریر کیا جو علامہ کی نظر سے گزرا تو انھوں نے کچھ اس طرح اظہارِ خیال کیا کہ حکیم صاحب میرے مقصد کو نہیں سمجھے۔ ("مقالاتِ اقبال")

ذیل میں اقبال و فیروزؔ کی متقابل نظموں کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ علامہ کے شکوے کے جواب میں بہت سے شکوے لکھے گئے۔ کراچی میں ایک صاحب ریسرچ کے طور پر ان سب کو جمع کر رہے ہیں یا شاید کر چکے ہوں[ف]۔ علماء نے علامہ پر شکوے کے خلاف فتوے بھی لگائے۔ حکیم صاحب نے "شکوہ اسلام" کے عنوان سے اس کا جواب لکھا جو "زمیندار" میں شائع ہوا۔ علامہ کے اشعار پر مذہبی طبقے بھڑک اٹھے۔ ان کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے اپنی (یعنی مسلمانوں کی) دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

---

ف - یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

عـ - یہ نادر و نایاب کتاب ہم اسی شمارے میں مضمون کی شکل میں شائع کر رہے ہیں (ق۔ ر)

شکوہ | پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں تو بھی تو دل دار نہیں

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر — برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟ — اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور — اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

طعن اغیار ہے، رسوائی ہے ناداری ہے — کیا تیرے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

کبھی غیروں سے، کبھی ہم سے شناسائی ہے — بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

علامہ نے "جواب شکوہ" میں اپنی اس "شوخی و گستاخی" کا خود ہی اعتراف بھی کر لیا ہے یعنی جب ان کا شکوہ عالمِ بالا میں پہنچا تو وہاں اس پر یہ تبصرہ ہوا۔

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں؟ — شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے — تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو — بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

حکیم صاحب نے جواباً "شکوہ اسلام"، اسی بحر اور اسی صنفِ نظم (مسدس) میں لکھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

میرا شکوہ نہیں بندے کا خدا سے شکوہ — یہ وفا کا ہے خود ارباب وفا سے شکوہ

آج کرتا ہے الست اہلِ بلا سے شکوہ — یہ ہے اسلام کا اپنے رفقاء سے شکوہ

آ کے گا نہ یہاں شکوۂ بے جا لب پر — سخنِ گرم ہے خود شرم سے چھالا لب پر

یعنی "شکوۂ اقبال" کے لہجے پر معترض ہوتے ہوئے اسے "شکوہ بے جا" اور سخنِ گرم سے تعبیر کیا ہے جس کا احساس خود علامہ اقبال کو بھی ہو گیا تھا۔ جیسا کہ "جواب شکوہ" سے ظاہر ہے علامہ نے مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا کہ ؎

"برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر"

اس کا جواب حکیم صاحب نے یہ دیا:

عامل و عادل و فیاض ہے سچا مسلم — کوئی دکھلائے کہاں ہے کوئی ایسا مسلم؟
امرِ اسلام سے منکر ہے تو کیسا مسلم؟ — مسلم بے عمل الحق کہ ہے اک نامسلم
نامسلمانوں پہ آئی جو مصیبت آئی — سخت باطل ہے کہ اسلام پہ آفت آئی

یعنی جب ہم میں اسلام کی بو ہی نہیں تو ہم پر جو برق گرے وہ مسلمانوں پر نہیں بلکہ نامسلمانوں پر گرے گی جیسا کہ جوابِ شکوہ میں علامہ بھی اعتراف کرتے ہیں :۔

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو ؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود — یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں ہنود

الہلال | "ماہِ نو" اور "ہلالِ عید" کے عنوانوں سے علامہ نے دو نظمیں لکھیں :۔

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی — نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

دونوں مصرعے بے مثال تشبیہوں سے مرصّع ہیں۔

سرگذشت ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے — اے مہِ نو! ہم کو تجھ سے الفت دیرینہ ہے
جس علم کے سائے میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم — دشمنوں کے خون سے رنگیں قبا ہوتے تھے ہم
تیری قسمت میں ہم آغوشی اُسی رایت کی ہے — حسن روز افزوں سے تیرے آب رو ملت کی ہے

حکیم صاحب بھی ہلال کو مخاطب کرتے ہیں :۔

ہر چند دیکھنے میں ذرا سا ہے ماند ہے — رقاصۂ سپہر کے ماتھے کا چاند ہے
ظاہر ہے تجھ میں شانِ خمِ زلفِ نور کی — تو نیم رُخ شبیہہ ہے خلخال حور کی
تو بوستانِ چرخ کی شاخ خمیدہ ہے — تو نخل نور کا ثمر نور رسیدہ ہے
کشتی ہے تیرے ہاتھ میں گویا گدا ہے تو — ہاں چشمِ آفتاب سے کچھ لے رہا ہے تو
زینت فضائے عارض زیبائے شب ہے تو — یعنی کہ گوشوارۂ لیلائے شب ہے تو

جگنو | "جگنو" پر علامہ نے جو تشبیہات مہیّا کی ہیں ان کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس میں ان کی شاعری کمالِ عروج پہ نظر آ رہی ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گم نام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

آخر تک نظم کی یہی شان ہے۔ طبع شاعر میں آمد کا دریا جوش زن ہے۔ اب حکیم صاحب کے جگنو کی چمک دمک ملاحظہ ہو:۔

چمک دمک ہے گلستاں میں جا بجا کیسی؟
لگا رہی ہے چکا چوند یہ ضیا کیسی؟

یہ سحر ہے کہ فسوں ہے، عجب تماشا ہے
کبھی نظر میں اندھیرا کبھی اُجالا ہے

تہ چراغ اندھیرا جہاں میں ہے مشہور
یہ وہ چراغ ہے رہتا ہے جس کے نیچے نور

بغل میں سوز دروں سے چراغ رکھتا ہے
مگر کسی کی محبت کا داغ رکھتا ہے

گماں ہے اس پہ دُرِ گوش شاہدِ گل کا
جو یہ نہیں تو شرارہ ہے آہِ بلبل کا

یہ برشگال میں ہم کو نظر پھر آئے ہیں
چراغ پانی پہ قدرت نے کیا جلائے ہیں

خدا کی شان یہ ہے جانور تو چھوٹا سا
کلیم ساں ہے مگر صاحبِ یدِ بیضا

حکیم صاحب کی تشبیہات بھی اپنی طبع زاد ہیں اور ان کی مشاقی اور استادی فن کا ثبوت ہیں۔

غم "نوائے غم" اور "فلسفۂ غم" کے عنوان سے علامہ کی دو نظمیں ملتی ہیں۔ موخرالذکر کا مرتبہ اپنی معنویت کے لحاظ سے بلند ہے۔ دونوں کا نمونہ دیکھئے:۔

آہ! امید محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

نغمۂ یاس کی دھیمی سے صدا اٹھتی ہے
اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حسابِ زندگی ہے "الم"[1] کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے سازیہ بیدار رہوتا ہے اسی مضراب سے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

پوری نظم حکیمانہ اور شاعرانہ خوبیوں سے معمور ہے۔ حکیم صاحب کی نظم "نغمۂ غم" ستر کے قریب اشعار میں پھیلتی چلی گئی ہے۔ ان میں مسلمانوں کی حالتِ زار کا خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

دلِ ناداں کو یارب داغ ہائے غم ملیں ہردم عنادل کی غزل خوانی بہار بوستاں تک ہے

جفائے دہر کا کچھ غم نہیں گر ہوں نہ ہم مضطر دمِ خنجر کی تیزی گردشِ سنگِ فساں تک ہے

بلا سے گرچہ آلودہ ہوئے اس خاکداں میں ہم کہ پروازِ نگہ خلوت سرائے لامکاں تک ہے

مصیبت گاہ دنیا میں ہوئے جس دن سے ہم پیدا ہوا ہم زاد کی صورت ہمارے ساتھ غم پیدا

ستاتا ہے زمانہ ہم کو آہنگ مخالف سے طلب کرتے ہیں جب تریاق، ہوجاتا ہے سم پیدا

اگر بھولے سے پھیلاتے بھی ہیں ہم دام کوشش کا مزاجِ آہوئے اقبال میں ہوتا ہے رم پیدا

اس طویل نظم کے آٹھ بند ہیں۔ ہر بند میں آٹھ آٹھ اور نو نو اشعار ہیں۔ قومی پستی کا نہایت مؤثر اور دردانگیز مرثیہ لکھتے لکھتے آخر یہ کہتے ہیں :۔

بس اب فیروز آنسو سننے والوں کے نہ ہوں جاری نہ پڑ جائے کہیں یہ اوس ان گل ہائے خنداں پر

محل جز دیدۂ نرگس نہ باشد اشک شبنم را نہ ہر گوشے بود درخود سماع نغمۂ غم را

درد و یاس علامہ کی ایک بہت ہی زوردار اور طویل نظم "تصویرِ درد" ہے جو بانگِ درا کے ۱۲ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں ان کی بھرپور جوانی کے بلند آہنگ جذبات بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے تتبع میں حکیم فیروز طغرائی کی نظم "تصویرِ یاس" ان کے کلیات کے دس صفحات کو محیط ہے ان دونوں کے بعض ہم قافیہ اشعار پیشِ خدمت ہیں :۔

---

[1] یعنی الف لام میم حروف مقطعات اور غم

علامہ ـــــ نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

فیروز ـــــ نرالے رنگ سے ہنگامہ آرا ہے زباں میری
نیا انداز رکھتی ہے پرانی داستاں میری

علامہ ـــــ رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

فیروز ـــــ سبق آموز باتیں ہیں سلف کی داستانوں میں
نصیحت خیز ہیں ان کے فسانے سب فسانوں میں

علامہ ـــــ ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا

فیروز ـــــ عیاں میں آج اپنا سوز پنہاں کرکے چھوڑونگا
جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کرکے چھوڑوں گا

علامہ نے اس زبان میں چھ اشعار کہے ہیں جب کہ فیروز کے اشعار کی تعداد دس تک پہنچتی ہے ان کے کچھ مزید شعر دیکھئے :۔

زمانے میں دل درد آشنا پیدا نہیں ہوتا
میں اس نایاب شے کو خوب ارزاں کرکے چھوڑونگا

سناتے ہیں جو منبر پہ حدیث و آیت اوروں کو
انہیں بھی عاملِ احکامِ قرآں کرکے چھوڑوں گا

تعصب کا مرض لاحق ہوا سارے زمانے کو
تلاش اس درد کا میں آج درماں کرکے چھوڑوں گا

علامہ مسلم کو مخاطب فرماتے ہیں :۔ ؎

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بُت پندار کو اپنا خدا تو نے

فیروز اسلام سے خطاب فرماتے ہیں :۔ ؎

بڑا احسان اے اسلام عالم پر کیا تو نے
دکھایا گمرہوں کو جادۂ دینِ ہُدیٰ تو نے

بتایا خوب نسخہ سرکشوں کو خاکساری کا
ہر اک آئینہ دل کو مجلّا کر دیا تو نے

کیا لات و ہبل نے سجدہ تیری آمد آمد پر
عجب بندے بنائے بت پرستوں کے خدا تو نے

علامہ ـــــ دکھا وہ حسن عالم سوز اپنی چشمِ پُرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم کو

فیروز ـــــ سمجھتے ہو اگر زیبِ گلستاں چشمِ شبنم کو
ذرا برساؤ تم بھی ابرِ فیضِ چشمِ پُرنم کو

علامہ ـــــ شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

فیروز ـــــ شفیع ابنِ آدم کیوں نہ ہوگا وقتِ مشکل میں
یہ وہ رونا ہے جس نے بخشوایا جرمِ آدم کو

علامہ ـــــ نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

فیروز ـــــ غضب ہے اپنے ہم جنسوں سے یوں بیگانہ خو رہنا ہمیشہ برسرِ پرخاش رہنا، جنگ جُو رہنا

علامہ ـــــ شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

فیروز ـــــ جسے دیکھو نظر آتا ہے مخمور مئے نخوت یہ سیکھا ہے کہاں سے مست بے جام و سبو رہنا؟

علامہ ـــــ جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے

فیروز ـــــ مسلماں ہیں کہاں؟ قرآن و اسلام اب بھی ظاہر ہے نہیں پروانہ لیکن شمع بھی ہے انجمن بھی ہے

علامہ ـــــ بیاباں محبت دشت غربت بھی وطن بھی ہے یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے

فیروز ـــــ تری رحمت سے ہر نخل امل ہوتا ہے بار آور سحاب لطف کا امیدوار اپنا چمن بھی ہے

علامہ ـــــ اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟

فیروز ـــــ مجھے اے قاضی الحاجات کیا کیا آرزوئیں ہیں خیال نوعِ انساں بھی غمِ قوم و وطن بھی ہے

علامہ ـــــ سکوت آموز طول داستانِ درد ہے، ورنہ زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

فیروز ـــــ بس اب فیروز ہے اس مختصر پہ اکتفا اچھا کہ اہلِ بزم بھی بے تاب ہیں طولِ سخن بھی ہے

علامہ کی اس طویل نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے :-

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

اور فیروز بھی یہاں پہنچ کر چُپ ہو جاتے ہیں۔

زباں تا بدریائے راتکلم آشنا کردم زجوشِ موج خیز اشک طوفاں ہا بپا کردم

اس مختصر تقابل سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ :-

(۱) علامہ نے اپنے آغاز ہی میں عام شعراء کی پیروی ترک کر کے اپنا ایک الگ اندازِ سخن اختیار یا ایجاد کر لیا تھا۔

(۲) معاصرین میں ان کو مقبولیت ہو رہی تھی۔

(۳) وہ جو انہوں نے اسرارِ خودی میں کہا ہے کہ :-

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد چشم خود بر بست و چشم ما کشاد

یعنی بہت سے شاعر اپنی مرگ کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھ بند ہو جاتی ہے تو انہیں پہچاننے والوں کی آنکھ کھلتی ہے۔ اس کے برعکس علامہ اپنے آغاز ہی میں پہچانے جانے لگے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے طرزِ کلام کی پیروی ہونے لگی تھی۔ یہ ان کے بلوغ (غیر معمولی عظمت) کی علامت ہے۔

ایک فراموش شدہ عظمت

(حیاتِ اقبال کا ایک پنہاں گوشہ)

آج سے ایک صدی قبل ۱۸۶۱ء میں امرتسر (مشرقی پنجاب) کے ایک خوجہ گھرانے میں ایک بچے نے جنم لیا جو آگے چل کر نہ صرف خاندان بھر میں ممتاز بننے والا تھا بلکہ بعض خاص صفات میں حیرت انگیز حیثیت اختیار کرنے والا تھا۔ اس وقت امرتسر میں رئیس الموحدین حضرت مولانا غلام العلی قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے درس و وعظ اور زہد و تقویٰ کا چرچا تھا ــــ بچے کا محترم باپ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی مسرت کی اطلاع دے کر نام رکھنے کا طالب ہوا۔ مولانا نے نومولود کا نام "احمد" تجویز فرمایا۔

احمدؐ کو پانچویں برس میں قرآن شریف پڑھنے کے لیے ایک حافظ صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے متعدد مرتبہ قرآن مجید دہرا لیا۔ اس کے بعد والدؒ نے چکن دوزی کے کام پر لگا دیا ــــ احمد کا ایک ہم سبق قرآن مجید پڑھ لینے کے بعد سکول میں داخل ہو گیا تھا۔ احمد نے بھی اپنے والد سے اصرار کیا کہ اسے سکول بھیجا جائے۔ چھ سات سال کے بچے کا شوقِ تعلیم دیکھ کر والد کو جھکنا پڑا، احمد کو مشن ہائی سکول میں داخل کرا دیا ــــ اسے کھیل کود میں دلچسپی نہیں تھی۔ سارا سارا دن پڑھتے رہنے سے اس کو سیری نہیں ہوتی تھی۔ آدھی آدھی رات تک چراغ کے سامنے کتاب لئے بیٹھا رہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے رو ہوں اور ضعفِ بصارت کا شکار ہو گئیں۔ لیکن اس کے باوجود آخر عمر تک مطالعہ جاری رکھا۔

فطری انفرادیت

احمد میٹرک کے امتحان میں شریک تھا۔ کل دس لڑکے زیرِ امتحان تھے۔ انسپکٹر نے ایک سوال دیا، ۹ لڑکوں کا جواب صحیح مانا گیا اور صرف احمد کا غلط ــــ احمد نے دوبارہ غور کیا اور غلطی نہ پا کر جرأت کر کے انسپکٹر سے کہا "ازراہِ کرم میری غلطی بتا دیجئے"۔ اس نے جھنجلا کر کہا ــــ "غلط ہے" ــــ احمد نے پھر غور کیا اور انسپکٹر سے درخواست کی کہ "مجھے سمجھا دیجئے۔ میرے عمل میں کون سی غلطی ہے"؟ ــــ اس نے برہم ہو کر کاپی چھین لی اور اپنے اسسٹنٹ کے حوالے

کر کے کہا "سمجھا دو"۔ اسسٹنٹ سمجھانے لگا۔ اس نے کئی مرتبہ غور کرنے کے بعد انسپکٹر سے کہا "اس کا جواب صحیح ہے"۔۔۔ انسپکٹر نے کاپی لی اور خود سمجھنا چاہا۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ احمدؔ غلطی پر نہیں بلکہ وہ خود غلطی کا شکار ہے۔ اس نے نہایت صفائی سے تمام اسٹاف اور کلاس کے سامنے اعتراف کیا کہ :۔

"او ہم غلطی پر۔ او ہم غلطی پر"۔ او ہم غلطی پر"۔ موصوف نے یکتا ہونہار احمدؔ کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے بیس روپے نقد انعام اور نقرئی تمغہ عطا فرمانے کی سفارش کی اور لاگ بک میں اس کے متعلق بہترین ریمارک لکھا۔

مشن سکول میں بائیبل کی تعلیم لازمی تھی۔ احمدؔ آنکھوں کی دائمی تکلیف کے باوجود بائبل اور دوسرے مضامین میں اپنی ساری کلاس میں اوّل رہتا تھا۔۔۔ اتنی عمر کے بچوں کو اتنا ہوش کہاں ہوتا ہے کہ جو کچھ انہیں پڑھایا جاتا ہے وہ کہاں تک معقول ہے۔ لیکن احمد کو بائیبل کے بعض مسائل ناقابلِ قبول نظر آئے اس نے قرآن مجید کی طرف توجہ کی اور مولانا غلام العلی سے استفادہ شروع کیا۔ مولانا اس بچے کی ذہانت و فراست سے اتنے متاثر ہوئے کہ ایک دن بھری مجلس میں فرمایا :۔

"میری جسمانی اولاد میں میرا صحیح جانشین کوئی نہیں۔ البتہ میری روحانی اولاد میں یہ شخص (احمدؔ) ہو گا"۔

ذہین شاگرد اور عالی ظرف استاد میں بعض مسائل پر بحث ہوتی جو جانبین کے لئے اِحقاقِ حق کا ذریعہ بنتی۔

احمدؔ سے احمدین

احمدؔ کی معقول پسندی کا اسی زمانے میں چرچا ہونے لگا۔ بڑی عمر کو پہنچ کر اپنے دینی ذوق کی وجہ سے ننھے احمد نے مولوی احمدالدین اور پھر خواجہ احمدالدین کے نام سے شہرت پائی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نارووال کے ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازمت حاصل کی وہاں شیعہ حضرات کی اکثریت تھی۔ اس لئے ان سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے شیعی لٹریچر کے مطالعے کا کافی موقع ملا۔۔۔ وہاں سے ڈیرہ بابا نانک میں تبادلہ ہوا تو چولہ صاحب کے درشن کئے اور سکھوں کی دوستی کی وجہ سے گرو گرنتھ صاحب اور دیگر سکھ لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ ہائی سکول امرتسر میں متعین ہوئے۔ چند سال بعد ترن تارن (ضلع امرت سر) منتقل ہو گئے۔ یہاں عیسائیوں سے میل جول بڑھا، بائبل کا پہلے سے مطالعہ تھا۔ اس لئے یہاں کے پادری سے کامیاب مباحثے ہوتے رہے۔ آخر میں پھر اسلامیہ ہائی سکول امرت سر آ گئے اور وہیں سے ملازمت کی عمر پوری ہو جانے پر ریٹائر ہوئے۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد میونسپل گرلز ہائی سکول میں ادیب اور ادیب عالم کلاس کو تعلیم دینے کے لئے تقرر ہوا۔ ادیب عالم کے نصاب میں عروض کا بھی کچھ حصہ تھا۔ اس لیے اس فن کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس میں ناقدانہ مہارت پیدا کر لی۔

ارکان بلدیہ آپ کی عظمتِ کردار سے اتنے مطمئن تھے کہ بلا تکلف نوجوان لڑکیوں کی تعلیم پر آپ کو مامور کر دیا۔۔۔ آپ ۱۲ سال سے زیادہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ اکثر اکابر شہر کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ان کے گھروں میں جاتے۔

عظیم کارنامہ شیخ امام سراج الدین ابو طاہر محمد بن محمد عبد الرشید سجاوندی حنفی کی مشہور و مقبول تصنیف ''السراجیہ'' یا ''الفرائض السراجیہ'' ساتویں صدی ہجری کی ابتداء میں لکھی گئی۔ اس کی تعریف میں ''معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ'' میں لکھا ہے۔

''فرائض المذاہب الاربعہ) فی احکام الادث ..... شرحہا غیر واحد واشتغل بحکلہا جم غفیر من العلماء''

اس کے بعد متعدد شرح کا تذکرہ ہے، جن میں السید الشریف'' کی شرح الفرائض السراجیہ'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

مسلمان شارحین کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ چنانچہ اس کے انگریز مترجم سر ولیم جونز نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''یہ کتاب بہت بلند مرتبہ اور مفید ہے۔'' یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ ''معجم'' کے بیان اور معمول امت کی شہادت کے مطابق اس کے مندرجات مذاہبِ اربعہ میں تسلیم شدہ ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ ساڑھے سات سو برس میں شرح و حواشی کی صورت میں اور امت کے اجماعی عملی رنگ میں اس کی بے مثل افادیت اور عظمت کا اعتراف تو کیا گیا لیکن اس پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ۔۔۔ اس طویل مدت میں اکابر علماء محققین اور مجددین و مصلحین پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے اصحابِ کشف و مشاہدہ کا ظہور ہوا، تفسیر، حدیث اور فقہ کے اتنے دفاتر و ذخائر تیار ہوئے جن کا احصار ناممکن ہے۔ لیکن ''الفرائض السراجیہ'' کو سچ مچ فرائض ہی کی طرح بے چون و چرا تسلیم کیا جاتا رہا۔

راقم الحروف نے خواجہ احمد دینؒ کے خاص دوست حکیم سلطان احمد مرحوم امرتسری کی زبان سے

سنا ہے کہ ایک دفعہ خواجہ صاحب نے ان سے کہا :۔ خلیفہ عبدالرحمٰن (ابن مولانا غلام العلیؒ) سے سراجی لائیے دیکھیں تو اس میں کیا لکھا ہے ۔

یہ غالباً ۱۹۱۴ء یا اس سے پہلے کا واقعہ ہے۔ خواجہ صاحب نے اس سے قبل یہ رسالہ نہیں دیکھا تھا۔ حکیم صاحب نے خلیفہ صاحب کے پاس سے لاکر پیش کر دیا۔ خواجہ صاحب نے دو چار دن کے بعد واپس کر دیا اور کہا کہ "اس میں غلطیاں ہیں" ــــ حکیم صاحب نے حیرت زدہ ہو کر کہا ــــ "یہ دعویٰ آسان نہیں ہے۔ دلیل سے ثابت کیجئے" اور رسالہ لوٹا دیا ــــ خواجہ صاحب نے رکھ لیا اور چند دن بعد ایک مضمون مرتب کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ جب اس مضمون کی اشاعت ہوئی تو قدرتی طور پر دینی حلقوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ محترم دستاویز جس کے سامنے صدیوں سے بڑے بڑوں کے سر تسلیم خم ہوتے چلے آرہے تھے۔ کسی امام الائمہ اور شیخ المشائخ کے سان گمان میں بھی نہیں گزرا تھا کہ اس میں حرف گیری کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے۔ اس پر خامہ تنقید کو حرکت میں لانے کی جرأت کر رہا ہے۔ ایک غیر معروف سکول ماسٹر جس کی تعلیم میٹرک سے آگے نہیں جس نے کسی دینی دارالعلوم میں داخلہ تو کجا اس کی عمارت کو دُور سے کھڑے ہو کر دیکھا بھی نہیں۔

علماء کرام تو ایک طرف رہے۔ جب آپ کی یہ تنقیدی جرأت "معجزۃ القرآن" کے نام سے طبع ہو کر علامہ اقبالؒ کے پاس پہنچی تو وہ بھی اسے دیکھ کر بہت ہی خفا ہوئے اور ایک عتاب نامہ خواجہ صاحب کے نام لکھا (بعد میں دونوں بزرگوں میں جو مخلصانہ تعلقات قائم ہوئے ان کا ذکر آگے آرہا ہے) لیکن علماء ہی کے سنجیدہ طبقے میں ایسے بزرگ بھی نمودار ہوئے جنہوں نے نہایت ٹھنڈے دل سے اس کوشش و کاوش کا مطالعہ کیا اور اس کے مندرجات کو کُلاً یا جزءً تسلیم کیا ــــ آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں خواجہ صاحب کی شخصیت کے اس خاص پہلو کا مطالعہ بھی کر لینا چاہیے ــــ کہ انہوں نے میراث کے علاوہ اور بھی کئی باتوں کا انکشاف کیا۔ لیکن آپ کی زبان و قلم کسی ادنیٰ سے ادنیٰ اِدّعا سے کبھی آلودہ نہیں ہوئی۔ آپ نے بزرگوں کو ہمیشہ قابلِ احترام سمجھا اور اپنی ذات کے متعلق عجز و انکسار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خلاف اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے آخر میں لکھا کہ :۔

"بزرگوں کے ہم پر بڑے احسان ہیں، جو کوششیں انہوں نے اپنے زمانہ میں کی ہیں، اگر وہ نہ

کرتے، تو آج وہ سب بارہم ہی پہ آپڑتے۔ ان کی کوششیں ہمارے لیے رہنما ہیں۔ ہم ان کے بڑے شکر گزار ہیں۔ مگر انہیں بشر ہی سمجھتے ہیں نہ کہ بے غلط، وہ بندے ہیں نہ کہ خدا، بندوں کے خیالات ہمیشہ ترقی کرتے رہتے ہیں اور اسی طرح ترقی کرتے جائیں گے۔ ارسطو و افلاطون کی آج غلطیاں پکڑی جاتی ہیں۔ مگر ان کے استاد ہونے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بزرگوں نے خود آپس میں اور اپنے استادوں کے ساتھ اختلاف کر کے ہمیں یہ رستہ سکھایا ہے۔ ہم بزرگوں کے خدمت گار ہیں۔ مگر بزرگ پرستی سے بیزار، صرف ایک حقیقی بزرگ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے:۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ : (اس کے کسی فعل پہ کوئی چون و چرا نہیں کرسکتا باقی سب زیرِ سوال ہیں)

...... مجھے پھر یہاں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول یاد آیا ہے:۔

اے خدا! تو نے ان چیزوں کو داناؤں اور عقل مندوں سے چھپایا اور بچوں پر کھول دیا"

کمترین احمد الدین ۸ اگست ۱۹۱۶ء

(بحوالہ الوراثۃ فی القرآن ص ۱۲۸ مطبوعہ ۱۹۴۱ء)

اب ہم بعض اصحاب کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے خواجہ صاحب کی تنقید السراجیہ کو سنجیدہ غور کا مستحق سمجھا، آپ نے یتیم پوتے کے حصے کے متعلق خصوصاً دلائل قرآنیہ سے مفصل بحث کی تھی۔

علامہ عبداللہ العمادی

علامہ عمادی ان دنوں روزنامہ "زمیندار" کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کے رسالہ "معجزۃ القرآن" پر شاندار ریویو کیا —— جب یہ ریویو ملک میں پھیلا تو عام لوگ اس طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ مشہور کانگریسی رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور شیخ محمد صادق نے علامہ عمادی کے مضمون سے متاثر ہو کر رسالہ منگوا کر اس کا مطالعہ کیا۔ جب انجمن اسلامیہ امرتسر میں خواجہ صاحب کے خلاف شکایات پہنچیں تو ارکان انجمن کی ایک اہم جماعت کسی ترغیب کے بغیر خواجہ صاحب کی حمایت کے لیے کھڑی ہو گئی۔ —— انہی میں ڈاکٹر کچلو صاحب اور شیخ صاحب پیش پیش تھے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم خواجہ صاحب کے چہیتے دوست بھی رہ چکے تھے لیکن بعد میں بعض اختلافات کی وجہ سے آپ کے سب سے بڑے حریف بن گئے۔ برسوں آپس میں چشمکیں رہیں۔ محروم الارث پوتے کے متعلق آپ قدیم الخیال علماء کے ہم نوا تھے۔ اس کے باوجود آپ کے قلم سے یہ جملے

خواجہ صاحب کی جزوی حمایت کر رہے ہیں۔

"ہم ان سے منکر نہیں کہ علم فرائض میں جو مسائل تقسیم وراثت کے یا بعض ورثاء کے حصے لکھے گئے ہیں ان پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔

(ہفت روزہ "اہلحدیث" ۲۹ نومبر ۱۹۱۸ء)

علامہ ندوی نے دل کھول کر تبصرہ کیا اور لکھا کہ :۔

"معجزۂ قرآنی :۔ در بیان میراث مسلماناں۔ مولوی احمد الدین صاحب مدرس مدرسۃ المسلمین امرتسر نے مسائل میراثِ اسلامی پر ایک ناقدانہ رسالہ لکھا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ علماء میں اب ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو بلا خوف لومتہ لائم فقہائے متقدین شکر اللہ مساعیہم کے اجتہادات پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے برادران اہلِ حدیث سے توقعات تو بہت تھیں لیکن ان کی پچھلی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ نماز روزہ سے آگے ان کے زورِ بیان کے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا۔ ان مسائل میں جن کا ماحصل صرف افضلیت اور ترجیح پر ختم ہو جاتا ہے۔ زورِ استدلال اور قوتِ بیان سے آگے بڑھ کر مجادلہ، مقاتلہ اور متعادمہ (باہم مقدمہ بازی ــــ ناظرین اس عدم تقلید لغوی کو معاف فرمائیں) تک نوبت پہنچ جاتی ہے لیکن معاملات کہ جن پر مسلمانوں کے اجتماعی اور مالی حالات کا مدار ہے ان میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ اس بناء پر ہم نے مولوی (احمد الدین) صاحب کے رسالہ میراث کو پوری قدر اور غور سے پڑھا اور پھر اس یقین کے ساتھ اس کو ختم کیا کہ اس میں بہت سی باتیں لائقِ توجہ ہیں اور درحقیقت ان مسائل میں ہمارے فقہاء کتاب و سُنّت سے کسی قدر دور جا پڑے ہیں، لیکن تعین کے ساتھ ان مسائل پر اظہارِ خیال کے لیے فرصت درکار ہے واللہ تعالیٰ مسئول ان یوفقنی لہا۔

مولوی (احمد الدین) صاحب کے نقد کی بناء زیادہ تر شیعہ فقہ کے اصولِ وراثت پر ہے اولوالارحام کا مسئلہ علماء سنت میں بھی مختلف فیہ ہے۔

("معارف" صفر ۱۳۳۶ھ دسمبر ۱۹۱۷ء ص ۵۶)

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری

حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے جولائی و اگست ۱۹۱۸ء معارف میں خواجہ صاحب کی تائید میں ایک عالمانہ مضمون لکھا۔ اس کے علاوہ "معجزۂ قرآن" کی اشاعت کے چھ سال بعد ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ سے "معجزۂ قرآن"

کا خلاصہ عربی میں "الوراثتہ فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد رویتِ ہلال کی قطعیت اور عائلی قانون کے اوّلین مجوز مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے یتیم پوتے کے حقِ وراثت کے متعلق مختلف جرائد میں عالمانہ مضامین لکھے۔ اسی دوران میں ایک موقر و معروف ماہنامے نے اس مسئلے کو پوری طرح اپنا کر ملک میں اس کے حامی پیدا کیے۔ یہاں تک کہ نصف صدی پہلے کا بویا ہوا بیج آج بارآور درخت بن گیا۔

الحمد للہ علی ذالک وشکر اللہ ساعنھم

رحلت خواجہ صاحب ۱۳۵۵ھ میں چند ہفتے صاحب فراش رہ کر دنیائے فانی سے عالم باقی کی طرف راہی ہوئے۔ احباب کو اطلاع پہنچی تو بہت سے افسوس کے خطوط اور قطعات تاریخ موصول ہوئے۔

ان میں علامہ اقبال مرحوم۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی۔ ایچ۔ ڈی، خواجہ الہ بخش ڈیرہ نواب خواجہ عباد اللہ اختر مرحوم۔ حکیم ڈاکٹر طالب علی مرحوم اور مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ واضح ہو کہ خواجہ صاحب نے "بیان للناس" کے قرآنی نام سے سات جلدوں میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھی تھی، جو اَب نایاب ہے۔ الّا یہ کہ ان کے پرانے عقیدت مندوں میں سے کسی کے پاس محفوظ رہ گئی ہو۔ مختلف مذاہب و مشارب کے بہت سے لوگ آپ کے حلقۂ احباب میں شامل تھے جن میں سے چند ایک کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

علامہ عبداللہ العمادی علامہ عمادی مختلف علوم و السنہ کے فاضل اجل تھے۔ خواجہ صاحب کی قرآن فہمی اور اخلاق حمیدہ کے عاشق تھے۔ جن دنوں اخبار "وکیل" امرتسر کے ایڈیٹر تھے، ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور دونوں بزرگ مل بیٹھتے اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پادری خیر اللہ صاحب نے ہماری روایات و تفاسیر کی بناء پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حضرت مسیحؑ کی افضلیت ثابت کی۔ خواجہ صاحب نے قرآنِ حکیم کو بنائے استدلال اور حجت شرعی قرار دیتے ہوئے پادری صاحب کے تمام دلائل کا ابطال کر دیا۔ نہایت دلچسپ بحث ہوئی۔ خواجہ صاحب کے متین و سنجیدہ لہجے سے پادری صاحب بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ :-

"میں آپ سے گفتگو کرکے بہت خوش ہوا ہوں۔ آپ محقق اور علم دوست انسان ہیں۔ اکثر لوگ معاندانہ رنگ میں بحث کرتے ہیں۔ لیکن آپ کا اسلوب بے حد پسندیدہ ہے۔ کبھی کبھی تشریف لایا کیجیے۔"

علامہ اقبالؒ

ماہنامہ "بلاغ" (جو بعد میں "البیان" بنا) جس میں خواجہ صاحب کی تفسیر مسلسل شائع ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ آپ کے مکاتیب اور سوانح "اقبال کامل" سے ثابت ہے کہ آپ خاصے متاثر تھے۔ اس موضوع پر راقم کا ایک مضمون "دینِ اقبال" ماہنامہ "طلوعِ اسلام" میں شائع ہو چکا ہے۔ حکیم شہاب الدین مرحوم (متوطن جگدے کلاں موضع امرتسر) مدیر "بلاغ" نہایت مخلص عاشق قرآن اور صالح بزرگ تھے۔ لاہور جاتے تو علامہؒ سے ملتے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ "بلاغ" کے ذریعے سے علامہ اور خواجہ کے روحانی تعلقات تو تھے ہی، کچھ مدت بعد پروفیسر صوفی تبسم صاحب کی وساطت سے بالمشافہ تبادلہ خیال کی تجویز طے ہوئی۔ جس کی وجہ سے تعلقات اور زیادہ استوار ہو گئے۔ ایک صاحب جو اس صحبت میں موجود تھے انہوں نے اس کے مبادی اور ملاقات کا جو نقشہ کھینچا ہے ہم یہاں اس کی تلخیص درج کرتے ہیں:۔

"خواجہ صاحب نے فرمایا۔ میں اس ملاقات کو اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی وسیع معلومات سے استفادہ کروں۔ ڈاکٹر (اقبال) لکھتے ہیں کہ میں مولانا (احمد الدین) سے ملنا اپنے لیے باعثِ شرف خیال کرتا ہوں اور اس ملاقات سے میری غرض ان کے عمیق قرآنی مطالعہ سے استفادہ کرنا ہے اور بس ـــــ اس تواضع و انکسار نے بہت طول کھینچا ہے۔ احباب نے تنگ آکر کہا اس ملاقات کی اصل غایت یہ ہے کہ دو بزرگوں کے باہمی مذاکرہ علمی سے ہمیں فائدہ پہنچ جائے۔ ..... بالآخر صوفی تبسم صاحب خواجہ صاحب مرحوم کی معیت میں قبلہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رات کے ۹ بجے سے ساڑھے ۱۲ بجے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

گفتگو کی ابتدا باہمی اظہار انکسار سے ہوئی جس سے سراسر خلوص ٹپکتا تھا۔ صوفی صاحب کا بیان ہے کہ ـــــ میں نے جب ان بزرگوں کے مخلصانہ اندازِ گفتگو کو دیکھا تو مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میری آنکھوں میں محبت و عقیدت کے آنسو بھر

آئے اور میرا سر عجز سے خود بخود جھک گیا۔"

گفتگو دقیق فلسفیانہ مسائل پر تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک مسئلہ بیان فرماتے اور خواجہ مرحوم اس کی تائید میں آیات قرآنی پڑھتے۔ ڈاکٹر صاحب بعض آیات کو نوٹ کر لیتے۔ ساڑھے تین گھنٹے کے عرصے میں اثبات وجود باری، جبر و قدر، خیر و شر غرض ہر عمیق مسئلے پر بڑی دقت طرازی سے روشنی ڈالی گئی۔

حکیم طغرائی مرحوم

استاد حکیم طغرائی مرحوم بلند پایہ ادیب اور طبیب تھے۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد اطراف ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں قدرت سخن رکھتے تھے۔ عربی میں بھی خاصی دسترس حاصل تھی۔ عرصہ تک اخبار "وکیل" امرتسر اور ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" امرتسر کے مدیر اور عربی مترجم رہے۔ راقم الحروف نے آج سے کوئی نصف صدی قبل پہلے پہل خواجہ صاحب کو آپ ہی کے مطب میں دیکھا۔ لباس اور وضع قطع سے بالکل سیدھے سادے عام آدمی معلوم ہوتے تھے۔ جب حکیم صاحب سے گفتگو شروع ہوئی تو راقم نے (جو ان دنوں محض ایک مبتدی تھا) محسوس کیا کہ دنیائے آب و گل سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ گیا ہوں۔ حکیم صاحب سوال کرتے اور خواجہ صاحب جواب دیتے۔ عجیب و غریب باریک و عمیق مسائل نہایت اچھوتے انداز سے حل ہوتے جا رہے تھے۔ ع

"اے لقائے تو جوابِ ہر سوال"

کا سماں بندھا ہوا دکھائی دیتا تھا ــــ میں ان دنوں اخلاق جلالی وغیرہ مشکل کتابیں پڑھتا تھا۔ دورانِ سبق میں کوئی شخص حکیم صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرتا تو مجھے ناگوار محسوس ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی خواجہ صاحب آجاتے تو سبق ایک طرف دھرا رہ جاتا۔ آپ کی گفتگو سے سبق سے زیادہ اہم اور اونچی باتیں مل جاتیں۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب کی علالت کی خبر آئی تو حکیم صاحب عیادت کے لیے تیار ہوئے۔ میں نے عرض کیا "مجھے بھی ساتھ لے چلیے"! اس تقریب سے پہلے پہل خواجہ صاحب کا دولت کدہ دیکھا جو میرے غریب خانے سے بالکل تھوڑے ہی فاصلے پر نکلا۔ اس طرح مراسم بڑھتے گئے اور ان کے درسِ قرآن اور خطبات جمعہ میں شرکت کی سعادت سالہا سال تک حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ہفتے میں دو مرتبہ میاں مولا بخش مرحوم سوداگر صابون کے دولت کدے پر شبانہ صحبت ہوتی تھی جس میں مخصوص اہلِ علم شریک ہوتے مجھے اس میں باقاعدہ حاضر ہونے کا موقع برسوں تک ملتا رہا۔ ان صحبتوں میں جو کچھ حاصل ہوا، اب محسوس

کرتا ہوں کہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ذالِكَ فَضل اللہ یوتیہ من یشاء والحمد للہ علی احسانہٖ ۔

ڈاکٹر صادق علی کپورتھلوی

ڈاکٹر صاحب سرسید کے معاصرین اور "تہذیب الاخلاق" کے مضمون نگاروں میں تھے۔ دینیات سے بہت شغف رکھتے تھے طبّ یونانی، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک اور روحانی طریق علاج میں منتہی تھے۔آپ نے خواجہ صاحب کے قرآنی مضامین کا مطالعہ کیا تو ربط بڑھا۔ باہمی محبت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ امرتسر آتے تو ملاقات کرتے۔ راقم کو بھی بارہا آپ سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب کے خلف الرشید خواجہ ضیاء اللہ مرحوم کپورتھلے گئے تو خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو سلام و پیام بھیجا۔ اس ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کے فقرے استعمال کئے :۔

"صاحبزادے ! تمہارے والد نے قرآن کو سمجھنے میں بہت محنت کی ہے"

"تمہارے باپ کا فہم و ذکا مسلّم ہے"

مولانا احمد الدین صاحب کے علم و فضل کا میں قائل ہوں"

ڈاکٹر صاحب نے رحلت کے وقت اپنے بے حد شریف و ذی علم داماد ڈاکٹر شفاعت احمد (ہومیو پیتھ) کو وصیت فرمائی کہ خواجہ صاحب کو ضرور ملتے رہیں اور ان سے فیض حاصل کریں ـــــ ڈاکٹر شفاعت احمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل امرتسر کو ہومیوپیتھک طریق علاج سے متعارف کرایا۔ ذوق شعر بھی نہایت پاکیزہ تھا۔ مولانا گرامی اور بڑے بڑے شعراء و ادباء سے تعلقات تھے۔ تسنیم تخلص کرتے تھے۔ حکیم طغرائی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کے بہت قدردان تھے۔ کئی مسائل میں اختلاف بھی رکھتے تھے۔

لالہ ہردیال آریہ سماج امرتسر کے سیکرٹری تھے۔ خواجہ صاحب سے اکثر ملتے اور اختلافی مسائل پر گفتگوئیں ہوتیں۔ مولانا غلام العلی کے دیکھنے والوں میں سے تھے۔ مولانا اور خواجہ دونوں کے اخلاق کے مداح تھے۔

حکیم مولوی نورالدین بھیروی ثم قادیانی سے خواجہ صاحب کے تعلقات نہایت محبانہ تھے۔ دینیات اور طب دونوں میں غیر معمولی شغف اور مہارت رکھتے۔ ایک خاص مذہبی فرقے کے امام و

خلیفہ اوّل ہوتے ہوئے خواجہ صاحب کے بے فرقہ اسلام اور آزادانہ قرآن فہمی کی دل سے قدر کرتے تھے۔

علامہ محمود زرقانی بہائی

آپ بہائی فرقہ کے مبلغ اور جناب عبدالبہا عباس آفندی خلف جناب بہاء اللہ ایرانی بانی فرقہ بہایہ کے رفیقِ تبلیغ رہ چکے تھے ممالک عربیہ میں بہائیت کے پرچار میں آپ کا اہم حصّہ ہے۔ راقم نے خواجہ صاحب کے ساتھ آپ کی دو ملاقاتیں اور بحثیں دیکھیں۔ خواجہ صاحب کا موقف یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، اور وہ اس کے خلاف تھے۔ دونوں طرف کے دلائل سننے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے چند برس پہلے بھی وہ خواجہ صاحب سے مل چکے تھے۔

میاں مولانا بخش سوداگر صابون خواجہ صاحب کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے سب سے بڑے قدرشناس تھے۔ ان کی تصانیف کی اشاعت میں غالباً مالی اعانت سب سے زیادہ میاں صاحب ہی کرتے تھے۔ اخلاقاً بھی میاں صاحب خواجہ صاحب کے رنگ میں رنگیں تھے۔

خواجہ غلام محمد محقق کسی زبان یا علم کے باقاعدہ فاضل نہیں تھے لیکن بے پناہ ذوق مطالعہ اور قوی حافظہ کی وجہ سے مختلف علوم میں اتنا تبحّر تھا کہ جس موضوع پر گفتگو کرتے اس کے جزئیات تک کو احاطہ تقریر میں لے آتے۔ فلسفہ جدید و قدیم، تصوّف، ادب و یدانت، مذاہب عالم، مشکلاتِ قرآن، تاریخ وغیرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب سے بہت محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ اور اکثر مسائل پر آپس میں گرما گرم بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ جن سے مجھ ایسے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا تھا۔

معجزانہ قرآن فہمی

خواجہ صاحب نے اپنی طرف سے ماحول کے فرقہ پرستانہ اثر سے آزاد ہو کر قرآن حکیم کا مطالعہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال کا یہ شعر اقبال سے زیادہ ان پر صادق آتا ہے :-

کھویا گیا جو مقصد ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو، جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

اور آج سے صدیوں پہلے حافظ نے بھی یہی کہا تھا۔

جنگ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

جو شخص بھی حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے نکلے گا اس کو عوامی افسانہ طرازیوں کے خارزار سے دامن بچا کر آگے بڑھنا ہوگا۔ جہاں وہ کئی صحیح باتوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگا وہاں باقتضائے بشریت کوتاہیاں بھی سرزد ہوں گی۔ آنے والے محققین ان کوتاہیوں کی نشاندہی کریں گے اور یوں انسانی ارتقاء کا قافلہ آگے سے آگے بڑھتا جائے گا۔ یہی خصوصیتیں ہمیں خواجہ کی تحقیقات میں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی حیرت انگیز ذہانت و فراست کے ساتھ ساتھ ایسی باتیں بھی نظر آئیں گی جو محتاج تنقید قرار پائیں گی۔ چنانچہ ان کی عقلِ سلیم نے جا بجا اپنی تصانیف میں اس نوع کے اعترافات کئے ہیں۔

۔۔۔۔۔۔۔ (برادرانِ اسلام) کمترین کے پیش کردہ طریق (وراثت) میں مناسب اصلاح فرمائیں اور اس میں جو نقص رہ گئے ہیں ان کو دور کر دیں اور اگر اسے ہی صحیح تصور فرمائیں تو ضرور اس کی تصدیق کریں۔ کمترین کو ہرگز ہرگز کوئی ضد اور تعصب مقصود نہیں ہے صرف قرآنِ بے مثل اور رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) افضل کی عزت و شرف ثابت کرنا مقصود ہے۔۔۔۔

(دیباچہ "الوراثۃ فی القرآن" احمد الدین ۱۹۱۴ء)

خواجہ صاحب کی معجزانہ قرآن فہمی کے متعلق یہاں نہایت اختصار سے دو ایک اشارے پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ متعدد آیات لاتے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وارثوں کے کل حصے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کر دیے ہیں۔ اس لیے خارج از قرآن جستجو کی ضرورت نہیں۔ مثال کے طور پہ ایک آیت دیکھیے :-

"تمہارے ماں باپ اور اولاد جو ہیں تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون سا تمہارے لیے زیادہ قریب ہے۔ نفع دینے میں اس لیے خود خدا تعالیٰ نے حصے مقرر فرما دیے ہیں۔ (سورہ ۴ آیت ۱۲)

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ چونکہ ہم خود دریافت نہیں کر سکتے کہ ماں باپ کو زیادہ دینا ہے یا اولاد کو، اس لیے خدا تعالیٰ ہی نے حصے مقرر فرما دیے ہیں اور جب ہم ماں باپ اور اولاد کے حصے نہیں جان سکتے تھے تو جن کا ہم سے ان کے ذریعے تعلق ہوتا ہے ان کے حصے کب جان سکتے ہیں پس ضرور ہے کہ کل حصے خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے بتلائے گئے ہوں۔ الغرض قرآن مجید کے علاوہ تقسیم میراث کے اصول و قواعد اور جگہ سے ڈھونڈنا ہماری پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔" (الوراثۃ فی القرآن ص۲)

چند صفحے آگے بڑھ کر لکھتے ہیں :۔

"قرآن مجید میں صرف تین آیات ہیں جن میں کل حصّے بیان کیے گئے ہیں۔ وہ تینوں سورت نساء میں ہیں۔ ان میں سے دو اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں ہیں اور ایک سورۃ کے اخیر میں ہے۔ (ایضاً ص۲۸)

اس کے بعد آیات مع ترجمہ و تشریح پیش کی ہیں۔ انہوں نے اپنی اس معجزانہ قرآن فہمی کا نام "معجزہ قرآن" تجویز کیا۔ واقعی یہ قرآن معجز بیان کا اعجاز ہے کہ صرف تین آیات میں ایسے عمیق مسائل بیان فرما دیے جن کو انسانی عقل حل نہیں کر سکتی تھی۔

حیرت انگیز

اب ہم خواجہ صاحب کی قرآن فہمی کی ایک اور حیرت انگیز مثال بیان کر کے اس موضوع کو ختم کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے سائنس اور اسٹرانمی و ہیئت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۰۴ء کے آغاز میں اخبارات میں شائع ہوا کہ سورج میں ایک بہت بڑا سیاہ داغ نمودار ہوا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے کئی دوستوں اور رشتہ داروں سے ذکر کیا کہ ایک خوف ناک زلزلے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۰۴ء کی صبح کو بہت بڑا ہولناک زلزلہ آیا جس میں کانگڑہ تباہ ہو گیا اور کئی شہروں کی بنیادیں ہل گئیں اس موقع پر آپ کے احباب نے دریافت کیا کہ ـــــ "آپ کو پہلے سے اس قیامت خیز زلزلے کا علم کیسے ہوا؟" ـــــ آپ نے فرمایا :۔

مجھے وحی نہیں ہوئی اور اس پیش گوئی میں میری کوئی خصوصیت نہیں۔ یہ تو قرآن مجید کی بے مثل خوبی ہے کہ اس میں بے شمار علمی حقائق بھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس زلزلے کے متعلق آیاتِ ذیل روشنی ڈال رہی ہیں :۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ..... الخ یعنی جب سورج لپیٹا جاتا ہے (اس کی روشنی میں داغ پیدا ہونے کی وجہ سے کمی واقع ہو جاتی ہے) اور جب ستارے میلے ہو جاتے ہیں (سورج کی کمی کے سبب ستارے بھی گدلے ہو جاتے ہیں) تو اس کے نتیجے کے طور پر پہاڑ اڑائے جاتے ہیں ـــ گویا زلزلے آتے ہیں۔

چونکہ سورج میں داغ پڑنے کی اطلاع موصول ہوئی تھی، اس لیے قرآنِ حکیم کے اس ارشاد کے پیشِ نظر مجھے خیال ہوا کہ خوف ناک زلزلہ آئے گا۔ قرآن مجید میں ایسے کروڑوں علم بھرے پڑے ہیں

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً ۔ (سیرت احمد الدین صـ۴۷)

فلکیات میں خواجہ صاحب کی مہارت کا یہ حال تھا کہ رات کو گھڑی دیکھے بغیر ستاروں کی پوزیشن دیکھ کر صحیح وقت بتادیا کرتے تھے ۔۔۔۔۔۔ سیاروں کی رفتاروں اور بروج کے متعلق وسیع معلومات رکھتے تھے ۔ ایک دفعہ زور سے بجلی کڑکی ۔ فرمایا یہاں سے ۸ میل پر گری ہے ۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ جنڈیالہ گرو بجلی گری اور ایک بھینس مرگئی ۔ یہ جگہ امرتسر سے ۸ میل ہے ۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کو کس طرح پتہ چلا تو فرمایا یہ علم غیب نہیں اس کا تعلق علم حساب سے ہے ۔

پنجابی تو آپ کی مادری زبان تھی ۔ اس کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں مہارت رکھتے تھے ۔ بھاشا اور گورمکھی ۔ آریہ اور سکھ لٹریچر کے مطالعہ کے لیے ضرورتاً سیکھنی پڑی ۔ کچھ عرصہ پشتو سے بھی رغبت رہی ۔

قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کو مختلف علوم سے آگاہی حاصل کیے بغیر تسلی بخش طریقے سے سمجھا نہیں جا سکتا ہے ۔ اس ضرورت کے تحت آپ نے علوم ذیل میں مہارت حاصل کی :۔

ربا، ٹیکس، زکواۃ، صدقہ، قرض وغیرہ سے متعلقہ آیات کو سمجھنے کے لیے اقتصادیات کا مطالعہ کیا ۔ بدائع وصنائع میں کامل الفن تھے ۔ علم بیان کی باریکیوں پر بھی نظر رکھتے تھے ۔ تاریخ کا وسیع مطالعہ تھا ۔ ساری دنیا کا جغرافیہ قریب قریب ازبر تھا ۔ صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث بھی دیکھ چکے تھے ۔ بائیبل پر کامل عبور تھا ۔ اس کی مشکلات کو حل کرانے کے لیے فاضل پادریوں کے پاس پہنچے تھے ۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر ٹسڈل مصنف ینابیع القرآن کو ملتے رہتے تھے ۔ وید، گرنتھ، منوسمرتی، ستیارتھ پرکاش اپ نشد ۔ جماعت احمدیہ اور بہائیہ وبابیہ کے لٹریچر سے خاصی واقفیت رکھتے تھے ۔ شیعہ حضرات کی احادیث فقہ اور تفاسیر بھی آپ کی نظر سے گزر چکی تھیں ۔ ریاضی کے ماہر خصوصی تھے ۔ اس کی تمام شاخوں الجبرا، ٹرگنومیٹری، حساب، جیومیٹری، کیلکولس وغیرہ میں خاص مہارت تھی ۔ جن زبانوں کا علم تھا ان کی گرامر سے بھی واقف تھے ۔ علم طبقات الارض کا گہرا مطالعہ تھا ۔ علم طب میں استادانہ مرتبہ رکھتے تھے ۔ عروض پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے ۔ فلکیات کا ذکر اوپر گزر چکا ہے ۔ فلسفے سے خاص ذوق رکھتے تھے ۔ علم نباتات کا بھی مطالعہ فرمایا تھا ۔ منطق میں کافی مہارت تھی ۔ لیکن مغالطے کے اصول کو کراہت سے دیکھتے تھے ۔ موسیقی کا مطالعہ تو نہیں کیا تھا لیکن بعض ماہرین سے اس کے رموز ونکات دریافت کرتے تھے ۔

آپ کی تفسیر کا مطالعہ کرنے سے موقع بموقع ان علوم سے آپ کی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔

اتنا کچھ جاننے کے باوجود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم سمجھتے تھے۔ ہمیشہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ اور رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ بے شمار شاگردوں کے باوجود کسی کو اپنا شاگرد نہیں کہتے تھے۔ کوئی پوچھتا تو یہی کہتے "ہاں ان سے مل جل کر فلاں کتاب پڑھتے ہیں"۔ تفسیر کے متعلق کہا کرتے تھے۔ آنے والا مفسر قرآن حکیم کے زیادہ عجائبات کا ماہر ہوگا۔ قیامت تک اس سے نئے نئے علوم حاصل ہوتے رہیں گے۔ اپنے آپ کو کبھی بے غلط قرار نہیں دیتے تھے۔ جب کوئی نئی بات سمجھ میں آجاتی بھری بزم میں اعتراف کرتے اور شخص مخاطب سے کہہ دیتے کہ "یہ بات میں نے آپ سے سیکھی ہے"۔

کلمۃ الحکمۃ جہاں سے ملتا قبول کر لیتے۔ غلط اور خلافِ قرآن بات کسی بڑے سے بڑے شخص کی طرف منسوب ہو یا تواتر و تعامل کا لباس پہن کر آئے اس سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ طبعاً اس شعر کے مصداق واقع ہوئے تھے ؎

ازاں کہ پیروئ خلق گم دہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتہ است

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ خواجہ صاحبؒ کے جسمانی و روحانی اخلاف میں ابھی ایسے اصحاب موجود ہیں جو مرفہ الحال ہیں۔ علم و فضل اور اسباب و وسائل سے بہرہ مند ہیں۔ کیا وہ اپنے فاضلِ اجل بزرگ کو سچ مچ مرگِ گمنامی کے پردے میں ہمیشہ ہمیشہ مستور رکھنا پسند کریں گے۔ یہ نہ صرف آں مرحوم کے علمی احسانات کی بے قدری ہوگی۔ بلکہ علومِ قرآنی کے محققین کے ساتھ بھی سخت بے انصافی ہوگی۔

علامہ عمادی، علامہ ندوی، علامہ اقبال اور علامہ اسلم جیراجپوری ایسے مختلف الخیال بزرگ معاصرت کی حجاب آرائیوں سے بے نیاز اور متفق اللسان ہو کر جس ہستی کی مجتہدانہ بصیرت و حقانیت کا فراخدلانہ اعتراف کر رہے ہوں خدا نہ کرے کہ اس کی دقیق تفسیری کاوشیں دست بُردِ روزگار کی نذر ہو کر رہ جائیں ؎

نام نیکِ رفتگانِ ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

"امروز" لاہور ۱۳/۵/۶۱

مکرمی تسلیم! فاضل طبیب جناب عرشی امرتسری کی نگارشات بعنوان ایک فراموش عظمت پر یہ امور قابلِ دریافت ہیں۔

مانشنہ لبانیم توئی آبِ حیات

سیّدی عرشی فرماتے ہیں "مولانا ثناء اللہ مرحوم خواجہ صاحب کے چہیتے دوست بھی راہ پر آگے تھے۔ بعد میں بعض اختلافات کی وجہ سے آپ کے سب سے بڑے حریف بن گئے"۔ خواجہ صاحب سے مراد عنوان مضمون کی فراموش عظمت خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری ہیں — سوال یہ ہے کہ کیا مولانا ثناء اللہ خواجہ احمد الدین کی مانند حجیت حدیث کے ترک کی "راہ پر آگے تھے"؟ آپ (عرشی صاحب) نے یہ بات کیسے پائی؟ اس کا تحریری ثبوت ہونا چاہیئے۔

دوسرا سوال :۔ مولانا ثناء اللہ اور خواجہ احمد الدین صاحب قدسی سترہ کے متعلق ہے۔ حضرت عرشی دربار کے مولوی ثناء اللہ فرماتے ہیں "محرم الارث پوتے کے متعلق آپ قدیم الخیال علماء کے ہمنوا تھے۔ اس کے باوجود آپ کے قلم سے یہ جملے خواجہ صاحب کی جزوی حمایت کر رہے ہیں"۔ لیکن جس ہفت روزہ اہلِ حدیث ۲۹ نومبر ۱۹۱۸ء کا آپ (عرشی صاحب) نے حوالہ دیا ہے اس پورے مضمون (از ص ۱ تا ص ۳) میں خواجہ احمد الدین صاحب کی طرف تو مولانا ثناء اللہ کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ البتہ اس سلسلے کے پہلے مضمون اخبار اہلِ حدیث ۱۸ مئی ۱۹۱۷ء صفحۂ اوّل پر شیخ محمد صادق بیرسٹرایٹ لاء امرتسر کے مضمون مندرجہ اخبار ٹریبون لاہور کا تذکرہ ہے۔ جناب عرشی کو شاید یہی مغالطہ ہوا۔ جو شیخ صاحب کی بجائے خواجہ احمد الدین صاحب کا نام نامی لکھ دیا۔ "امداد کن! امداد کن! اے خواجۂ امرتسری"۔ مولانا ثناء اللہ کے مضمون (مندرجہ اہلِ حدیث ۱۸ نومبر ۱۹۱۸ء) میں علامہ اسلم صاحب جے راجپوری کے اس مضمون پر محاکمہ ہے جو انہوں نے رسالہ مصارف بابت جولائی ۱۹۱۸ء میں شائع کرایا۔ جس کا تذکرہ جناب عرشی صاحب نے بھی فرمایا ہے۔ لیکن علامہ اسلم صاحب کے مضمون پر مولانا ثناء اللہ کے محاکمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح نے خواجہ احمد الدین صاحب کی بجائے نفسِ مضمون کو اپنی تحقیق بتایا ہے۔ میں عرشی صاحب سے دریافت کر سکتا ہوں کہ اس میں کیا راز ہے؟ اور اسی طرح چودھری غلام احمد

صاحب پرویز مدیر رسالہ "طلوعِ اسلام" یتیم پوتے کی وراثت کو اپنی تحقیق ثابت کرتے ہیں۔ باوجودیکہ پرویز صاحب نے علامہ اسلم کو پایا اور ان سے استفادہ کیا لیکن مجروح نے اس بارے میں علامہ اسلم سے استفادہ کا تذکرہ کبھی نہیں کیا۔ گویا ثابت ہوا کہ یتیم پوتے کی وراثت کے محقق اوّل ۳ صاحب ہیں (۱) خواجہ احمد الدین صاحب (بقول علامہ عرشی) ۲۔ علامہ اسلم صاحب (بقول اخبار اہلِ حدیث) ۳۔ چودھری غلام احمد صاحب پرویز (بقول خویش) ہم لوگ اس بارے میں اولیت کا تاج کس کے سر پہ رکھیں؟

(ابو یحییٰ — لاہور)

مکرمی، تسلیم! میں اپنے مخدوم حضرت مولانا ابو یحییٰ صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے مضمون "ایک فراموش شدہ عظمت" (امروز، مئی ۱۹۶۱ء) کو قابلِ التفات سمجھا اور ۱۳ مئی ۶۱ء کے "امروز" میں مجھے شرفِ تخاطب بخشا۔ آپ نے مجھ سے تین سوال دریافت فرمائے ہیں۔ ان کے متعلق نمبروار عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:۔

(۱) جو مضمون بہت صاف لکھا چھپا ہو اُسے کم از کم غور سے پڑھ لیا کریں۔ میرے الفاظ یہ ہیں:

"مولانا ثناء اللہ مرحوم خواجہ صاحب کے چہیتے دوست رہ چکے تھے"۔ اور آپ اسے یوں نقل فرماتے ہیں:

"مولانا ثناء اللہ مرحوم خواجہ صاحب کے چہیتے دوست بھی رہ پر آ لگے تھے"۔ "رہ چکے تھے" اور "رہ پر آ لگے تھے" میں بڑا فرق ہے۔ آپ نے اپنی طرف سے ایک جملہ تحریر فرمایا اور اس کو مبنیٰ قرار دے کر سوال جڑ دیا۔ فرمائیے آپ کے سوال کا کیا جواب دیا جائے؟ جس طرح آپ نے قابلِ اعتراض جملہ تصنیف فرمایا ہے اسی طرح جواب بھی خود ہی تصنیف فرما لیجئے۔

(۲) آپ فرماتے ہیں کہ "مولانا ثناء اللہؒ نے اپنے مضمون مطبوعہ ۲۹ نومبر ۱۹۱۸ء میں خواجہ (احمد الدین) کی طرف اشارہ نہیں کیا"۔

میں نے بھی کسی اشارے کا دعویٰ اپنے مضمون میں نہیں کیا۔ میری گذارش کا ماحصل یہ ہے کہ گذشتہ ساڑھے سات سو برس میں جس کتاب (السراجیہ) کو (میرے علم کی حد تک) کسی بڑی سے بڑی دینی ہستی نے بھی شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس پر سب سے پہلے خواجہ مرحوم

نے نکتہ چینی کی۔ اس پر دینی حلقوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ لیکن علماء کرام ہی کے گروہ میں سے بعض بزرگوں نے مرحوم کی تنقید السراجیہ کو سنجیدہ غور کا مستحق سمجھا اور بعض قانون دان بھی اس سے متاثر ہوئے۔ جن میں ڈاکٹر کچلو اور شیخ غلام صادق بیرسٹرایٹ لاء کے نام میں نے لکھے ہیں ـــــ مولانا ثناء اللہ نے اگر شیخ صاحب کے مضمون "مطبوعہ ٹربیون پر خامہ فرسائی فرمائی اور اس میں یہ اعتراف کر لیا کہ :۔

"ہم اس کے منکر نہیں کہ علم فرائض میں جو مسائل تقسیم وراثت کے یا بعض ورثاء کے حصے گئے ہیں ان پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔"

تو کیا اس فقرے میں نکتہ چین اوّل (خواجہ احمد الدینؒ) کی جزوی حمایت نہیں نکلتی؟ ظاہر ہے کہ شیخ مرحوم نے خواجہ صاحب ہی سے متاثر ہو کر ٹربیون میں مضمون لکھا تھا۔

(۳) آخر میں آپ نے تین نام پیش کر کے دریافت فرمایا ہے کہ "اولیت کا تاج کس کے سر پر رکھیں؟" اس کے متعلق عرض ہے کہ :۔

خواجہ صاحب کی تنقید السراجیہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ اگر اس سے پہلے کسی نے کچھ لکھا ہو تو اس کے سر پر تاجِ اولیت رکھ دیجئے۔

"معارف" اعظم گڑھ میں علامہ سید سلیمان نے اس پر دسمبر ۱۹۱۷ء میں اپنا تبصرہ لکھا۔ علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون جولائی اگست ۱۹۱۸ء کے "معارف" میں چھپا۔

محترم پرویز صاحب نے تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں آکر اس پر مضامین لکھے ـــ

آپ کے خاص دوست مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی نے خواجہ صاحب کے مسلک کی تائید میں کئی مضامین لکھے۔ ان کا یہ اعتراف آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ "ہم خواجہ احمد الدین امرتسری ہی کے مسلک کو پسند کرتے ہیں۔ (اجتہادی مسائل ص ۲۲)

اس سے آپ جو نتیجہ نکال سکتے ہیں نکال لیجیے۔ لیکن اولیت کا تاج کسی کے سر پر رکھنے کی کوئی بے چینی میں اپنے اندر نہیں پاتا۔ ہاں یہ اعتراف تو کرنا ہی پڑے گا کہ جن لوگوں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا وہ اصابت رائے رکھتے تھے اور ان کی کوششیں آج پاکستان میں بار آور ہوئیں۔ زمانی تقدم کوئی قابلِ ذکر شرف نہیں۔ سیدنا نوحؑ کی وحی سے خاتم المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی باوجود تاخر کے افضل ہے۔ لیکن محض تاریخی نقطۂ نگاہ

سے ترتیب زمانی یوں ہے کہ حضرت خواجہ صاحب نے سب سے پہلے یتیم پوتے کے مسئلے پر خامہ فرسائی کی۔ اس کے بعد اسلم جیراج پوری، مولانا غلام احمد پرویز، مولانا تمنا عمادی اور مولانا محمد جعفر پھلواروی نے اس سلسلے میں مختلف زاویوں سے جلا پیدا کی۔ دراصل یہ سب حضرات قابلِ تشکر ہیں نہ کہ تنہا خواجہ صاحب آپ مسئلے کی اصابت کا اعتراف کیجئے اور تاج اولیت کی غیر ضروری بحث میں پڑ کر اصل مسئلے کو نہ الجھائیے

اس بحث پر میری یہ آخری گذارش ہے اگر میرے مخدوم مولانا ابو یحییٰ صاحب اس سے مطمئن نہ ہو سکیں تو میں ابھی سے اعترافِ قصور کر لیتا ہوں۔

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

عرشی ـــــــــ لاہور

جامیؔ و اقبالؔ بحضورِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

۱۱ اپریل "شبِ معراج" اور ۲۱ اپریل "یومِ اقبال" محبؐ و محبوبؐ دونوں کی یادگاریں ایک ہی ماہ میں جمع ہو رہی ہیں۔ اس مبارک اور جامع تقریب پر ذیل کا مقالہ سپردِ قلم کیا جا رہا ہے۔ (راقم)

گاؤ فری ہنگس نے "اپالوفار محمدؐ" میں لکھا ہے:۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروؤں کا نشہ حواریانِ عیسیٰؑ میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ ان کا پیشوا موت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ اس کے لیے صلیب تیار کی جا رہی ہے اور وہ اپنی جانیں بچانے کی فکر کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رفقاء نے آپؐ پر اپنی جان نثار کر کے آپؐ کو تمام دشمنوں پر غالب کر دیا۔ معرکہ احدؔ میں جبکہ مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ آپؐ نے پکارا "کون ہے جو مجھ پر جان دیتا ہے؟" دفعتہً سات انصاری نکلے اور ایک ایک کر کے قربان ہو گئے۔ ایک انصاری خاتون کا باپ، بھائی اور شوہر یکے بعد دیگرے اس معرکے میں کام آئے۔ وہ پورے حوصلے سے سب کی موت کی خبر سنتی ہے اور پوچھتی ہے "یہ بتاؤ وہ جانِ عالمؐ کیسے ہیں؟" لوگوں نے کہا "آپؐ خیریت سے ہیں۔" قریب آتی ہے، چہرہ مبارک کو دیکھتی ہے اور پکار اٹھتی ہے:۔

"کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جلل یَارَسُوْلَ اللّٰہ"

"تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں اے اللہ کے رسولؐ۔"

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا۔ اے شہِ دیںؐ! تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں میں بھی ہمیں حواریان مسیحؑ ایسا روکھا پن نظر آتا ہے اور عشق و فدائیت جو مسلمانوں کو اپنے پیغمبرؐ سے آپؐ کی حیاتِ مبارکہ ہی سے رہی ہے غالباً کسی اور امت اور نبی کو میسر نہیں ہوئی۔ اس امت کے عوام و خواص ہر دور میں اپنی جان و مال کی قربانی سے اس عشق و

شیفتگی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں اگر ہم صرف اپنے ادبی ذخائر ہی کا جائزہ لیں تو عشق رسول ؐ کے بلند اور پاکیزہ ترین جذبات پر مشتمل نظم و نثر کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

حضرت مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؔ رحمتہ اللہ علیہ جن کے علم و کمال کا شہرہ چار دانگِ عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ زمانے کے عقلی و نقلی علوم میں تبحرّ و مہارت رکھنے کے میکدۂ عشق و عرفان کے بھی رندلم یزل تھے۔ نعتِ رسول ؐ میں آپ کا پایا بہت بلند تسلیم کیا گیا ہے —— آپ رسم و تبرک کے طور پر نعت نہیں لکھتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشقِ رسول ؐ میں ڈوب کر سوزِ فراق اور شوقِ وصال کے جذبات سے بھرپور ہو کر گلشنِ سینہ کے آتش پاروں کو کاغذ کی سطح پر بکھیر رہے ہیں۔ آپ کی بہت سی نعتیہ نظمیں مشہور ہیں اور نعت خوانوں، قوالوں اور ریڈیو کی زبان پر جاری ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک غیر معروف نعت کا تعارف کراتے ہیں۔ جو شاید سب سے زیادہ سوز و گداز کا مرقع ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے دنیائے نعت میں اس کی نظیر نہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ آپ کی شہرۂ آفاق تصنیف "داستانِ یوسف و زلیخا کے آغاز میں مندرج ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حج بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں اور اپنے وطن پہنچ کر اسی کیفیت سے سرشار ہیں — جسم اگرچہ وطن میں ہے لیکن روح کو وہیں چھوڑ آئے ہیں۔

کنوں گر تن نہ خاکِ آں حریم است

بحمد اللہ کہ جاں آں جا مقیم است

اگرچہ جسم اب اُس مبارک مقام میں نہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اسی جگہ اقامت پذیر ہے اس شعلہ خیز اور آتش ریز نظم کا عنوان ہے۔

"لباسِ ضراعت پوشیدن و در اقتباسِ شفاعت کوشیدن"

یعنی عجز و زاری سے حصولِ شفاعت کی کوشش کرنا۔

آغازِ کلام ہی میں آدابِ شعر کی پابندی کے ساتھ اظہارِ جذبات کا بے ساختہ پن ٹپک رہا ہے فرماتے ہیں:۔

(۱) زمہجوری بر آمد جانِ عالم ؐ
ترحّم یا نبیؐ اللہ ترحّم!

(۲) نہ آخر رحمتہ اللعالمینی ؟
نہ محرومان چرا غافل نشینی ؟

(۳) ز خاک اے لالہ سیراب برخیز
چو نرگسِ خواب چند؟ از خواب برخیز

(۴) بروں آور سر از برد یمانی
کہ روئے تست صبح زندگانی

(۵) شبِ اندوہ مارا روز گرداں
زِ رویت روز ما فیروز گرداں

ان اشعار کا ترجمہ کیا کروں، جی چاہتا ہے یہی کاغذ اور یہی قلم ہاتھ میں لیے ہوئے اسی وقت روضۂ مبارکہ پر جا پہنچوں، آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان رواں ہو اور زبان جامی کے ان شعروں کی پکار کر رہی ہو :۔

(۱) ایک عالم کی جان فراق سے لبوں پر آ پہنچی
اے اللہ کے نبیؐ رحم ، رحم

(۲) کیا آپ رحمتِ عالم نہیں ہیں ؟
آپ ہم فراق زدوں سے بے پروا کیوں ہیں؟

(۳) اے لالہ سیراب! خاکِ مزار سے نکل آیئے
نرگس کی طرح نیند کب تک؟ نیند سے جاگیئے

(۴) یمنی چادر (کفن مبارک) سے سرِ مبارک
باہر نکالیے! آپ کا رخِ انور زندگی کی صبح ہے

(۵) ہماری دکھوں کی تاریک رات کو روزِ روشن بنا دیجیے
اور اپنے جمال مبارک سے ہمارے دلوں کو بابرکت کر دیجیے

ان اشعار سے آگے التجائے عشق جذبات مراد کی ترجمانی کر رہی ہے :۔
"عنبریں پوشاک پہن کر، سر پر سفید کافوری عمامہ باندھے ہوئے فرقِ مبارک

سے گیسو لٹکائے اور سرور داں کا سایہ قدم مبارک پر ڈالے ہوئے۔ طائفی نعلین میں ہماری رگِ جان کے تسمے پروئے ہوئے حجرہ مزار سے صحنِ حرم میں تشریف لے آئیے۔ دنیا بھر کی آنکھیں آپؐ کے استقبال کے لیے فرشِ راہ ہیں۔

ادیم طائفی نعلین پاکن
شراک از رشتۂ جاں ہائے ماکن

جہانے دیدہ کردہ فرش راہ ہند
چو فرش اقبال پابوس تو خواہند

اس کے بعد اپنے سفرِ حجاز کی دلکش داستان مزے لے لے کر دہراتے ہیں اور منبر و مسجدِ نبویؐ کی یاد سے مسرور و مخمور ہوتے ہیں۔

(۱) خوشا کر گرد راہ سویت رسیدیم
بدیدہ گرد از کویت کشیدیم

(۲) بہ مسجد سجدۂ شکرانہ کردیم
چراغت را ز جاں پروانہ کردیم

(۳) بگرد روضۂ ات گشتیم گستاخ
دلم چوں پنجرہ سوراخ، سوراخ

(۱) کیسا خوش قسمتی کا دن تھا جب ہم راہ کے گرد و غبار سے گزر کر آپ کے حضور پہنچے اور آنکھوں کے پانی سے آپ کے درِ اقدس کی گرد صاف کی۔

(۲) آپؐ کی مسجد میں پہنچ کر سجدۂ شکرانہ ادا کیا اور چراغ مسجد پر جان کو پروانہ وار نثار کیا۔

(۳) عاشقانہ ذوق و جرأت سے روضۂ مبارک کے گرد پھرے، دل کی یہ حالت تھی کہ فراق کے صدموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔

جامی کی یہ والہانہ فریادیں نویں صدی ہجری کی پیداوار ہیں ـــــ اب ہم درمیانی پانچ صدیاں عبور کر کے چودھویں صدی میں پہنچتے ہیں تو اقبال کو اسی عشق میں سرشار دیکھتے ہیں۔ اس کی ابتدائی

شاعری اسی سوز سے مخمور تھی اور آخیر تک یہی سوز اس کا سرمایۂ سخن اور غذائے روح بنا رہا۔ ۱۹۰۵ء سے پہلے کے حصّہ کلام میں "بلالؓ" پر جو نظم اُس نے لکھی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلال حبشیؓ کی روحِ عشق اس کے پیکرِ ہندی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ مسجدِ نبویؐ کے مقدس مؤذن کو خطاب کر کے لکھا ہے :۔

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طُور تھا گویا

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدارِ عام تھا اُس کا

۱۹۰۸ء کے بعد کی نظموں میں جا بجا شاعر کا عشق شعلہ ریزی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ "بلادِ اسلامیہ" "ایک حاجی مدینے کے راستے میں"۔ "شکوہ جواب شکوہ" "حضورِ رسالت مآبؐ میں"۔ "شفاخانۂ حجاز" "صدیقؓ"۔ "بلالؓ"۔ (مکرر) اور "شبِ معراج" اس باب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ "بانگِ درا" یعنی مجموعہ کلام اردو کی سرگذشت ہے۔ اس کے بعد فارسی کا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں سب سے پہلے ہمارے سامنے "اسرار و رموز" نام کی دو مثنویاں آتی ہیں۔ ان میں حکیمانہ، مجدّدانہ اور مصلحانہ مضامین کے ضمن میں اقبال کے قلم سے عشقِ محمدیؐ کی چنگاریاں بھی جھڑتی جا رہی ہیں۔ ہم اس مختصر مضمون میں ان سب کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ دو ایک مقام نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجیے۔

اقبال کا آغازِ شباب ہے۔ ایک ضدّی فقیر ان کے دروازے پہ آجاتا ہے۔ وہ ڈنڈے سے اس کی تواضع کرتے ہیں، محترم باپ بیٹے کی اس حرکت سے آزردہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اور لب پر آہ پھڑک اٹھتی ہے۔ بیٹے کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں :۔

"کل قیامت میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور امّت کے غازی، حافظ، شہید زاہد، عاشق، عالم اور عاصی جمع ہوں گے اور اس انجمن میں اس دردمند فقیر کی صدائے فریاد بلند ہو گی

تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مظلومی اور اے اقبالؔ تیری سختی کا سبب مجھ سے ان لفظوں میں پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔"

"اللہ تعالیٰ نے ایک جوان مسلم (اقبالؔ) تیرے زیرِ تربیت دیا، جس نے میرے پیغمبرانہ آداب سے کچھ حصہ نہ لیا، تجھ سے یہ چھوٹا سا کام بھی نہ ہو سکا، یعنی یہ مٹی کا انبار (اقبالؔ) انسان نہ بن سکا۔"

والد بزرگوار ہی سے یہ کہہ رہے تھے اور اقبالؔ شرمسار ہو رہے تھے۔

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر
اجتماعِ امتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر
لرزۂ بیم و امید من نگر
بر پدر ایں جور نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰؐ
گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰؐ

از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خلقِ او باید گرفت
مرشدِ رومی چہ خوش فرمودہ است
آں کہ یم در قطرہ اش آسودہ است
"مگسل از ختم الرسلؐ ایامِ خویش
تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش"

اے فرزند! ذرا سوچ اور اس منظر کو چشمِ تصور میں لا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت ایک جگہ جمع ہے اور اس اجتماعِ عام میں تیری وجہ سے میری رسوائی ہو رہی ہے۔ اے بیٹا! میری سفید داڑھی پر نظر کر اور خوف و امید سے میرے لرزتے ہوئے بوڑھے جسم کو دیکھ۔ اے

نورِ نگاہ، بوڑھے باپ پر یہ ناروا ستم نہ کر۔ آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے غلام (پدرِ اقبال) کو ذلیل نہ کر۔ اے فرزندِ اسلام تو گلستانِ محمدؐ کا غنچہ ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بادِ بہاری سے پھول بن، اسی بہار سے رنگ و بو حاصل کر اور آنحضرتؐ کے اخلاقِ عالیہ سے سبق سیکھ۔ مرشدِ رومی رحمتہ اللہ علیہ نے کیا اچھا فرمایا۔ ع

"اپنی زندگی کو حضرتِ ختم الرسلؐ کے اسوۂ حسنہ سے محروم نہ رکھ۔ اپنی عقل و چالاکی پر بھروسہ نہ کر۔"

ان اشعار میں شاعر کا دل تڑپ رہا ہے اور دل کے اندر عشقِ محمدیؐ کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ اسی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو یہ دولت خاندانی ورثے کے طور پر محترم باپ سے حاصل ہوئی تھی۔

مثنوی "رموز" کے آخر میں "عرض حال مصنف بحضور رحمتہ اللعالمین" کے عنوان سے اپنے عشق جوان کی شور انگیزیوں کو قلندرانہ الفاظ کا لباس پہنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) تا مرا افتادہ بر رویت نظر
از اب و اُم گشتۂ محبوب تر

(۲) عشق در من آتشے افروخت است
فرحتش بادا کہ جانم سوخت است

(۱) — اے رحمتِ عالمؐ! جب سے آپؐ کے جمال مبارک پر میری نظر پڑی ہے۔ آپ مجھے ماں باپ سے بھی زیادہ پیارے محسوس ہو رہے ہیں۔

(۲) — عشق نے میرے اندر ایک آگ سی بھڑکا رکھی ہے۔ خدا اس عشق کا بھلا کرے جو میری جان کو جلا رہا ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

از پدر تا نام تو آموختم!
آتش این آرزو افروختم

جب سے میں نے اپنے باپ کی زبانی آپؐ کا نام مبارک سنا آپؐ کی محبت کی آگ میرے

اندر بھڑکتی ہی رہی۔

آرزوئے من جواں تر می شود
ایں کہن صہبا گراں تر می شود

میری یہ آرزو زیادہ سے زیادہ جوان ہوتی جا رہی ہے۔ یہ شرابِ کہن اور زیادہ قیمتی ہو رہی ہے۔

(۱) اے زیادِ غیر تو جانم تہی
بر لبش آرم اگر فرماں دہی

(۲) ہست شانِ رحمتت گیستی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

(۳) از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم، خوشا فردائے من

(۴) فرخا شہرے کہ تو بودی دراں
اے خنک خاکے کہ آسودی دراں

(۱) — میری جان صرف آپؐ کی یاد سے معمور ہے۔

۲ — اگر اجازت ہو تو دل کی تمنا کہہ دوں۔

۳ — میرا منتہائے آرزو یہ ہے کہ میرا خاتمہ سرزمینِ حجاز میں ہو۔ روزِ قیامت میرے اجزائے جسم آپؐ کے درِ مبارک سے اٹھیں۔

۴ — مبارک وہ شہر جہاں آپؐ نے بود و باش کی۔ خوش قسمت وہ زمین جو آپؐ کی آخری آرامگاہ بنی۔

اسی طویل نظم میں ایک اور بلیغ نکتہ بھی سکھا گئے ہیں حضور (صلعم) سے تخاطب کے دوران میں عرض کرتے ہیں :-

عرض کن پیش خدائے عز و جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل

اس ایک شعر سے دو عظیم سبق ملتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حضورؐ کا وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ ہی سے مراد حاصل کی جاتی ہے۔ مسلمان کی دعا کا قبلہ وہی ایک ذات ہے جس کے حضور سب اولیاء و انبیاء

سربسجود ہیں اور جس کے آستانِ کرم سے سب کو مرادیں ملتی ہیں۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ عشقِ نبویؐ کے عملِ نبویؐ کی پیروی بھی بے حد اہم ہے۔ عشق بے عمل صرف لاف ہے اور عمل بے عشق محض لاش۔

کہنے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے لیکن طوالت کے خوف سے درمیانی منزلوں کو چھوڑ کر ہم آخری منزل یعنی علامہ کی آخری تصنیف پر آتے ہیں جس کا نام ہی "ارمغان حجاز" رکھا گیا ہے ــــ اس میں ایک مستقل عنوان ہے "حضور رسالتؐ" اس میں ۱۱۹ رباعیاں ہیں۔ اقبال کے مذکورہ بالا اشعار اور ان رباعیوں کے مطالعے سے جامیؔ و اقبالؔ میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ جامیؔ کا قدم اپنی داخلی دنیا سے باہر نہیں نکلا۔ وہ پیغمبرؐ کے حضور تنہا جانے کے لیے بے تاب ہیں۔ انہیں محبوبؐ کے سوا کسی سے واسطہ نہیں ــــ لیکن اقبالؔ پوری امت کو اپنے دامن میں لیے ہوئے حضورؐ کے دروازے پر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کی دیوانگی میں ادب ملحوظ رہتا ہے، اور فریادوں میں پوری قوم کی ترجمانی پیشِ نظر رہتی ہے ــــ اس حصۂ کتاب کا آغاز "عزتِ بخاری" کے شعر ذیل سے ہوتا ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرشِ نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

آسمان کے نیچے ایک لائقِ ادب مقام عرش سے بھی زیادہ نازک ہے جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ ایسے عالی پایہ بزرگ بھی خاموش اور سر جھکائے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔

پہلی ہی رباعی میں عقل کی حدود کو پھاند جاتے ہیں۔

خِرد از راندن محمل فرو ماند
زمامِ خویش دادم درکف دل

اس سفر میں عقل نے رہنمائی سے عجز کا اعتراف کر لیا۔ میں نے اپنی مہار دل کے ہاتھ میں دے دی۔

اس تصنیف کے وقت شاعر کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ لیکن عشقِ یثرب جوان تھا۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

میں بڑھاپے میں مدینے کی راہ چل رہا ہوں، عاشقانہ سرور سے گاتا ہوا۔ اس پرندے کی طرح جو شام کے وقت فکرِ نشیمن میں پَر کھولتا ہے۔

گہے شعرِ عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم

کبھی عراقی کے شعر پڑھتا ہوں اور کبھی جامی میری جان میں آگ بھڑکا رہے ہیں۔

مسلماں آں فقیرِ کج کلاہے
رمیدہ از سینۂ او سوزِ آہے
دلش نالد چرا نالد؟ نداند
نگاہے یا رسولؐ اللہ نگاہے

"شاعر اپنے آپ کو بھول کر قوم میں ڈوب جاتا ہے۔ مسلمان، وہ فقیرِ کج کلاہ، جس کا سینہ سوز و درد سے خالی ہوگیا۔ اس کا دل رو رہا ہے ـــــ کیوں رو رہا ہے ـــــ اسے خود بھی معلوم نہیں ـــــ ایک نظر! اے اللہ کے رسولؐ ایک نظر!! شاعر کا سوز بڑھ رہا ہے۔

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتاب راگزر نیست
بما کن گوشۂ چشمے در شرق
مسلمانے زما بے چارہ تر نیست

کسی شاعر نے کہا ہے اور خوب کہا ہے:

ہر اک شے کا انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

یہی حال اُس وقت ہندی غلاموں کی رات کا تھا جو صبح کی روشنی سے محروم تھی ـــ گویا اس سرزمین پر سورج کا گزر ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلاشبہ مشرقی ممالک میں مسلمانوں کی چھوٹی بڑی تمام سلطنتیں زبوں حالی میں مبتلا تھیں۔ لیکن ہندی مسلمان کا حال سب سے زیادہ عبرت ناک تھا (اور اب بھی کیا ہے) اس عبرت ناکی کو بار بار پیش کرتے ہیں۔

نصیب اوست مرگِ نامتامے
مسلمانے کہ بے اللہ ھُو زیست

مسلمان جو خدا سے بیگانہ ہو کر جی رہا ہے۔ اس کی قسمت موت ہے اور موت بھی پوری نہیں جو خاتمہ کرے۔ اور پنڈ چھوٹے بلکہ مرگ و زیست کے درمیان عذاب میں لٹکتا ہی رہے۔

بروئے او در میخانہ بستند
دریں کشور مسلماں تشنہ میراست

اس ملک (ہند) میں مسلمان پیاسا مر رہا ہے۔ اس کے لیے میکدے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

خُدا آں اُمّتے را یار بادا
کہ مرگِ او زِ جانِ بے حضوراست

خدا اس اُمت کی یاری کرے جو جان بے حضور کی وجہ سے مر رہی ہے ـــ ساتھ ہی ساتھ امراضِ ملّی کی نشاندہی بھی کرتے جا رہے ہیں۔

مسلماناں بخویشاں درستیزند
بجز نقشِ دوئی بر دل نہ ریزند
بنالندار کسے خشتے بگیرد
ازاں مسجد کہ خود از وے گریزند

مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں۔ توحید کو چھوڑ کر دوئی میں مبتلا ہو چکے ہیں ـــ اگر کوئی شخص مسجد کی اینٹ اٹھالے تو فریاد کرتے ہیں ـــ حالانکہ خود مسجد سے بھاگتے ہیں۔

اِسی دوئی کی شرح اگلی رباعی میں کرتے ہیں۔

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم
چو گبراں در حضورِ او سرودیم
نہ نالم از کسے می نالم از خویش
کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

ہم نے غیر اللہ کے سامنے اپنا ماتھا رگڑا ہے دینوں کی طرح غیر اللہ کے بھجن گائے۔ رونا کسی کے ہاتھوں نہیں۔ اپنے آپ سے رونا ہے کہ (اے پیغمبر!) ہم تیری شان کے شایان نہیں تھے یعنی رسولؐ ایسا کہ سب رسولوں سے اعلیٰ اور امت ایسی کہ سب امتوں سے ....

"حضورِ حق" کے عنوان سے بھی امت کے لیے بہت فریادیں کی ہیں۔ لیکن اس بارگاہِ عظیم میں پہنچ کر دوسرے مطالب کے ساتھ ساتھ عشقِ نبویؐ بھی شاعر کے سینے سے اچھل پڑتا ہے ــــ فرماتے ہیں:

بے پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

جب یہ دنیا ختم ہو جائے اور عالمِ جزا ظاہر ہو جائے ــــ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مجھے رسوا نہ کیجیو۔ میرا حساب آپؐ کی نگاہوں سے پوشیدہ ہی رکھیو!

ــــ اسے کہتے ہیں۔

"با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار"

اقبالؔ — پیامبرِ اُمید

اگر اقبالؔ کو انگریز پہچان لیتا تو اس کی زندگی قید و بند میں گزرتی اور زندانِ فرنگ ہی کے کسی گوشے میں اس کو شہادت نصیب ہوتی۔

اور اگر اقبال کو مسلمان سمجھ سکتا تو روئے زمین پر ایک مسلمان بھی غلام نہ رہتا۔ بلکہ تمام اقوام عالمِ اسلام کے سائے میں آجاتیں۔

اقبالؔ نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ کیا تھی، ذرا ڈیڑھ پونے دو صدی پیچھے مڑ کر دیکھیے۔

۱۔ سلطان ٹیپو شہید کا بے پناہ عزم و شجاعت، صف آرائی وصف شکنی، فرنگی کے خلاف عمیق نفرت، استخلاص وطن کی عظیم الشان سرفروشانہ کوشش —— اس کا نتیجہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔

۲۔ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کا زہد و تقویٰ، ایمان و اخلاص، ملک گیر مجاہدانہ تحریک اور آخر بالاکوٹ کی خاک میں اس کا انجام کون نہیں جانتا۔

ان دونوں اسلامی کوششوں کو ان لوگوں نے ختم کیا جو مسلمان کہلاتے تھے لیکن تھے کیا، ننگِ ملت، ننگِ دین، ننگِ وطن۔

۳۔ ان کے بعد ۵۷ء کی عوامی جنگِ آزادی کا زمانہ آتا ہے۔ اس کا جو حشر ہوا اس کو بھی ہمارے ملک کی فضائیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں۔

۴۔ آخر ۱۸۷۹ء میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ثمرۃ التربیت کے نام سے ایک خفیہ جماعت بنائی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندی مسلمان کو انگریزی حکومت کا باغی بنائے اور اسلامی ممالک کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دے —— یہ جماعت بڑھتے بڑھتے جمعیۃ الانصار کے نام سے میدان میں آئی۔ اس میں تمام حساس علماء شامل ہو گئے۔ لیکن کامیابی اسے بھی نہ ہو سکی۔ مسلمان سے حکومت چھینی گئی تھی۔ مسلمان کے سینے میں آگ تھی، فاتح کی کوشش تھی کہ اس آگ کو ٹھنڈا کر دے۔ اس مقصد

کے لیے جو عجیب و غریب کوششیں کی گئیں، فاتحین عالم کی پوری تاریخ اس نوع کی پیچیدہ کوششوں سے خالی ہے۔ مسلمان اگر مسلمان ہو تو ساری دنیا کے لیے رحمت ہے۔ لیکن اجنبی فاتح نے اس کی بے حد خوف ناک اور بھیانک تصویر کھینچی۔ دنیا کی ساری قوموں کو شدید باہمی اختلافات کے باوجود مسلمان کے خلاف متحد اور صف آراء کر دیا اور ہندوستانی مسلمان کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے جس گوشے میں بھی کوئی مسلم حکومت تھی اس کو غلام یا نیم غلام بنایا گیا ـــــ اندرونِ ہند ہمسایہ قوم کے مقابلے میں مسلمان کو زندگی کے ہر شعبے میں پست و زبوں بنائے رکھنے کی مسلسل کوششیں کی گئیں۔ مسلمان کی حرارت، حیات محبت اسلام کی چنگاری پہ منحصر تھی۔ اس چنگاری کا مشاہدہ انگریز سلطان ٹیپو اور سید احمد شہید کی رزم آرائیوں میں کر چکا تھا۔ میکالے کی تجویزوں نے تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو لادینی اور انگریز کی نقالی کا نشہ چڑھایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نئی نبوت کی بنیاد رکھی جو انگریزی مقاصد کی حمایت پر مبنی تھی۔ انگریز نے چاہا کہ مسلمان آپس کی فرقہ بندی اور جنگ آرائی میں الجھے رہیں۔ قادیانی نبوت نے یہ خدمت انجام دی۔ انگریز نے چاہا کہ مسلمانوں کی روحِ جہاد کچل دی جائے۔ قادیانی نبوت نے بھی اس کو بسر و چشم قبول کیا ـــــ انگریز نے چاہا کہ ہندو مسلمان میں بحث و مباحثہ کی گرم بازاری ہو۔ قادیانی نبوت نے اس کے لیے بھی کافی مواد بہم پہنچایا۔ انگریز نے فرمایا انگریز کی اطاعت دینِ اسلام کا جزو قرار دی جائے۔ اس نبوت نے اس مضمون پہ پچاس الماریاں تیار کر کے رکھ دیں ـ یہ غلامی پر رضامند بار و فضا اور ایسا مایوسیوں سے بھرا ہوا ماحول تھا جس میں اقبال نے آنکھ کھولی اس صحبت میں ایسے کئی لوگ موجود ہیں جن کی ولادت انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ ان کے کان تیمور کے آخری نشان بہادر شاہ ظفر علیہ الرحمۃ کی ان سوز ناک آوازوں کو بھولے نہیں ہوں گے جو ہماری گلیوں اور بازاروں میں گونجا کرتی تھیں۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے
جو رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے

اے وائے انقلاب زمانہ کے ہاتھ سے
دہلی ظفرؔ کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

ظفر کے بعد اقبالؔ کی نشو و نما تک ہماری قومی شاعری سراپا مرثیہ بن کر رہ گئی تھی۔ اس عمارت کی خشت اول غالبؔ کا وہ قطعہ سمجھیے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اس وقت ہم اختصار کے طور پر صرف حالیؔ اور اکبرؔ کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔ حالیؔ فرماتے ہیں :۔

خاور سے باختر تک جن کے نشان تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آگے آتی روانیاں ہیں

حالیؔ کا مسدّس اور اس کی آخری مناجات اس دور کے مسلمانوں کے ہر طبقے کی مکمل تصویر ہے۔ مسدّس کی روح اس رباعی میں ہے جو ہر مسدس لکھی گئی ہے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

آخری بندوں میں ہمیں یہ شعر ملتے ہیں :

مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کہ گرا ہے
ستون مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

حالی کے ساتھ ساتھ اکبر کا دور شروع ہوتا ہے۔ امید کی جھلک اس کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ اس نے کھلے لفظوں میں کہا:۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی بہبودی سے ہے یاس

زندہ دل اکبر اس "یاس" کی تفصیل آہیں بھر بھر کر کرتا ہے۔

صدائے فاختہ ویرانۂ دہلی میں سُن آ کر
جگر ہوتا ہے ٹکڑے دیکھ! کو گو اس کو کہتے ہیں

جب سے اسے مسلمانوں کا عہد عروج اور اخلاقی و دینی تفوق یاد آتا ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے

نہ وہ جام رہے نہ وہ مست رہے نہ فدائی عہد الست رہے
وہ طریقہ کار جہاں نہ رہا وہ مشاغل رونق دیں نہ رہے

دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ہمت ختم ہو رہی ہے۔ ڈھارس دیتا ہے لیکن ایسی جیسے کوئی ریت کا محل تعمیر کرتا ہو۔

کیوں پست ہوئی ہے ہمتِ دل کیوں رو رہی ہے مایوسی
کوشش تو ہم اپنی سی کریں ہو گا تو وہی جو ہونا ہے

یہ مصرع جہاں سے میں نے نقل کیا ہے ایسا ہی خارج از بحر تھا۔ صحیح معلوم نہیں ہو سکا۔

پھر وہی نسرع کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

بنائے ملت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں

اکبر نے بنائے ملت کا بگڑنا تو بتایا لیکن بگاڑنے والے کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ حالی نے بھی اس کا الزام دور زماں کے سر منڈھا۔

مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

لیکن یہ کام اقبال کے لیے مقدر تھا ؎

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

پہلے مصر نے فرنگی کی نقالی کو موجب فخر سمجھا۔ پھر ہندی مسلم نے اس طرح ذہنی اور سیاسی طور پر دونوں نے غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ـــــ اکبر کے دو ایک آنسو اور ٹپکتے ہوئے دیکھیے۔

خزاں میں بلبل و گل کا نشاں تک نہ رہا
ہوا بدل گئی دو روز میں گلستان کی

گردوں کے ستم دیکھے اجڑا ہو گھر دیکھا
دیکھا تو نہ جاتا تھا، ناچار مگر دیکھا

خود اقبال کے عہد میں بھی کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ مایوسی کی ان تاریک فضاؤں میں روشنیٔ امید کی کرن دکھاتا! تاجور نجیب آبادی نے کہا۔ ؎

اہلِ اسلام کا آخری وقت ہے، دردِ اسلام اب لادوا ہو گیا

اسی نظم کا ایک شعر سُن لیجیے۔

دردِ اسلام پامال اغیار ہے ارض پاک حرم وقف ادبار ہے
دن دیہاڑے لٹی شوکتِ اسلام کی یہ خدا کی خدائی میں کیا ہو گیا

صفی لکھنوی نے کہا:

ہماری قوم تیرا بھی ستارہ کیا ستارہ ہے
سعادت گھٹتی جاتی ہے نحوست بڑھتی جاتی ہے

یہ نقشہ تھا ہمارے ذہن و دماغ کا اور یہ حالت تھی ہمارے ملک و ملت کی جب اقبال نے شاعری کے ریگستان میں قدم رکھا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے آپ کو اس عالم گیر مایوسی کے اثر سے بچا نہ سکا۔ اس کے ۱۹۰۵ء سے پہلے کے کلام میں ہمیں یہ شعر ملتے ہیں:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

اس نے دیکھا کہ ملک کے باشندے لایعنی مسائل پر آپس میں گرم پیکار ہیں اور اس فرصت کو غنیمت جان کر انگریز ہوش مندانہ قزاقی کے جوہر دکھا رہا ہے۔ اس نے کھلے ہوئے استعارے کے رنگ میں ملک کو متنبہ کیا۔

نشانِ برگ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گل چیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

اس کے بعد پھر اہلِ وطن کو خطاب کرتا ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس دور کے بعد یکایک اس کی شاعری میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ اس کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ اب وہ مرثیہ گو نہیں، امید کا پیامبر بن کر نمودار ہوتا ہے اور اپنے آپ کو دوسرے سخن وروں سے الگ کر لیتا ہے۔

اَوروں کا ہے پیام اَور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی کا پردہ اس کے سامنے سے ہٹا دیا گیا ہے اور وہ کسی بلند مینار پہ کھڑا ہو کر پکار رہا ہے۔ ع

دکھا دوں کا جہاں کو جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے

مارچ ۱۹۰۷ء میں آج سے ۴۳ برس پہلے سروش غیب نے اس کی زبان سے کہلوایا۔

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

یہ وہ زمانہ ہے جب سارا عالمِ اسلام ایک بحرانی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اس وقت ایک نوجوان نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی فرنگی تہذیب کی گود میں بیٹھ کر یہ مژدہ سنا رہا ہے۔ جسدِ ملّت میں آثارِ حیات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ تجارت، تعلیم، سیاست، اخلاق وغیرہ جس پہلو سے دیکھو مسلمانوں کی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آتی ـــ ایسے وقت میں، ایسا دعویٰ۔ تصرفِ الٰہی کی کرشمہ سازیاں نہیں تو کیا ہے۔

منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے

لیکن وہ پیش گوئی کر کے خاموش نہیں ہو جاتا۔ قوم کو اس پیش گوئی کی تکمیل کے لیے بڑے زور سے تیار کرتا ہے

اس راہ میں مقام بے محل ہے　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں　　جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

اب تک ہم درسِ قناعت پڑھتے آئے تھے، اپنے استادوں کی زبان سے بار بار یہی سنا تھا۔

اے قناعت تو نگرم گرداں　　کہ ورائے تو ہیچ حکمت نیست

لیکن اس فرنگی کے شاگرد نے ہمیں نئی بات سنائی ؎

نہ ہو قناعت شعار گل چیں، اسی سے قائم ہے شان تیری

اب ہمیں اپنی مغلوبانہ قناعت افیون معلوم ہونے لگی ـــ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا، مذہبی فرقہ بندی، قبائلی فرقہ بندی، جغرافی حدود کی فرقہ بندی ـــ پھر ان فرقہ بندیوں کے اندر بے شمار قسم کی فرقہ بندیاں، قوم کی وحدت پارہ پارہ ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچی کہ ہر فرد اپنی ہی ذات کو اپنی مساعی کا محور سمجھنے لگا۔ اقبال نے پوری شدت سے اس کی مخالفت کی اور صاف کہہ دیا ؎

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی

اور ـــ موج ہے دریا میں اور بیروں دریا کچھ نہیں

سمندر پار کی وہ رزم گاہ سیاست جہاں مدبرین فرنگ جمع ہو کر گلشنِ اسلام کو ابدی خزاں کی نذر کر دینے کی کامیاب تجویزیں سوچ رہے ہیں، اقبال وہیں سے اپنے رفیقِ چمن کو پیغام دے رہا ہے۔

اس چمن کو سبق آئینِ نو کا دے کر
قطرہ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

شاعر اعتراف کر رہا ہے کہ گلزار عالم میں مسلمان کی ہستی شبنم بے مایہ کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں لیکن ہم اس قطرے کو دریا بنا کے رہیں گے۔

وہ دیکھ رہا ہے کہ قوم پر سکوتِ مرگ طاری ہے لیکن اس کی عقابی نگاہ اس سکوت کو چیرتی ہوئی اس کے اندر کے طوفان کو دیکھ لیتی ہے وہ چلا اٹھتا ہے۔

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کے آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینہ خاموش میں

کیا اقبال کے سوا کسی اور کو بھی یہ برق نادر خشاں دکھائی دی۔ کسی نے آغوش ابر میں ان چھپے ہوئے موتیوں کو دیکھا؟ یہ ابر جس کی تاثیر یہ ہے کہ

وادیٔ گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ سوئی ہوئی امید جسے مردہ سمجھ لیا گیا ہے پھر بھی کبھی جاگ اٹھے گی؟ آپ نے حالی کی زبان سے سُنا:

مدت سے اسے دو رزماں میٹ رہا ہے

بات سچ تھی ـــــ اقبال نے بھی اعتراف کیا کہ

"بنائے ملت مٹا رہے ہیں"

لیکن اقبال نے اس کے ساتھ ہی یہ زندگی بخش مژدہ بھی سنایا:

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
اور ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اس نے قوم کے ماضی و مستقبل کا موازنہ ایک شعر میں کر کے دکھا دیا۔

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

وہ خوب سمجھتا ہے کہ خالی امیدوں کا شربت خواب آور بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی جگانے کے دوسرے طریقوں اور تنبیہوں سے بھی کام لیتا ہے۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

اس ہیجان انگیز اور طوفان خیز ماضی پر وہ مستقبل کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس دوران میں بھی اس کی نباض انگلی حال کی نبض سے غافل نہیں رہتی ہے۔

پھول بے پرواہ ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یہ آہیں سنہ ۱۲ء میں اس کے سینے سے نکلیں جو اس وقت کی سچی تصویر پیش کر رہی ہیں۔ اس نے انہی دنوں ہلالِ عید کو مخاطب کیا۔

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ ان کی گرفتاری بھی دیکھ

لیکن وہ صرف آہوں کا شاعر نہیں، جس طرح ایک نسخے میں مناسب مقدار سے مختلف دوائیں شامل کی جاتی ہیں اسی طرح وہ قوم کو ابھارنے کے لیے رنگا رنگ طریقے اختیار کرتا ہے۔ اسی نظم شمع و شاعر میں جلدی ہی پہلو بدل کر پیغام سروش سنانا شروع کر دیتا ہے۔

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

اور — لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

خود فراموش مسلمان کے نام سروش کا پیغام یہ ہے:۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

مسلمان کا سینہ خدا کے آخری پیغام کا امین ہے۔ مسلمان پہ فرض کیا گیا کہ وہ اس پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائے۔ وہ اس پیغام کی بے پناہ قوت کا انکشاف کرتا ہے۔

ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

کیا ہماری تاریخ گواہ نہیں کہ ہمارے ایک ایک ہجویری، چشتی اور سرہندی نے قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھے بغیر ملکوں کو فتح کیا اور دلوں پر حکمرانی کی، وہ اعجازی قوت آج بھی مسلمان کے پاس "نحن لہٗ لحافظون" کی صورت میں موجود ہے۔ ضرورت ہے اس کو کریدنے اور اپنانے کی۔ اب ہمارا شاعر اور آگے بڑھتا ہے اور فرقہ آرائی کے خاتمہ کی خبر دیتا ہے۔ ؏

"آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک"

پاکستان کو برپا ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ نادان افغانستان کو چھوڑ کے باقی تمام اسلامی حکومتیں تسبیح کے دانوں کی طرح ایک رشتے میں پروئے جانے کے لیے بے تاب ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے اکابر مصر، ایران، عراق اور عرب، شام، انڈونیشیا کے مصافحے کے لیے بڑھ رہے ہیں اور ان ممالک کا حکمران طبقہ یکے بعد دیگرے پاکستان کو اپنے قدوم سے نواز رہا ہے۔ حجابات اٹھ رہے ہیں ـــــ سید جمال الدین افغانی کے خواب کی تفسیر اقبال نے کی اور اب اس کی تفسیر کی تعبیر کے منکشف ہونے کے دن قریب آ رہے ہیں ـــــ ہم جو کچھ آج دیکھ رہے ہیں، اقبال نے بہت پہلے دیکھا اور خبر دی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

جس ناامیدی کے مرثیے اوروں نے پڑھے اور شکست خوردہ ماحول نے ایک وقت تک اقبال کو بھی اس سے متاثر کیا۔ اب وہ اس کے خلاف مسلح ہو کر کھڑا ہے۔

آشکارا ہیں میری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

یہ فتح کامل کی خبر ۱۹۱۲ء میں آج سے اڑتیس سال پہلے دی گئی ہے، وہ اپنے لشکر کو خطاب کرتا ہے۔

کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اپنی شاعری کے ہر دور میں وہ لذیذ غذا اور مفید دوا کے ساتھ ساتھ مضرات سے پرہیز کا اعلان بھی کرتا جاتا ہے۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

یہ مضمون روحِ اسلام ہے، یہی اصل انسانیت ہے۔ اقبال کا یہ درس ہر مسلم بچے کے کان میں پیدا ہوتے ہی پہنچا دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اللہ اکبر اور اشہد ان لا الا اللہ کی اذان، اقبال نے یہ نکتہ حیات پیغمبرؐ اسلام کی سیرتِ پاک، جبریل کے پیام اور لوحِ محفوظ کی سرنوشت سے اخذ کیا ہے جو لوگ اقبال کا یوم مناتے ہیں ان کی توجہ اقبال کے اس موضوع پر ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہئیے انہیں اپنے ارکانِ مجالس سے اس بات پر بیعت کی طرح کا عہد لینا چاہئیے کہ وہ فرقہ بندی اور انفرادیت پسندی سے مکمل پرہیز کریں گے اور قوم کے ہر فرد کو اس کی ترغیب دیتے رہیں گے۔ آؤ اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔

خضر راہ ۱۹۲۲ء میں اقبال نے مسلمان کو بشارت دے کر پھر اس نکتے کو دوہرایا ہے۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اب اس کا زورِ بیان بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا سینہ چیر کر مسلمان کے سامنے رکھ رہا ہے۔

جو کرے گا امتیاز رنگ و بو مٹ جائے گا
تُرک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

اس نظم میں آگے بڑھ کر امید و بشارت کی زبان کھولتا ہے۔

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلمان آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں میرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اس کے بعد "طلوعِ اسلام" کا دور آتا ہے۔ نظم کا عنوان ہی امید بشارت اور پیش گوئی کا حامل ہے۔ اس کے چند شعر سُنیے :

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

شعر میں مومن کی شرط نہ بھولیے۔ مومن بنیے اور ساری نعمتیں حاصل کیجیے۔

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

یہ "شیرازہ بندی" پھر وہی پیغام دے رہی ہے کہ ہم جو ورق ورق ہو رہے ہیں پھر جُڑ جانے کے

لیے تیار ہو جائیں۔ اس کے بعد کون سا سبق سامنے آئے گا۔ وہی پرانا بھولا ہوا پونے ۱۴ سو سال پہلے کا سبق۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مغرب کی حیرت انگیز ترقیات نے اور زیادہ ثابت کر دیا کہ انسانی دماغ امامت عالم کا اہل نہیں ہو سکتا ـــــ یہ مرتبہ اسی قوم کو ملے گا جس کے ہاتھ میں، سینے میں گفتار اور کردار کے ہر گوشے میں قرآن پاک کی تجلیاں دکھائی دیں۔ مسلمان یقین کی راہ پر چل کر اس مقصود کو حاصل کرے گا۔

یقین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو غارت گر تعمیر ملت ہے

یہاں تک بانگِ درا کا اقبال تھا۔ اس کے بعد بزمِ اردو کچھ کچھ عرصے کے لیے اس کی نواؤں سے محروم ہو جاتی ہے۔ فارسی میں اس نے جو کچھ کہا اس کا مقصود بھی یہی امید افروزی اور احیائے ملت تھا۔ اس مختصر صحبت میں اس کی طرف اشارہ کرنے کی فرصت نہیں۔ ۱۹۳۵ء میں پھر بالِ جبریل کے ذریعے اس کی آواز اردو میں سنائی دیتی ہے۔

کیا عجب مری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے

نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

اس کی دعاؤں میں بھی یہی جذبہ تیز تر ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

عزم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلمان کو تلوار کر دے

اب وہ اور زیادہ پختگی اور وثوق سے پکارتا ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اب وہ "ذرا نم" کا فریضہ خود ہی ادا کرتا ہے اور کس شان سے ادا کرتا ہے۔

الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلّاقی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیبی طاقت اس کے منہ سے اس حقیقت کا باربار اعلان کر رہی ہے۔

تو ہے فاتح عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

حقیقت یہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینۂ گفتار زنگ

اگر یک سرموئے برتر پرم　　فروغ تجلی بسوزد پرم

نظم کے علاوہ آج سے ۴۰ سال پہلے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے اس نے پوری سنجیدگی اور کامل ذمہ داری سے اعلان کیا۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقے کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے، اس وقت ہمارے بڑے بڑے رہنما زندہ تھے لیکن کسی کی بصیرت پہ یہ راز منکشف نہ ہوا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اس کی طرف مناسب توجہ بھی نہیں کی گئی۔

آخر میں میں اپنے پہلے الفاظ دہراتا ہوں ـــــ "اگر اقبال کو مسلمان سمجھ سکتا تو روئے زمین پر ایک بھی مسلمان غلام نہ رہتا۔ بلکہ تمام اقوامِ عالم اسلام کے سائے میں آجاتیں۔" اقبال کو سمجھنے کے لیے قرآن پاک میں ڈوبنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم قرآن سے منہ موڑ کر صرف اقبال کو قبلہ بناتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہمارے عوام نے دین کو کھلونا بنا رکھا ہے اسی طرح پڑھے لکھے لوگ اقبال کو طاؤس و رباب بنائے رکھنے پہ تُل چکے ہیں۔ اقبال منزل نہیں ہے۔ چراغ راہ ہوں منزل نہیں ہوں۔ وہ منزل کی طرف ایک زبردست اقدام ہے۔ میں ذہین اور حساس نوجوانوں سے امید رکھتا ہوں کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں گے اور اقبال کی رہنمائی میں اپنی منزل تک پہنچ کر دم لیں گے۔

یہ مقالہ مجلس "فکر و نظر" اوکاڑہ کے جشن یومِ اقبال میں پڑھا گیا اور بہت پسند کیا گیا۔

اقبالؒ اور ارتقاء

نزولِ قرآن سے قبل عرب میں شاعری کا یہ عالم تھا کہ شعر و سخن کا چرچا تھا ۔ مرد ۔ عورت ۔ بوڑھے جوان سب اس سیل میں بہہ رہے تھے ۔ کوئی گوشہ آبادی اور کوئی قبیلہ بلند پایہ شاعروں سے خالی نہ تھا وہ اپنے آپ کو فخریہ "عرب" اور غیر عربوں کو حقارت سے اَعْجَمُ عَجْمَاءُ وغیرہ الفاظ سے یاد کرتے تھے ۔ عَرَبَ یَعْرَبُ عروبَۃٌ کے معنی ہیں فصیح عربی بولنا ۔ عَرَبَ کے معنی ہیں اپنا مطلب صاف صاف بیان کرنا ۔ وضاحت سے بیان کرنا ۔ عُرَبَانٌ پاکیزہ اور شُستہ زبان والے کو کہتے ہیں ۔ اور اَعْجَمُ الْکَلَامُ کا مطلب ہے صاف صاف نہ بولنا یا غلط بولنا ۔ اَعْجَمُ نہ بول سکنے والے گونگے کو کہتے ہیں ۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس فن کا کیا مرتبہ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں کئی جگہ اس پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے ۔ یہاں تک کہ ایک طویل سورہ کا نام ہی "الشعراء" ہے جس میں خاص طور پر شعراء کا ذکر ہے ۔ اس میں ہم کو شاعروں کی دو قسمیں ملتی ہیں ۔ ایک وہ جن کو قرآن ختم کر دینا چاہتا ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شاعری میں کوئی زندگی و حرارت نہیں ۔ بلکہ اس کے برعکس جامد حیوانیت و بہیمیت کی تبلیغ کی گئی ہے ۔ جب کبھی انسان انسانیت کے صحیح مقام پر پہنچے گا تو اس قسم کی شاعری کو جو آج مایہ ناز سمجھی جاتی ہے دیکھ کر حیران ہوگا ۔ یہ بڑے بڑے دیوان ، غزلیات اور قصائد وغیرہ کے دفتر لغویات کے پلندے قرار پائیں گے ۔

دوسری قسم ان شاعروں کی ہے جن کے کلام میں ابدی اقدار کی روح موجود ہے ۔ جو انسان کو اس کی بلند استعداد کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ تاریخ میں ان کی تعداد کم سے بھی کم تر ہے اور مہلک و مخرب شاعری ہر زبان میں اتنی ہے کہ اس کا حصار نہیں کیا جا سکتا ۔ قرآن پاک نے چند لفظوں میں اس کارواں ضلالت پر تبصرہ فرما دیا ۔ "ھَلْ اُنَبِّئُکُمْ علی من تنزل الشیاطین ۔ کیا میں تم کو ان لوگوں کے متعلق اطلاع دوں جن پر شیطان نازل ہوتے ہیں ۔؟ ہر دروغ باف ، آلودہ گناہ شخص پر نازل ہوتے ہیں ۔ سنی سنائی بات القا کرتے ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ شاعر ہر وادی میں سر مارتے پھرتے

ہیں اور ان کے قول و فعل میں کوئی مطابقت نہیں، ہاں وہ شاعران سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان اور اعمال صالحہ سے بہرہ مند ہیں اور ذکر الٰہی کی لذت سے سرشار ہیں۔ کوئی ان پر ظلم و زیادتی کرے تو انتقام لینے کی ہمت رکھتے ہیں۔"

ان آیات میں کاہنوں اور عام شاعروں پر دروغ گوئی اور گنہگاری کا ایک ہی حکم لگایا ہے۔ آخر میں مومن شاعروں کو مستثنیٰ فرمایا ہے۔ انہی مستثنیات میں علامہ اقبال اور ان کی شاعری ہے۔ ابتدائی مشق کے زمانے کو چھوڑ کر ان کے کلام کا سرچشمہ قرآن مجید ہی ہے۔ انہوں نے بار بار اپنے کلام میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں:۔

گر بحرفم غیر قرآں مضمر است　　در دلم آئینہ بے جوہر است
روز محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

مسئلہ ارتقاء جس کو عام طور پر یورپ کی نشاۃ جدید کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں جا بجا اس کے متعلق اشارات ملتے ہیں۔ بعض اسلامی حکماء کی نظریں ان آیات تک پہنچیں اور انہوں نے اپنی تصنیفات میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ پیر رومی نے اپنی مثنوی میں ایک ایک کر کے مدارج ارتقاء گنوا دیئے اقبال کے سامنے وہی آیات تھیں اور دورِ حاضر کی تحقیقات بھی، اس وجہ سے انہوں نے اس موضوع پر جس بسط و تفصیل سے کلام کیا۔ قدماء میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس مختصر صحبت میں نہ ہم قرآنی بیانات کا احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ اقبال کی تصریحات کو تمام و کمال پیش کر سکتے ہیں۔ تاہم محل و موقع کی مناسبت سے دو ایک آیات کی طرف اشارہ کر کے کلام اقبال کے بعض اجزاء کی طرف توجہ کریں گے۔

والقمر اذا اتسق ۝　　طبقا عن طبق

چاند کو جو ہلال سے بڑھ کر بدر کی حالت کو پہنچتا ہے۔ بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے کہ تم یقیناً ایک حال سے دوسرے حال کی طرف درجہ بدرجہ اوپر چڑھتے جاؤ گے۔ (سورۃ الانشقاق)

یہ آیت کسی شرح و تفسیر کے بغیر اپنے مفہوم کی مدلل وضاحت کر رہی ہے کہ انسان ہلال کی طرح ایک غیر مرئی سی حالت سے اٹھ کر لا انتہا ترقی کی منازل کی طرف صعود کرتا جائے گا۔ ایک مقام پر یہ بھی اشارہ کر دیا کہ اس ارتقاء کی کوئی آخری منزل نہیں۔ والیٰ ربك منتهاها۔ انسانی ارتقاء کا منتہا

(ازلی ابدی) پروردگار کی طرف ہے۔ صوفیہ نے سیر فی اللہ اور سیر فی اللہ کی دو اصطلاحیں تجویز کی ہیں۔ اس "سیر فی اللہ" کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ ایک اور آیت دیکھیے۔ یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون۔ وہ (اللہ) آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے۔ پھر ہر امر (پختہ ہو کر) اس کی طرف عروج کرتا ہے۔ ایک دن میں جس کی مقدار انسانی اعداد کے مطابق ہزار برس ہو سکتی ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ بعض "یوم" پچاس پچاس ہزار برس کے ہوتے ہیں۔ زمین کو دیکھیے سورج سے الگ ہونے کے بعد کتنی طویل مدت میں اس قابل ہو سکی کہ اس میں جاندار آبادی ہو سکے۔ ایسے ہی حضرت انسان کو منازل ارتقاء طے کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ اقبال نے ایک قطعے میں اس طول زمانی کو سمیٹ لیا ہے۔

زمین خاکِ درمے خانۂ ما
فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیث سوز و ساز ما و راز است
جہاں دیباچہ افسانہ ہا

ایک بات اور ذہن میں رکھیے کہ ایسے خشک فلسفیانہ مسائل کو کتنی رنگین شعریت کا لباس پہناتے ہیں۔ اس مفہوم کو ایک اور عجیب و غریب انداز سے پیش کرتے ہیں۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

قابل غور بات یہ ہے کہ قرآنی ارتقاء ماڈیسن کے ارتقاء سے مختلف ہے۔ ان کی نگاہ عالم محسوس سے آگے نہیں بڑھتی۔ قرآن کے نزدیک موت زندگی کو ختم نہیں کرتی بلکہ اس کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جو اس زندگی کے مقابلے میں زیادہ حقیقی ہے۔ ان الآخرۃ لھی الحیوان۔ یقیناً دوسری زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں :۔

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہاں دگر است

یعنی آنکھ کھول کر دیکھ کہ زندگی ایک دوسری دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ ایسے اشعار قرآنی بصیرت کے

بغیر شاعر کے ذہن سے نہیں ابھر سکتے۔

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرہ ناچیز دتعمیر بیابانے نگر

خاک سے آسمان اور ذرّہ ناچیز سے بیابان کی ترکیب استعمال کرکے کوزے کو دریا میں سمیٹ لیا ہے۔ پیامِ مشرق میں فرماتے ہیں:

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جوان است وجواں خواہد بود
شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم
صاحب ذوق دتمنا و نظر گردیدیم

کتنی زندہ و تابندہ اور جواں شاعری ہے جو ہر کہنگی کو تازگی اور جوانی بخشتی چلی جاتی ہے۔ دوسرے شعر کی شرح میں ایک شارح نے لکھا ہے کہ:۔

شعلے کی شکست اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے۔ بلکہ اس لیے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک اور حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ اس لیے حقائق اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیولیٰ کی شکست اس لیے ہوگی کہ اس کے بعد شعلے کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتش دان خاکی سے اُڑ کر فضائے نور کی وسعتوں میں جا پہنچے۔ جن کے لیے "لاشرقیہ ولا غربیہ" آیا ہے جو زمان و مکان کے موجودہ تصورات کے دائرے سے باہر ہیں۔ یعنی ادھر سکرات موت کی ہچکی آنکھ بند کردے۔ ادھر نورانی ملائکہ استقبال کے لیے آجائیں کہ حضور آئیے تشریف لائیے۔ دیدہ و دل فرش راہ۔ یہ نوانی وادیاں، یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہنچانے والی جنتیں آپ کے انتظار میں ہیں۔

الذین تتوفاھم الملائکہ طیبین یقولون سلامٌ علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں فرشتے نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں، یہ کہتے ہوئے

کہ تم پر سلامتی ہو۔ آؤ اس جنّت میں داخل ہو جاؤ۔ یہ ثمرہ ہے تمہارے اعمال کا جو تم نے گذشتہ زندگی میں انجام دیئے۔ اس آیت کریمہ کے ساتھ اس شعر کو مکرر سامنے لائیے۔

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم
صاحب ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم

آیت کا آخری لفظ "تعملون" یعنی وہ جنّت جو ملنے والی ہے۔ اعمال کے بغیر نہیں ملتی ہے۔ اس کی تیاری انسان خود کرتا ہے۔ بقول اقبال

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست

بغیر عمل کے بخشی ہوئی جنّت تم جس کی توقع لگائے بیٹھے ہو کوئی چیز نہیں۔ جنّت فی الحقیقت وہی ہے جو تمہارے عمل کے نتیجے کے طور پر تیار ہو رہی ہے۔ زندگی کے ارتقاء پذیر تسلسل کے متعلق ایک غزل کے دو شعر سُنیے۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

عروج آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

آدم کو ٹوٹا ہوا تارا کہہ کر ہبوطِ آدم کے قصّے کی طرف معنی خیز اشارہ کیا ہے کہ کس طرح آدم جنّت کی بلندیوں سے گرا اور پھر توبہ کے ذریعے ایک تارے کی سی حالت سے بدر کامل بننے کی طرف اقدام شروع کر دیا۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد
ایں مشت غبارے را انجم بسجود آمد

انسان کے لیے تغیر کائنات کا ذکر قرآن نے کئی جگہ کیا ہے۔ نزول قرآن کے بعد سے اب تک انسانی تگ و تاز کے جو نتائج سامنے آئے ہیں اور آئندہ کے متعلق جو توقعات پیدا ہو رہی ہیں اس کو "انجم بسجود آمد" کی حسین و جامع ترکیب سے بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اسلامی

ارتقاء مغربی ارتقاء سے مختلف ہے۔ اس کے متعلق علامہ وضاحت فرماتے ہیں۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا، یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس اجمال کو ایک مسلسل غزل میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

پھیلتی کائنات میں ہماری زمین کے علاوہ آبادیوں کا تصوّر بھی قرآن نے دیا ہے۔

وَمن ایاتہ خلق السماوات والارض وما بث فیہما من دابّۃ

اللہ کے نشانوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور آسمانوں کو تخلیق کیا اور پھر ان دونوں (بلندی سما اور پستی زمین) میں جو جان دار مخلوق پھیلا دی وہ بھی (اللہ کی نشانیوں میں سے ہے)

علامہ نے دوسرے شعر میں "سینکڑوں کارواں" کہہ کر فضائی آبادیوں کی حیاتِ ارتقائی کی طرف اشارہ کیا ہے جو آگے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔

زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہاں ست یا جہاں بود است

یعنی کہیں قیامت آچکی ہے اور کہیں زندگی و آبادی مصروف عمل ہے۔

لامحدود دار تقاء کا ذکر شعر ذیل میں نہایت عمدہ پیرائے میں فرمایا ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

بلکہ یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ حور و ملک کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند
کرشمہ بر دل شاں ریزد دلبرانہ گزر

یہ بھی قرآن ہی کا فیض ہے جس نے انسان کو مسجود ملائک بنایا ؎

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو

ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہیں شہ لولاک ہے تو

مطلب یہ ہے کہ یہ مقامات بلند حضرت خاتم النبیین کی کامل اطاعت ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس اطاعت کے بغیر انسان حیوانی سطح سے اوپر اٹھ نہیں سکتا۔ قرآن پاک میں جا بجا اس کی تصریح کی گئی ہے۔ ہماری دنیا کو ایک نہ ایک دن اسلام کے وسیع آغوش ہی میں پناہ ملے گی۔ لیکن یہ وہ رواجی اور مصنوعی اسلام نہیں ہوگا جو اس وقت ہمارے تنزل کا ذمہ دار ہو رہا ہے بلکہ وہ زندہ و تابندہ اسلام جس نے "انتم الاعلون" کی بشارت دی اور پھر جلدی ہی یہ بشارت واقعہ بن کر سامنے آگئی۔

پیغامِ اقبالؒ

اس تحریر میں حضرت علامہ کی تعلیمات کو بالکل عام فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (عرشی)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے اور وہ عالی شان پیغام صرف ایک لفظ میں سما گیا ہے۔ وہ لفظ کیا ہے۔ "خودی" علامہ نے ہزاروں طریقوں سے خودی کی تشریح کی اور اس کو دہرایا ہے۔ اس کا نہایت سہل اور عام فہم ترجمہ اگر ہم ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو مضبوطی کہہ سکتے ہیں۔ اب اس کی مختصر سی شرح سن لیجیے۔

(۱) کریکٹر کی مضبوطی۔

(۲) جسمانی مضبوطی

(۳) اسلامی اتحاد کی مضبوطی

(۴) دینی جذبے کی مضبوطی

(۵) ممالک اسلامیہ کی مضبوطی

علامہ مرحوم نے یہ پیغام قرآن مجید سے حاصل کیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے کئی جگہ اقرار کیا ہے کہ میں اپنی شاعری میں قرآنی تعلیم کو پیش کر رہا ہوں۔

گر بحرفم غیر قرآن مضمر است
در دلم آئینہ بے جوہر است

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

قرآنِ پاک نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے :-

" وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً "

مسلمانوں لازم ہے کہ کافر لوگ تمہارے اندر مضبوطی، سختی اور کوراپن محسوس کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو کسی وقت بھی نرم نوالہ اور زود ہضم حلوا بننے کی اجازت نہیں ہے جس کو دشمن آسانی سے نگل جائے۔ بلکہ اتنا سخت بننے کا حکم دیا گیا ہے کہ اگر دشمن دانت مارے تو اس کے دانت ٹوٹ جائیں۔ علامہ مرحوم نے ایک مثال سے یہ نکتہ سمجھایا ہے۔ اپنی فارسی کتاب "اسرار خودی" میں فرماتے ہیں کہ :۔

ایک پرندہ پیاس سے بے تاب ہو رہا تھا۔ پانی کی تلاش کرتے ہوتے ہوئے اس نے ایک باغ میں ایک ہیرے کی کنی دیکھی۔ پیاس کی شدت سے اس کی چمک دیکھ کر اس نے پانی کا قطرہ سمجھا۔ اس پر چونچ ماری تو اس کا حلق تر نہ ہو سکا۔ الٹا چونچ ہی کو چوٹ کھانی پڑی۔

ہیرے کی کنی نے کہا :۔ "اے لالچی! تو نے مجھ پر لالچ کی چونچ تیز کی۔ میں پانی کا قطرہ نہیں ہوں۔ میں دوسروں کے لیے زندہ نہیں ہوں۔ تو مجھے تکلیف دینے کا قصد رکھتا ہے تو پاگل ہے تو خود دار زندگی کی پختگی سے ناواقف ہے۔ میری آب یا چمک پرندوں کی چونچ توڑ دیتی ہے۔ بلکہ آدمی کی جان بھی لے لیتی ہے۔"

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہیرا ہر پتھر سے زیادہ سخت اور زہرِ قاتل ہوتا ہے۔

پیاسے پرندے نے جب ہیرے سے اپنا مطلب نہ پایا تو اس سے منہ پھیر لیا۔ تلاش کرتے کرتے اس کو پھولوں کی ٹہنی پر شبنم کا ایک قطرہ دکھائی دیا جو سورج کی چمک سے کانپ رہا تھا۔ بے تاب پرندہ ٹہنی کے نیچے پہنچا۔ قطرہ ٹپک کر اس کے منہ میں آ گرا۔

اسی حکایت کو بیان کرنے کے بعد علامہ سوال کرتے ہیں کہ اے شخص اگر تو اپنے دشمن سے بچنا چاہتا ہے تو میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تو قطرہ ہے یا ہیرا ؟

جب پیاس نے اس پرندے کو بہت ستایا تو اس نے دوسرے کی جان لے کر اپنی جان بچائی۔

قطرے میں ہیرے کی سی سختی اور مضبوطی نہیں تھی۔ اس لیے ہیرا تو بچ گیا اور قطرہ ختم ہو گیا۔

"اے شخص! اپنی حفاظت سے ایک دم غافل نہ ہو۔ ہیرے کی کنی بن، شبنم نہ بن ـــــ پہاڑ کی طرح مضبوط رہ کتنی ہی بارش آئے اپنی جگہ سے نہ ہل۔"

یہ علامہ کے فارسی شعروں کا سیدھا سادہ مختصر سا ترجمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ جو کسی سخت سے سخت دشمن کے مقابلے میں شکست نہ کھائے۔

اسی مقصد کو انہوں نے اردو شعروں میں بھی جا بجا بیان کیا ہے۔ ایک جگہ دعا مانگتے ہیں۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر !
حریمِ کبریا سے آشنا کر !
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

یعنی اے اللہ! مسلمانوں کے دل محبت اور وفاداری سے بھر دے۔ ان کا کردار پاکیزہ اخلاق اعلیٰ اور کریکٹر بلند ہو جائے۔ ان کو اپنی شان اور عظمت سے واقف کر دے۔ تو نے ہم کو جَو کی روٹی یعنی غریبانہ روزی تو بخشی ہے۔ حضرت شیرِ خدا علیؓ مرتضےٰ کی قوتِ بازو بھی عنایت فرما!

یاد رہے کہ جَو کی روٹی حضرت علی کرم وجہہ کی پسندیدہ غذا تھی۔

علامہ مرحوم مسلمانوں کو چڑیا اور بلبل کی طرح کم زور و نازک نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور نہ ہی وہ یہ پسند کرتے تھے کہ مسلمان الگ الگ کٹ کر اپنے اپنے وطن کے ہو رہیں۔ وہ فرماتے ہیں :-

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلّت ہے کارِ آشیاں بندی

شاہیں ایک زبردست شکاری پرندہ ہے جسے شہباز بھی کہتے ہیں۔ وہ کہیں گھونسلا بنا کر نہیں رہتا۔ اپنی ہمت اور بہادری سے پہاڑوں اور جنگلوں کو چیرتا ہوا نکل جاتا ہے۔ قدیم زمانے کے مسلمان ایسے ہی تھے جن کا نقشہ علامہ نے اسی طرح کھینچا ہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

اپنی مشہور نظم شکوہ میں فرماتے ہیں کہ اے خدائے اسلام :-

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی!
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

اسی نظم میں آگے چل کر کہتے ہیں :-

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ان شعروں کا مطلب صاف ہے کہ مسلمان کسی ایک جگہ آرام طلب ہو کر نہیں بیٹھتے تھے۔ قرآن اور تلوار ہاتھوں میں لیے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتے۔ ملکوں کو فتح کرتے۔ توحید کا سبق پڑھاتے اور کافروں کو مسلمان بناتے جاتے تھے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کسی کو جبراً مسلمان نہیں بناتے تھے۔ بلکہ ان کے اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ بہادری کو دیکھ کر شکست خوردہ قومیں خود بخود اسلام کی گود میں آجاتی تھیں۔

عام طور پر مشہور ہے کہ جدھر زمانہ چلے اُدھر ہی کو چلنا چاہیے۔ یہ عربی کے ایک قول کا ترجمہ ہے۔ دُرْ مَعَ الدَّھْرِ کَیْفَ مَادَارَ۔

علامہ کہتے ہیں یہ غلط ہے۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

یعنی یہ نادانوں کی بات ہے کہ زمانے کے غلام بنے رہو..... نہیں نہیں..... اگر زمانہ تمہارے ساتھ نہیں چلتا تو زمانے سے لڑو، اور اس کو اپنے پیچھے چلاؤ..... علامہ کی یہ نصیحت عین اسلام کے موافق ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کے عرب کا زمانہ ہر قسم کی برائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ قتل، لوٹ، شراب، جوا، بے حیائی اور بت پرستی عام تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

ان کے ساتھیوں نے یہ نہیں کیا کہ جدھر زمانہ جا رہا ہے ادھر ہی کو چل پڑیں۔ انہوں نے زمانے سے جنگ کی اور صرف تئیس سال کے اندر اندر زمانے کو اپنے پیچھے لگا لیا۔

علامہ اقبال ہم کو یہ باتیں کیوں سُنا رہے ہیں۔ ان سے وہ کیا سبق سکھا رہے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ وہ اس مبارک زمانے کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ویسا ہی بہادر شریف اور فتح مند دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا مسلمان انگریز کی غلامی اور ہندو کی ہمسائیگی میں رہ کر اپنے بزرگوں کی شان و عظمت کو بھلا چکا ہے۔ اس لیے انہوں نے کہا:۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شہبازی

اگر ایک شہباز کے بچے کو انڈے سے نکلتے ہی گِدھ کے بچوں کے ساتھ رکھا جائے۔ اس کی خوراک، پرورش اور رہن سہن بالکل گِدھوں کے طور پر ہو تو وہ بھول جائے گا کہ وہ شہباز کی اولاد ہے۔

اس کے اندر شہباز کی جرأت، جھپٹ اور بلند پروازی پیدا ہی نہیں ہو گی۔

سو، ڈیڑھ سو سال کی غلامی نے مسلمانوں کو ایسا ہی بنا دیا، وہ بھول گیا کہ غلام اور غیروں کا محکوم بن کر رہنا مسلمان کے لیے ایسا ہی ہے جیسا شہباز کے لیے گِدھ بن جانا ـــــ لیکن اس کے باوجود شہباز کی اصلیت تو نہیں بدلتی۔ جب بھی اس کو یاد دلایا جائے کہ "تو گِدھ نہیں ہے اپنی شکل و صورت اور وضع قطع دیکھ اور ان حقیر گِدھ بچوں کو دیکھ تجھے زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا ـــــ یہ تیری تقدیر نہیں ہے جس کو تو تقدیر سمجھ کر قناعت کر چکا ہے یہ تو گِدھوں کی تقدیر ہے۔ تیرا کام اس حالت سے نکل کر اپنے اصلی مرتبے کو حاصل کرنا ہے"

اس تنبیہہ سے اس کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ اپنی عظمت کو سمجھنے لگے گا..... علامہ فرماتے ہیں:

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

مسلمانوں نے فقر کے بوریئے اور دین کے مصلّے پر بیٹھ کر بڑے سے بڑے تخت و تاج کو پاؤں تلے روند ڈالا ـــــ ایران و توران کی شہنشاہیوں کو زیر و زبر کر دیا ـــــ اب وہ مسلمان

کہاں ہیں ؟

نہ ایراں میں رہے باقی نہ تووراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ

جب تک کسی قوم کی آنکھوں میں غلامی کا سرمہ اور ناک پر محکومی کی عینک چڑھی رہتی ہے وہ دنیا کی کسی چیز کو اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکتی۔ صحیح نظر انہی کی ہو سکتی ہے جن کی حکومت اپنی اور قانون اپنا ہو۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر، کی آنکھ ہے بینا

ایک دفعہ نادر شاہ امیرِ افغانستان نے تعلیمی مشوروں کے لیے ہندوستانی علماء کا ایک وفد طلب کیا۔ اس وفد میں علّامہ مرحوم بھی تھے۔ اس زمانے کا کابل آزاد اور ہندوستان غلام تھا۔ علّامہ مرحوم نے کابل پہنچ کر ایک غزل لکھی جس کے بعض شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسن عالم گیر ہے مردانِ غازی کا

اس شعر میں اصلی مسلمان کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ مسلمان بزدل قوموں کی طرح بناوٹی خوش اخلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کے لہو میں یہ بات داخل ہے کہ جو شخص اسے ملے اپنے دل میں تسکین و اطمینان کی ٹھنڈک محسوس کرے۔ مسلمان بہادر ہے، غازی ہے، مردِ میداں ہے۔ اس کا عالم گیر حسن و جمال اس کی مردانگی، فیاضی، شرافت اور اعلیٰ پائے کی انسانیت ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر افغان جوانوں کو دیکھ کر کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ انہیں ہندی غلام مسلمان یاد آجاتے ہیں جو انگریزی تعلیم پاکر اسلامی شجاعت اور دلیری سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں :۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچّوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

یہ مدرسوں کے استاد مسلمانوں کو جو شاہباز کے بچّے ہیں، کھیل کود میں برباد کر رہے ہیں۔ ان کی

زندگیاں تلف ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کی حالت ایسے شکار کی طرح ہو چکی تھی جو مدت سے شکاری کے پھندے میں پھنسا ہو اور نکلنے کی راہ نہ پاتا ہو۔ علامہ نے ان کو ان کی اصلیت سے آگاہ کیا۔ جہاد کی ضرورت اور فضیلت بتائی۔ آزادی حاصل کرنے کے طریقے سکھائے۔ اس خیال کو ایک شعر میں ادا کرتے ہیں :۔

بہت مُدّت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا

ان کی شاعری عشق و عاشقی اور شراب و کباب کی شاعری نہیں تھی۔ وہ نرمی و نزاکت سے متنفر اور سختی کے عاشق تھے۔

چنانچہ اسی غزل میں کہتے ہیں :۔

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

یعنی مجھے شراب۔ بوتل اور گلاس کی باتیں نہیں آتیں۔ پتھروں کے توڑنے والے شیشے بنانے کا فن نہیں جانتے۔ علامہ یقین رکھتے تھے کہ ساری دنیا کی حکومت مومن کی میراث ہے۔ لیکن مومن کیسا، صرف نمازی اور زاہد نہیں بلکہ وہ مومن جو اپنے ایمان کی خاطر جان کی بازی لگانا جانتا ہو۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

یہ مومن کی شان ہے کہ وہ حاکم ہو۔ محکوم نہ ہو..... مردِ میدان ہو گوشہ نشین نہ ہو۔

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی

مومن کو اپنی قدر پہچاننی لازم ہے۔

کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

مومن کے لیے دنیا کا غلام ہو کر رہنا خلافِ شان ہے۔

دنیائے دوں کی کب تک غلامی

یا راہبی کر یا پادشاہی

یا تو دنیا سے بالکل الگ ہو جائے۔ مگر اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ پھر اگر دنیا میں رہنا ہے تو بادشاہ بن کر رہے۔

علامہ نے جنوری ۱۹۳۵ء میں آج سے سترہ برس پہلے کہہ دیا تھا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ

ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

یعنی یہ کوئی معجزہ ہے یا زمانے کی گردش ہے کہ ایشیا میں فرنگی حکومت کا جادو ختم ہو رہا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں چین آزاد ہے۔ انڈونیشیا آزاد ہے۔ ہند و پاکستان آزاد ہیں۔ ٹیونس آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ عربوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ ایرانیوں نے انگریز کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے ایسی ہی کئی اور چھوٹی بڑی حکومتیں اپنے پیروں پر کھڑی ہو رہی ہیں۔ اسی غزل کے ایک شعر میں علامہ مرحوم مسلمان کو بہادرانہ اخلاق کی تعلیم عجیب انداز سے دیتے ہیں۔

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں

گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ

یعنی اے مسلمان تو کلمہ لا الہ الا اللہ کا وارث ہے۔ توحید کا علمبردار ہے۔ تیری گفتگو دلوں کو موہ لینے والی اور تیرے اعمال شاہانہ ہونے چاہئیں۔

انگریزوں نے مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو ختم کرنے کی بے حد کوشش کی اور بظاہر وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن علامہ اقبال کی تیز نگاہ دیکھ رہی تھی کہ جس طرح مٹی کے نیچے دب کر دانہ فنا نہیں ہوتا بلکہ پھلنے پھولنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے اندر ابھی وہ بیج موجود ہے جس کا پھل آزادی اور حکمرانی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یعنی اقبال اپنی اجڑی ہوئی کھیتی سے ناامید نہیں ہے۔ اس کو تھوڑا سا پانی مل جائے تو یہ مٹی سونا اگلنے لگے گی۔ پھر دوسری جگہ یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ

کم کوش تو ہیں، لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے دانش مند لیڈر مایوس نہ ہو ——— قوم کی کوشش میں کمی تو ضرور ہے لیکن اتنی نادانی بھی نہیں کہ اپنا بُرا بھلا نہ سمجھ سکے۔ چنانچہ خدا کے فضل سے ایسا ہی ہوا۔ قائدِ اعظمؒ نے ذرا اس مٹی کو پانی دیا تو نتیجہ جو نکلا وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اسی غزل کے آخر میں نہایت ہی مردانہ شعر کہا ہے۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

فرماتے ہیں جواں مردوں کا طور و طریقہ صاف صاف حق بات کہنا ہے۔ اللہ کے شیر لومڑی کی طرح عیاری، مکاری اور دوسروں کے مارے ہوئے شکار پر گزران نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علامہ مسلمانوں کو کبھی شیر اور کبھی شاہین کہہ کر پکارتے ہیں اور اس کا فرض یاد دلاتے ہیں اور موجودہ لومڑی پنے سے نکالنا چاہتے ہیں۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یہ مضمون پہلے بھی گزر چکا ہے کہ مسلمان کسی ایک گھیرے میں گھرے رہنے کے لیے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو صحابہؓ عرب سے باہر نکل کر مشرق و مغرب میں اسلام کا اعلان نہ کرتے —— ان کی فقیری میں امیری کا راز تھا جو علامہ نے بار بار یاد دلایا۔

آہ کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز

ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنتِ روم و شام

ان کے سامنے مسلمانوں کے عروج و ترقی کا وہ زمانہ ہے جب مسلمان صحیح دینی تعلیم حاصل کر کے دنیا میں پھیل جاتے تھے اور ہر جگہ دین و اخلاق کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان کے کردار کی تاثیر بڑے

بڑے بادشاہوں کو متاثر کر دیتی تھی۔ لیکن غلامی کے زمانے میں ان کے سب اوصاف تباہ و برباد ہو گئے ـــــــ علامہ کس درد اور سوز سے فرماتے ہیں۔

تھا جہاں مدرسہ شیری و شہنشاہی
آج اں خانقہوں میں ہے فقط روباہی

ہمارے قدیم درویشوں کی خانقاہوں سے نوجوان طالب علم شیر اور شہنشاہ بن کر نکلتے تھے ـــــــ ! لیکن آج وہاں دُکانداریاں ہیں اور بزرگوں کا نام فروخت کیا جاتا ہے۔

یہ اشعار سرسری طور پر جو سامنے آگئے پیش کیے گئے ہیں۔ ورنہ علامہ کی قومی شاعری ساری کی ساری اس آیت کی تفسیر ہے جو ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ

ولیجدوا فیکم غلظۃ

لازم ہے کہ کافر تمہارے اندر سختی اور مضبوطی محسوس کریں۔ علامہ کی زندگی میں اس تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے شہر بشہر گھوم کر مسلمانوں کو جگایا۔ اور وہ دولت دشمن سے لے کر چھوڑی جو چھینی جا چکی تھی۔ لیکن ابھی ہمارا کام مکمل نہیں ہوا۔ ہمارے ذمے اس نعمت کی حفاظت فرض ہے اور یہ حفاظت جبھی ہو سکتی ہے کہ ہم مضبوط ہوں، متحد ہوں، منظم ہوں، اپنے وطن اور اپنے دین کے سچے وفادار ہوں۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے اندر وہ صفتیں پیدا کریں جو علامہ نے جا بجا اپنے شعروں میں بیان کی ہیں۔ جو ہمارے بزرگوں میں موجود تھیں اور ورثے کے طور پر ہمارے اندر موجود ہونی چاہئیں پاکستان کی حفاظت و مضبوطی کے ساتھ ساتھ ہمیں ہندی مسلمانوں کے دکھ سکھ کا احساس بھی ہونا چاہیئے۔ حصولِ پاکستان کے لیے ان کی کوششیں ہم سے کم نہ تھیں۔ بلکہ وہ اس کے بدلے میں اب تک بے پناہ تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری مسلمان بھی ہمارے ہی جسم کا ایک حصہ ہیں۔ اس وقت دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہیں پاکستان کی طرف ہیں، اور پاکستان کیا ہے اینٹ، پتھر اور مٹی نہیں، پاکستان ہم ہیں، ہم مسلمان۔

ہم رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت، ہمارا دین ہم کو نیک اور بہادر بننے کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم جب تک نیک اور بہادر رہیں گے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہماری حکومت مضبوط ہوگی اور اس میں ترقی اور اضافہ ہوتا جائے گا۔ انشاء اللہ ـــــــ جیسا کہ قرآن نے

خوش خبری دی ہے۔

انتم الاعلون ان کنتم وبہ مومنین

اگرتم ایمان دار ہو تو فتح تمہاری ہی ہو گی انشاء اللہ العزیز،

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جُز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی لاکھوں ہیں جہانِ بے ثبات ——— (بانگِ درا)

ہم نے اقبال کی شعر بازی سُنی اور اسے شعر بازی ہی سمجھا۔ داد و تحسین میں بخل نہیں کیا۔

"محترم شاعر! آپ کے شعر اچھے ہیں۔ نہایت اچھے! ان میں جدت بھی اور روانی بھی، شاعرانہ استدلال بھی اور حکیمانہ انداز بھی ——— لیکن حقیقت ——— حقیقت یہ نہیں ——— حقیقت وہی ہے جو سارے جہان کے داناؤں نے بتائی کہ زندگی کچھ بھی نہیں محض نقش بر آب۔ اٹل صداقت موت ہی ہے۔"

ہماری بات نے شاعرِ حکیم کے اندر جوش کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے بڑھا اور ہمارے بازو کو تھامے ہوئے ہمیں گھسیٹتا ہوا ایک شاداب سڑک پر ہو لیا۔

"میں تمہیں ثبوت دوں گا اپنی بات کا۔ تمہیں ماننا پڑے گا کہ میں سچ کہتا ہوں اور تمہارے موت کی تبلیغ کرنے والے دانش مند غلطی پر ہیں صریح غلطی پر۔"

اب اس نے ہمیں اس آبِ حیات کے چشمے کے کنارے پر لا کھڑا کیا جس کا نام اسی کی زبان میں ہے۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

اس پاک چشمے کی لہروں سے زندگی بخش آوازیں اٹھ رہی تھیں۔

"تمہارا نصب العین، تمہارا مطمع نظر، تمہارا مقصود حقیقی ایک ہی ہے۔

" الحی الذی لا یموت"

جو یکسر زندگی ہی زندگی ہے۔ اس کے ہاں موت کا بالکل گذر نہیں۔ وہ تمہیں بھی اسی ابدی زندگی کی طرف بلاتا ہے۔

یا ایھا الذین آمنو استجیبو اللہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

اے اہلِ ایمان! اللہ اور رسولؐ کی آواز کو سنو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جس میں تمہارے لیے سراسر زندگی ہی زندگی ہے۔

خلق الموت والحیات۔ موت کو ایک عبوری دور کے طور پر پیدا کیا۔ اس کے بعد حیات ہی حیات ہے۔

وہ ابدی دارالحیات جسے جنت الفردوس کہتے ہیں، اس کے باشندوں کا حال یہ ہے کہ

لا یذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولیٰ

دنیا میں ایک بار جو موت آچکی سو آچکی اب اس عالم میں موت کی تلخی کبھی چکھنا نہیں پڑے گی۔ بہشتی تو رہے بہشتی، دوزخی بھی موت کی دست رس سے آگے نکل جاتے ہیں۔

لا یقضیٰ علیھم فیموتوا

ان کو قضا نہیں آتی کہ مرجائیں۔

ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت

"دوزخی کو ہر طرف سے موت کا سا عذاب آتا دکھائی دے گا مگر وہ مرنے کا نہیں"

یہ قرآن کی آوازیں تھیں جن سے روحوں کو زندگی مل رہی تھی۔ اقبالؔ کے چہرے پر ایک کامیاب بشاشت پیدا ہوئی۔ اس نے کہنا شروع کیا:

" زندگی دی جاتی ہے۔ پھر واپس نہیں لی جاتی۔ دینے والے کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند

انساں بمیرد از بے یقینی

جس کو جو نصیحت ملے اس کی حفاظت کا وہی ذمہ دار ہے۔ اگر تم زندگی کی حفاظت نہ کروگے تو یہ تمہاری کوتاہی اور آخر کار تباہی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ قیمتی شے زیادہ سے زیادہ حفاظت چاہتی ہے۔ جن قوموں نے اپنی زندگی کی حفاظت نہیں کی ان کا نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ـــــ زندگی کی حفاظت کے لیے زندگی ہی کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اس کا نام قرآن کی زبان میں "جہاد" ہے۔ قرآن کتاب زندگی ہے۔ اس میں ابدی زندگی کے اسباق ہیں۔ جہاد اس راہ کی اصل منزل ہے۔ اس سے گزرے بغیر تم زندگی کے دامن کو چھو نہیں سکتے۔

فلسفیوں اور دانش وروں کی وہ قوم جو جہاد کی حقیقت، جہاد کے مقصد اور غایت سے بے خبر ہے۔ ہیجڑوں اور نامردوں کی قوم ہے، وہ آج نہیں تو کل ختم ہو جائیں گے۔ ہر نیکی اور خیر کو جہاد کے کوچے سے ہو کر دنیا میں پھیلنا نصیب ہوا ہے۔ نرم بستر پر لیٹنے والوں اور کتاب کے کیڑوں نے کبھی کوئی صادقانہ تحریک اپنی یادگار میں نہیں چھوڑی۔ جو مرنا نہیں جانتے وہ مارنا نہیں جانتے، اور جو مارنا نہیں جانتے وہ کفر و شرک اور شرارت و خباثت کی جڑوں کو نہیں ہلا سکتے۔ نیکی کے درخت کی پرورش نہیں کر سکتے۔

علم بڑی دولت ہے، لازوال دولت لیکن اس کی بڑائی تلوار کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتی۔ تلوار کی چمک سے علم کی آنکھ کو روشنی ملتی ہے" ـــــ اقبال خاموش ہوئے۔ بحرِ قرآن سے ایک لہر اُٹھی۔ اس سے آواز نکلی :-

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معھم الکتاب والمیزان لیوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہٗ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی العزیز -

ہم نے پیغمبروں کو واضح احکام دے کر بھیجا اور ان کی معرفت کتابیں اتاریں اور ترازو تاکہ لوگ اپنے معاملات میں انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہا پیدا کیا۔ اس میں سخت جنگ کا سامان اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ معلوم کریں کہ کون اللہ کی اور اللہ کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ صاحبِ قوت اور صاحب غلبہ ہیں۔

یہ صحیفۂ فطرت یعنی عالمِ کائنات المیزان ہے۔ یعنی ترازو کے مطابق اٹل قوانین پر قائم ہے

کتاب اللہ اس کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اللہ کی صداقت پر قطعی شاہد ہے ـــــــ ان دونوں کا تقاضہ انصاف ہے۔ جو انصاف پر چل رہا ہے وہ روح کائنات سے ہم آہنگ ہے۔ وہی قرآن کا سچا ہیرو ہے۔ لیکن عجلت پسند اور ہوا پرست انسانوں کی اکثریت انصاف کی راہ پر نہ خود چلتی ہے نہ دوسروں کو چلنے دیتی ہے۔ ان کے لیے کتاب کا نرم وعظ کافی نہیں۔ ان کے لیے دوسرا نسخہ بھی مالک کتابؐ ہی نے تجویز فرمادیا ہے۔ وہ کیا ہے؟ لوہا، تیغ و سپر جہاد کی رزم آرائیاں۔ قتال کی معرکہ خیزیاں۔ اس لوہے میں اور بھی بے شمار فائدے ہیں۔ جو حیاتِ بشری کی بہترین اعانت کرتے ہیں۔ ہاں تو یہ رسولوں کا بھیجنا، کتابوں کا نازل کرنا، کائناتِ عالم کو بصورت میزان خلق کرنا اور سماوی تاثرات سے کانوں میں لوہے کے ذخیرے تیار کرنا بے مقصد نہیں۔ اتنے عظیم اہتمام کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ لوگ دفترِ خداوندی میں مندرج ہوجائیں جو قانون فطرت کے تحت اصلاحات نافذ کرتے ہیں (یہ ہے "ینصرہ" یعنی رسولوں کی مدد) اور پیغامِ الٰہی کی پیروی کرتے ہیں (و"رسلہ" یعنی رسولوں کی مدد) اور از روئے حقیقت اللہ تعالیٰ خود ہی ہر قسم کی قوت و غلبہ کے مالک ہیں۔ یہ سب کچھ انسانی فلاح و بہبودی کے لیے ہے۔

مکے کی تیرہ سالہ زندگی میں پیغمبرؐ نے نہایت نرم اور حکیمانہ وعظ کیا۔ بہت کم سعید الفطرت اس سے متاثر ہوئے۔

شاعرِ فردا

جینیس قسم کے لوگ عموماً اپنے حقیقی زمانے سے بہت پہلے پیدا ہوتے ہیں اور اپنا پیغام دے کر رخصت ہوجاتے ہیں۔ان کے عہدِ حیات کے لوگ انہیں بہت کم پہچانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مخالفت عام ہوتی ہے۔ عوام، حکام، علماء اور امراء سب ہی ان کے خلاف صف بستہ ہوجاتے ہیں۔ انہیں ہر طرح کی ایذا و صعوبت کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ پھر جب وہ اپنا کام کر کے دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں تو کچھ لوگ انہیں پہچاننے والے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن عوام ان کی پرستش تو کر سکتے ہیں پہچاننے کی سکت نہیں رکھتے۔ کتنے ہی بزرگ ہمارے سامنے ہیں جن کی قبروں کی پرستش ہو رہی ہے۔ان کو گزرے ہوئے صدیاں گزر گئیں لیکن ان کے پیغام کی اہمیت ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اسی لاہور میں حضرت شیخ ہجویری رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانے کے بہت بڑے علامہ گزرے ہیں آج ان کی جس قسم کی تعظیم ہو رہی ہے کیا ان کی بے مثل کتاب کشف المحجوب کی کسی ایک سطر سے بھی اس کی تائید نکل سکتی ہے؟ یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ یہی حال ہزاروں، لاکھوں بزرگوں کا ہے۔ زندگی میں ان کو سخت اذیتیں پہنچائی گئیں۔ مرنے کے بعد ان کے روضے بنے اور عرس برپا کئے گئے۔ لیکن جس راہ کی طرف انہوں نے عمر بھر دعوت دی اس پر بہت کم لوگ گامزن ہوئے۔ شاید انسان کی تقدیر یہی ہے کہ چھلکے کو چباتا رہے اور مغز تک نہ پہنچ پائے۔ رومی نے اپنے زمانے میں کہا تھا۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوش حالاں و بد حالاں شدم

ہر کہ از ظن خود شد یار من
از درون من نجست اسرار من

ایک اور مقام پر اور زیادہ کھلے لفظوں میں فرماتے ہیں۔

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو

دز شما یک تن نشد اسرار جو

بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے لوگوں کی عدم استعداد کی وجہ سے کہہ ہی نہیں سکے۔ جو اسرار و رموز انہوں نے مثنوی میں بیان کیے ہیں وہ ان کی اپنی بلند سطح سے بہت نیچے ہیں۔

آنچہ من گفتم بقدر فہم تست

مردم اندر حسرت فہم درست!

ہم نوا کی تلاش

یہی حال ان کے مرید ہندی علامہ اقبال کا ہے۔ وہ بھی اس بھری بزم میں اپنا ہم نوا تلاش کرتے کرتے دوسرے عالم کو سدھار گئے ـــــ جس "فردا" کے وہ پیغام بر تھے ان کی رحلت کو انیس سال گزر گئے۔ اس کی صبح کا طلوع ابھی نہیں ہوا۔ انیس سال تو کچھ بھی نہیں۔ کیا خبر ابھی کتنی مدت اور انتظار کرنا پڑے۔ پاکستان بن جانے سے بظاہر یہ توقع ہو سکتی تھی کہ ان کے خوشگوار خواب کا ایک حصہ تو پورا ہو گیا باقی حصوں کی تکمیل کی بھی امید بندھ گئی۔ لیکن دس سال گزرنے کے بعد بھی اب تک اس طرف ایک قدم نہیں اٹھا۔ آج بھی وہ لیکچر بازوں اور قوالوں کے ہاتھ میں ایک دلچسپ کھلونا یا زیادہ سے زیادہ مال تجارت ہیں ان کے سوا کچھ نہیں۔

انہوں نے اپنے غیر معمولی فہم و فراست اور علم و تبحر کی کاوشوں سے ہمارے لیے وہ ورثہ چھوڑا ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ہم اس مملکت کو ایک مثالی مملکت بنا سکتے ہیں۔ ہم دنیا کی قوموں کے سامنے ایک محسوس ثبوت مہیا کر سکتے ہیں کہ اسلام ہی تمام عالمی مصائب کا حل ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار تو اسلام کا نام سننے کو تیار نہیں باقی رہے عوام تو ان کو اسلام کے نام سے جو افیون پلائی جا رہی ہے وہ اس کو چھوڑنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ غالباً اسی وجہ سے علامہ نے اپنے پیغام کے بلند و عمیق نکتوں کو عوامی زبان میں بیان کرنے کی بجائے ایسی زبانوں کے سپرد کر دیا جو عوام کی دسترس سے باہر ہیں۔ ورنہ ان کی زندگی ہی میں ان کی شدید ترین مخالفت ہوتی۔ اس احتیاط کے باوجود جہاں کہیں ان کی زبان سے کوئی عام فہم کھری بات نکل گئی ہے مذہبی طبقوں

نے اس کا سخت احتساب کیا ہے۔

ایک جگہ علامہ نے لکھا ہے:

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر

سود خوار و والی و ملا و پیر

ہماری سخت جان قوم چار طرف سے موت کے گھیرے میں آ گئی ہے۔ ایک طرف سود خوار بنیے ہیں جو اس کا خون چوس رہے ہیں، دوسری طرف غیر ملکی حکام ہیں جو ہر شعبہ زندگی میں مسلمانوں ہی کو پیس رہے ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے مسلمانوں سے ملک چھینا تھا۔ اس لیے انہی کو وہ اپنا حریف سمجھتے تھے ـــــ یہ دو ایسی موتیں تھیں جو خارج سے مسلط تھیں۔ ان کے علاوہ دو داخلی موتیں بھی ہیں جو ابھی تک امت مسلمہ کو اپنا شکار بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ہیں مذہبی تقدس کے پردے میں چھپے ہوئے عوام دشمن ملا اور پیر صاحبان ـــــ علماء و صوفیہ میں جو قلیل التعداد بھلے آدمی ہیں ان کا اتنا اثر نہیں کہ قوم کو موت کی طرف لے جانے والوں کے چنگل سے چھڑا سکیں ـــــ بنیے اور انگریز سے نجات پانے کے بعد بھی ہم اس "فردا" کو قریب لانے کی کوشش کریں جس کی نشاندہی علامہ نے کی ہے تو ہمارے اقتدار پسند حلقے اور ان کے معاون مذہبی مقدسین اس کوشش کو ناکام بنانے کی سعی کریں گے۔ تاہم وہ لوگ جو پیغام اقبال کی اہمیت کو بقدرِ وسیع سمجھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اپنی زبان و قلم سے اس "فردا" کے لیے راستہ ہموار کریں۔

اپنا اپنا مطلب

اس وقت ہو یہ رہا ہے کہ مختلف و متضاد خیالات کے لوگ کلامِ اقبال سے اپنے اپنے مطلب کے اشعار نکال کر اپنی تائید حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ مقصد بلند جو علامہ کا نصب العین تھا اس کی طرف بہت کم نگاہیں اٹھتی ہیں۔ کیونکہ اس کے قائم ہو جانے سے مفاد پرستوں کی چھوٹی چھوٹی دکانداریاں ختم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ صوفی اپنے تصوف کی تائید اقبال سے حاصل کرتا ہے کمیونسٹ اپنی حمایت میں اشعار لے آتا ہے۔ جمہوریت کا داعی اپنا کام نکالتا ہے اور جمہوریت کا مخالف بھی بہت کچھ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے متضاد مذہبی فرقے بھی اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان سب سے بلند ہو کر عالم گیر اسلام کا داعی ہے جس میں کوئی فرقہ

نہیں، جو ایک نہ ایک دن ساری دنیا کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ جس کو شرق و غرب سے کوئی خصوصی نسبت نہیں ہے۔ ؎

"درویشِ خدامست نہ شرقی نہ غربی"

اقبال نے جن زبانوں میں اپنے خاص اسرار و نکات بیان کیے ہیں وہ انگریزی اور فارسی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کا عمیق مطالعہ کیا جائے اور پاکستان کے نظامِ زندگی میں ان سے عملی استفادہ کیا جائے۔

کیا اقبال مذہبی شاعر تھے؟

جو لوگ اقبال کو مذہبی شاعر کہتے ہیں وہ نہ اقبال کو سمجھتے ہیں اور نہ اسلام کو، اسلام اس معنی میں مذہب ہے ہی نہیں جس معنی میں دنیا کے عام مذاہب ہیں۔ بلکہ یہ ایک مذہب شکن عالمی تحریک ہے جس میں تمام انقلابی ریفارمروں (انبیاء اور ان کے اتباع) کا احترام اور تمام عالم گیر صداقتیں موجود ہیں وہ ان لوگوں کے ذریعے جو اس پر ایمان لائیں۔ تمام اقوامِ عالم کو وحدتِ انسانیہ اور وحدتِ الوہیہ کے بلند ترین نصب العین کی طرف دعوت دیتا ہے۔

عہدِ حاضر کی سائنس نے اقطاعِ عالم کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے۔ لیکن حقیقی قرب کے لیے ابھی مدت درکار ہے۔ وہ قربِ مسافت نہیں بلکہ ارواح و قلوب کا قرب ہوگا جس کی طرف اعلیٰ اذہان تو منتقل ہو رہے ہیں لیکن عملی زندگی ابھی بہت پسماندہ ہے۔ اقبال نے اپنی ایک ریڈیائی تقریر ۱۹۳۸ء میں کہا تھا:۔

"انسان کی بقاء کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔"

اس سے بھی پہلے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔ "قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔"

کیا ایسے شخص کو فرقہ پرست مذہبی شاعر کہنا درست ہو سکتا ہے؟ انہوں نے یہ وسعت و عالم گیری قرآن سے سیکھی ہے۔ وہی قرآن جو فرقہ پرستی کو شرک ایسے گناہِ عظیم سے بھی بدتر کہتا ہے، اس کا ثبوت چاہو تو سورۂ طٰہٰ میں موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کا مکالمہ دیکھو۔ موسیٰؑ سے خفا ہو کر کہہ رہے ہیں کہ:۔

"اے ہارون تم نے میرے گئے پیچھے قوم کو گوسالہ پرستی سے کیوں نہ روکا؟"

ہارون علیہ السلام نے ایسا جواب دیا جس کی قیمت ملک جم بھی نہیں ہو سکتی :

" انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل "

میں اس بات سے ڈرا کہ بنی اسرائیل میں تفرقہ نہ پیدا ہو جائے۔ اس لیے وقتی طور پر شرک کو برداشت کر لیا ـــــ اس سے قرآن کے نزدیک وحدت انسانیہ کی قدر و قیمت سمجھ میں آ سکتی ہے جب تک یہ وحدت حاصل نہ ہو انسانیت مصائب سے چھٹکارا پا کر امن کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔ اقبال سے پوچھیے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی"

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

وہ قانونِ الٰہی جو امن عالم کا ضامن ہے جس کی طرف اقبال دعوت دیتے ہیں ـــــ کہاں ہے؟ یہ سوال بہت ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرقہ قانون الٰہی سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن سب کا قانون الٰہی ایک دوسرے سے الگ اور بعض مواقع پر متضاد بھی ہو گا۔ بہت تحقیق اور ریسرچ کے بعد آپ جس نتیجے پر پہنچیں گے وہ اس مصرعے سے مختلف نہیں ہو گا۔

" شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا "

قانونِ الٰہی

آئیے اقبال ہی سے پوچھیں کہ اس قانون الٰہی کا منبع کیا ہے۔ اس کے لیے ان کے نظم و نثر کے ذخیرے کھنگالنے پڑیں گے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔

(پروفیسر صوفی تبسم کے نام خط ۱۹۳۵ء)

تبسم صاحب ہی کے نام ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں :۔

" میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس

اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوانسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

(خط ۱۹۲۵ء)

اس اقتباس کی آخری سطر قابلِ غور ہے جس میں کسی قوم و مذہب کی بجائے تمام بنی نوع انسان کی عظیم خدمت احکامِ قرآنی کی ابدیت کو قرار دیا گیا ہے اور جو شخص اس خدمت کو سرانجام دے اس کو مجدد اسلام کے لقب سے نوازا گیا ہے۔

یقیناً اس وقت اسلام کو ایسے ہی مجدد کی ضرورت ہے جو کسی فرقے سے وابستہ نہ ہو۔ کسی خاص فرقے کا مؤید نہ ہو۔ جس کے پیشِ نظر خدا کے پیدا کیے ہوئے تمام انسانوں کی فلاح و بہبود ہو۔ اور وہ فلاح و بہبود خدا ہی کی نازل کردہ کتاب قرآن عظیم کے نقطہ نگاہ سے حاصل کرے۔

آب و نان ماست از یک مائدہ

دودۂ آدم کنفسِ واحدہ

آدم کا سارا خاندان یک جان ہو جائے اور ایک دسترخوان پر بیٹھ کر بلا تفریق لطف اندوز حیات ہو۔

آج کے مسلمان

علامہ کی مجددانہ تحقیق کا صحیح اندازہ خطبات تشکیل جدید سے ہو سکتا ہے جو ۱۹۲۸ء میں مرتب ہو کر مغربی دنیا میں علامہ کی شہرت و تعارف کا ذریعہ بنے۔ اس باب میں چھٹا خطبہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بعض اقتباسات ہی اس مضمون میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ آغاز خطبہ میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں :-

" اسلام نوعِ انسانی کی وحدت کی بنیاد خون کے رشتوں پر نہیں رکھتا ——— ذرا آگے بڑھ کر فرماتے ہیں :-

" اسلام کا مطالبہ تخت و تاج کی اطاعت نہیں، صرف خدا کی اطاعت ہے "

ہمارے ہاں خدا کی اطاعت سے مراد ایک خاص زمانے تک کے اجتہاد کی اطاعت ہے۔ اس کے بعد جمود اور فرقہ بندی ہے۔ علامہ ان دونوں کے خلاف ہیں اور اجتہاد کو جاری سمجھتے ہیں۔ اس

کے لیے وہ قرآنی آیت (والذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا اور حدیث معاذؓ سے سند حاصل کرتے ہیں ـــــ وہ ماضی کا صحیح مقام متعین کرکے اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے غلط احترام سے متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"قوموں کے زوال کا علاج ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔"

"تیرھویں صدی کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔"

نجدی تحریک نے پوری جرأت سے کام لے کر اس جھوٹی تقدیس اور جمود و تصلب کے خلاف علم بلند کیا۔ لیکن ایک مقام پر آکر وہ خود تصلب کا شکار ہو گئی۔ علامہ اس کا اعتراف کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کوتاہی کی نشاندہی بھی کیے جاتے ہیں۔

"یہ تحریک ایک طرف اس عقیدے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی تھی کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں اور اپنے لیے حقِ اجتہاد کی زبردست حامی ہے۔ لیکن دوسری طرف ماضی کے متعلق اس کا طرزِ عمل یکسر غیر ناقدانہ تھا اور قوانین شریعت کے لیے وہ صرف احادیثِ نبویؐ پر دار و مدار رکھتی تھی۔"

آگے بڑھ کر جدید ترکی کے ذکر کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ :-

"ایک دن ہمیں بھی اپنی علمی میراث کا از سرِ نو جائزہ لے کر اس کی صحیح صحیح قیمت متعین کرنی ہوگی۔ اس سے اگر ہم نے عام فکرِ اسلامی میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ بھی کیا تو ہم کم از کم اتنا تو کر سکیں گے کہ اپنے ماضی پر صحیح تنقید سے بے راہ روی اور مذہب سے برگشتگی کی اس رَو کو تھام سکیں جو اس وقت عالم اسلامی میں بڑھتی جا رہی ہے۔"

علامہ مذہب اور سیاست میں ثنویت کے سخت خلاف ہیں۔ وہ قرآن کے قانونی اصول میں وسعتوں کے امکانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"ترکوں کی نیشنلسٹ پارٹی نے مملکت کے متعلق جو نظریہ قائم کیا ہے وہ یکسر گمراہ کن ہے۔ اس لیے کہ وہ مذہب اور سیاست میں اس ثنویت پر مبنی ہے جس کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔"

سعید حلیم پاشا کے حوالے سے ہماری موجودہ مذہبیت پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہماری تاریخ میں اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی اصول مقامی اثرات اور (نو مسلم اقوام کے) زمانہ قبل اسلام کے توہم پرستانہ عقائد و مسالک کی وجہ سے آہستہ آہستہ غیر اسلامی ہوتے چلے گئے چنانچہ آج یہ حالت ہے کہ یہ اصول اسلامی کم اور ایرانی، ترکی اور عربی زیادہ ہیں۔ اسلام کے عالمگیر اور غیر شخصی اخلاقی اصولوں پر مقامی اثرات کا کچھ ایسا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اس کی اصلی شکل و صورت اب پہچانی ہی نہیں جاتی۔ حتیٰ کہ اصولِ توحید کی مقدس جبین پر اصنام پرستی تک کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ اندریں حالات ہمارے لیے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں اور جس (زنگ) کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے انہیں کھُرچ کھُرچ کر علیٰحدہ کیا جائے اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے۔ جو حقیقی اسلام کی سادگی اور افادیت کا آئینہ دار ہو۔"

پاکستان اس وقت زندگی کے جس موڑ پر کھڑا ہے اسے آگے بڑھنے کے لیے سعید حلیم پاشا کے یہ خیالات مشعلِ راہ کا کام دے سکتے تھے۔ ان کی اہمیت سے اغماض ہمارے لیے اور ان تمام ممالک کے لیے جو ہماری رفتار پر غائر نظر جمائے ہوئے ہیں سخت مایوس کن ثابت ہوگا۔

علامہ نے آج سے تیس سال پیشتر جو آواز اٹھائی تھی پاکستان بننے کے دس سال بعد بھی وہ آج ہی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"آج مسلم اقوام کی اکثریت کی حالت ایسی ہی ہو چکی ہے کہ وہ لکیر کے فقیر ہیں۔ جو ایک مشین کی طرح پرانی اقدار کی رٹ لگاتے چلے جا رہے ہیں۔"

ارتقاء کی گنجائش

علامہ مرحوم کے نزدیک سب سے بڑا سوال جو زود یا بدیر..... مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟..... اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ :۔

"حسبنا کتاب اللہ"

ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ "حسبنا کتاب اللہ" کہنے کے لیے عمرؓ کا سا منہ ہونا چاہیئے۔ عمرؓ کی سی بصیرت، تقویٰ اور انتظامی قابلیت ہونی چاہیئے۔ ورنہ اس کا حشر وہی ہوگا جو علامہ نے اپنی مثنوی میں فرمایا :۔

کارِ ما ابتر ز کارِ ایں شدہ است

ہر لیمے راز دار دیں شدہ است

اس وقت بہت سے لوگ عمرؓ کے اس قول کی پناہ لیے ہوئے ہیں لیکن وہ اسلام کی عالمگیر جامعیت اور روحانیت سے اتنے ہی دور ہیں جتنے دوسرے فرقہ پرست مسلمان ——

بقول پروفیسر ہارٹن (ماہر السنہ سامیہ بان یونیورسٹی) "۸۰۰ء سے لے کر ۱۱۰۰ء تک مسلمانوں میں کم از کم ایک سو فقہی مکاتب پیدا ہوئے۔ یہ اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ اسلامی فکر میں کتنی لچک ہے ..... اسلام کی روح (اسپرٹ) وسیع ہی نہیں بلکہ قریب قریب لامحدود ہے۔"

یہ ایک غیر مسلم محقق کا اعتراف ہے جس کی عملی تکذیب ہماری مسلسل تنگ خیالیاں کرتی چلی آرہی ہیں۔

علامہ اپنے خطبے میں بار بار باصرار دہراتے جا رہے ہیں کہ اسلامی قانون شریعت جامد اور ناقابل ارتقاء نہیں اور یہ بھی کہ روح اسلامی کی اندرونی عالمگیریت علماء کی شدید قدامت پرستی کے علی الرغم کارفرما ہو کر رہے گی۔ اس لیے وہ چند "معروضات" پیش کرتے ہیں۔

اصلی سرچشمہ

سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرون اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا اور کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا ..... اسلام میں قانون کا اصلی سرچشمہ قرآن ہے۔"

علامہ کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن نے قانون سازی کے لیے جو اصول دیئے ہیں۔ وہ نہ تو فکر انسانی کو سلب کرتے ہیں اور نہ ہی قانون سازی کے میدان کو تنگ یا محدود کرتے ہیں۔ انہی کی رہنمائی میں

ہمارے قدیم فقہائے قانون شرعی نے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کیے۔ اس کا اعتراف خان کریم نے بالفاظ ذیل کیا ہے۔

"رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں عربوں کے سوا کوئی قوم نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔"

لیکن ان قابل قدر انفرادی تغیرات کو حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہوگا۔

یہ عقیدہ کہ آئمہ اربعہ کے مذاہب اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ خود ان ائمہ (رحمہم اللہ) کے منشا کے خلاف ہے۔ چنانچہ علامہ کہتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ (اربعہ) کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی کامل مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔۔۔۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے۔ اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں۔ لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

اقبال کو اپنی اپنی تائید میں پیش کرنے والے بزرگ کاش ان تصریحات پر بھی غور کریں کاش وہ سمجھیں کہ نبوّت کے سوا کوئی دروازہ بند نہیں ہوا۔ فہم و بصیرت اور زہد و تقویٰ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

حدیث

حدیث کے متعلق علامہ مرحوم شاہ ولی اللہؒ کی بحث کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعض فقروں سے مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔

"امامِ اعظم نے اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔۔۔۔۔۔ اگر آج کوئی وسیع النظر مقنّن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لیے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابو حنیفہ کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقنّنین میں ہوتا ہے۔"

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ محدثین نے قانون کے متعلق مجرد فکر و قیاس کے مقابلے میں ٹھوس واقعات کو زیادہ اہمیت دینے سے شرعی قانون کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔"

حنفی فقہ

حنفی فقہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ "دیگر مذاہب فقہ و تشریح کے مقابلے میں حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے امام ابوحنیفہ کے ناقدین نے عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا۔"

فقہ حنفی کا خاص الخاص اصول "قیاس" بقول امام شافعیؒ اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے جس سے وحی کی چاردیواری کے اندر رہ کر پورا پورا کام لیا جا سکتا ہے ـــــ آخر میں قاضی شوکانی اور علامہ سرخی (دسویں صدی) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی وجہ زمانہ زوال کا ذہنی تساہل ہے جس کے اثر سے بڑے انسانوں کو معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علماءِ متاخرین نے اس افتراء کو قائم رکھا تو یہ ان کا اپنا فعل ہے دورِ حاضر کا مسلمان ان کا پابند نہیں۔"

بقول سرخیؒ "اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں جو اب نہیں ہیں تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ دراصل متقدمین کے مقابلے میں متاخرین کے لیے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ ..... اب قرآن و سُنّت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس تعبیرات کے لیے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے جو متقدمین کے پاس نہ تھا۔"

بڑی رکاوٹ

جو لوگ مغربی ممالک کی پیروی کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں ان کے لیے علامہ کی اسقدر تصریح کافی ہونی چاہیئے۔

"یقین مانیے انسانیت کی اخلاقی ترقی کے راستے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس وحی کے تصدق، وہ بنیادی تصورات موجود ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وحی کا سرچشمہ اعماق حیات ہے۔ اس کے حروف و الفاظ کے لباس میں اس

کی اہم حقیقتیں مستور ہیں ..... دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھادے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔"

جاوید نامے میں بھی انہوں نے قدامت پسندوں اور تجدد نوازوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے

عالماں از علم قرآں بے نیاز
صوفیاں درندہ گرگ و مودراز

ہم مسلماناں افسونگی مآب
چشمۂ کوثر بجویند از سراب

بے خبر از سردیں اندایں ہمہ
اہل کیں اند، اہلِ کیں اندایں ہمہ

اس کتاب میں دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ قرآن کسی اور طرف بلا رہا ہے اور مسلمانانِ عالم دوسری طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

منزل و مقصود قرآں دیگر است
رسم و آئین مسلماں دیگر است

اگر ہم اقبال کے موجودہ فردا کو قریب لانا اور پاکستان میں مثالی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں فرقہ پرستانہ تعصبات سے الگ ہو کر پیغامِ اقبال سے استفادہ کرنا ہوگا۔ اس میں ہماری، ہماری آئندہ نسلوں کی اور تمام عالمِ انسانیت کی بہتری ہے اور یہی منزل و مقصود قرآن ہے۔

ایک کہنے والے نے کہا تھا کہ "اگر انگریز اقبال کو سمجھ لیتا تو اقبال ایک دن بھی زندانِ فرنگ سے باہر نہ رہنے پاتا۔

اور اگر مسلمانوں کو اس کے سمجھنے کی توفیق مل جاتی تو وہ زندہ قوموں کی صف میں سب سے آگے ہوتے۔"

انگریز کے زمانے میں ہم اقبال کو نہیں سمجھ پائے۔ انگریزی تسلط کا دباؤ ہمارے لئے

بڑی رکاوٹ تھا۔ لیکن آج ہم پر کوئی دباؤ نہیں۔ آج ہمیں اپنی راہ متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ آج اقبال پر غور کرنے والوں کا فرض ہے کہ اصل نصب العین کو عوام و حکام کے سامنے لائیں۔ اگر اس وقت ہم غافل رہے تو خدائی قانون کی ایک شق یہ بھی ہے۔

" ان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم "

اگر تم اسی طرح روگردانی کرتے رہے تو خدا کا قانون کسی اور قوم کے ذریعے رائج ہو کر رہے گا ــــ علامہ فرماتے ہیں :۔

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتش خود بر دل دیگر زنند

ڈرتا ہوں کہ مسلمان قرآنی ہدایت سے برگشتہ رہے تو ابدی محروم ہو جائیں گے اور اس پیغام کے حامل دوسرے لوگ بنا دیئے جائیں گے۔

(اس مضمون میں اقتباسات محترم پرویز صاحب کے ترجمے سے لیے گئے ہیں)

اقبالؒ کا مردِ مسلمان

چہ باید مرد را طبعے بلندے، مشربے نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے

آدمی کو کیسا ہونا چاہیئے؟ انسانیت کی معراج کمال کیا ہے۔ وہ کون سی صفات ہیں جن کی وجہ سے ایک شخص مردِ کامل کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ان مختلف فقروں کی روح ایک ہی ہے اور اقبال کے لفظوں میں صرف یہ ہے کہ ــــ "چہ باید مرد را؟" یعنی مرد کو مرد ہونے کے لیے کیا کیا چیز چاہیئے؟ اگر اس سوال کو شائع کر کے تمام دنیا میں پھیلا دیا جائے اور انسانی آبادی کے ہر گوشے سے اس کے جواب حاصل کیے جائیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ جواب کیا ہوں گے؟ کیا کوئی ایک متفقہ جواب حاصل کرنے میں آپ کامیاب ہو جائیں گے یا نہیں، ہرگز نہیں۔ بے شمار جواب ہوں گے اور بے شمار اختلافات پر مبنی ہوں گے۔

اہلِ مذاہب اپنے اپنے مذہب کی بناء پر مرد کی صفات مقرر کریں گے۔ حکیم اور فلسفی اپنے اپنے مکتبِ فکر کی رو سے اصولِ انسانیت تجویز فرمائیں گے۔ اہلِ سیاست اپنی اپنی سیاست کے نقطۂ نگاہ سے اظہارِ خیال کریں گے۔ کاروباری لوگ، تعلیم پیشہ حضرات، قانون دان گروہ، ادب پسند جماعتیں، اہلِ صنعت و حرفت، سرمایہ دار، عوام وغیرہ وغیرہ سب ہی اس آیت کی عملی تفسیر نظر آئیں گے۔ "لایزالون مختلفین" ان کے اختلاف کبھی ختم نہیں ہوں گے ــــ یہیں پر بس نہیں ــــ پھر ایک ایک گروہ کے اندر افراد کے اختلافاتِ فکر و نظر اور بھی زیادہ بے شمار تعداد کی حدوں کو پھاندتے ہوئے نظر آئیں گے ــــ کہیں حُسن و جمال اور تناسبِ اعضاء کو ترجیح دی جائے گی۔ کہیں مال و دولت اور جاہ و جلال کی پرستش کا جذبہ دخیل رہا ہوگا۔ کہیں حبِ وطن میں قربان ہو جانا سب سے بڑا وصف سمجھا جائے گا۔ کہیں مذہب کی مفروضہ اقدار کے لیے قتل و غارت کو سراہا جائے گا۔ کہیں ذہانت و حافظہ کو سب سے بڑی دولت کہا جائے گا۔ کہیں ترکِ زن و فرزند کو بہت بڑی روحانی فضیلت شمار

کیا جائے گا۔ کہیں مقصد براری کے لیے ہر مکر و فریب اور ہر روا و ناروا کے ارتکاب کی تحسین ہوگی۔

یہ جو کچھ کہا گیا خلاصہ ہے۔ ان بڑی بڑی اور بے شمار کتابوں کا جو اس وقت دنیا میں رائج ہیں اور صدیوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ لیکن اس طویل تجربے نے انسانیت کو کیا فیض پہنچایا؟ افسوس ہے کہ اس سوال کا کوئی خوشگوار جواب حاصل نہیں کیا جا سکتا؟

اقبال نے اس اہم سوال کا جواب انسانوں سے یا انسانی کتابوں سے حاصل کرنے کی بجائے اللہ کی کتاب سے حاصل کیا ہے۔ جس کی صحت و حقانیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر دوسری شے سے زیادہ "ترجمان القرآن" کہتے ہیں۔

گر بحرفم غیرِ قرآں مضمراست در دلم آئینہ بے جوہراست

یعنی میرے کلام میں غیر قرآن کا دخل نہیں اور میرا دل ایک جوہر دار آئینہ ہے جس میں حقائق قرآنی کے چہرے کے خد و خال بالکل صاف و صحیح نظر آجاتے ہیں۔

اب وہ قرآن ہی کی روشنی میں ایسے اوصاف بتاتے ہیں جن کی موجودگی سے ایک مرد صحیح معنی میں مرد ہو سکتا ہے۔ یہ اوصاف کسی خاص دائرے میں محدود نہیں کہ اس کے باہر ان کی قدر و قیمت میں فرق آجائے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ گائے کو دیوتا منوانے کے لیے انسانوں کو قتل کر دینا ایک بہت بڑی خوبی ہے جو ایک خاص حلقے سے باہر بالکل غیر انسانی فعل سمجھا جائے گا۔ ایک انسان کو خدا یا خدا کا اوتار یا فرزند مان کر عمر بھر اس کی پرستش کرنا اور اپنی اولاد در اولاد کو بھی یہی تعلیم دیتے رہنا ایک فرقے کے نزدیک بھگتی اور شردھا (عقیدت مندی) کہلاتا ہے ـــــ توحید کے ماننے والے لوگ اسے انسانیت کی انتہائی توہین سمجھیں گے۔ اسی طرح تمام اوصاف جو بیان ہو چکے ہیں، اضافی ہیں حقیقی نہیں۔ لیکن اقبال نے وحی الٰہی سے جو اوصاف اخذ کیے ہیں وہ مکان و زمان کی حدود سے ماورا ہیں ـــــ انہوں نے ایک شعر میں وہ سب کچھ سمیٹ دیا جس کی تفصیلات پورے قرآنِ حکیم میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کی چلتی پھرتی تصویریں ہمیں اس مقدس جماعت میں نظر آتی ہیں جس کی تشکیل حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ہوئی۔ اب ان صفات کو اختصاراً دیکھ جائیے :-

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے

مرد میں کیا اوصاف ہونا چاہئیں۔

۱ ـــــــ طبعِ بلند، ہمّتِ عالی، عزم پختہ، ارادہ مضبوط، نصب العین اعلیٰ۔

۲ ـــــــ مشرب ناب، دین خالص، شرک و توہمات سے پاک، سراسر اخلاص و توحید۔

۳ ـــــــ دل گرم، قلب پُر جوش، آمادہ عمل، مسلسل جدوجہد۔

۴ ـــــــ نگاہ پاک بین، معصوم، فرشتہ صفت، پیکرِ عفت و طہارت۔

۵ ـــــــ جان بے تاب، سراپا حرکت و عمل، شمشیر براں بکف، تیغ تیز، بدست معرکہ آرائے جہاد، ہنگامہ آفرین قتال۔

یہ اوصاف جس ایک مرد میں جمع ہو جائیں وہ "تنہا" امت" ہے۔ اس کا نمونہ اولیں قرآن میں دیکھنا ہو تو پڑھیے یہ آیت :۔

ان ابراهيم كان امةً قانتاً لله حنيفاً ولم يك من المشركين شاكراً لانعمهٖ اجتبٰه و هداه الیٰ صراطٍ مستقيم واٰتيناهُ فی الدنيا حسنةً وانه فی الاخرة لمن الصّٰلحين ۔

۱ ـــــــ بے شک ابراہیمؑ بہترین اوصاف کے مجموعہ ہونے کی وجہ سے اپنی ذات میں ایک امّت (یا امام) تھے۔

۲ ـــــــ وہ خدا کے (مخلص) فرمانبردار تھے۔

۳ ـــــــ وہ ایک طرف کے ہو رہے تھے (بقول شاہ عبدالقادرؒ سب کمال اور فضیلتیں ان میں جمع تھیں کہ اور کسی میں سب اکٹھی نہیں پائی جاتیں)

۴ ـــــــ وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

۵ ـــــــ خدا کی نعمتوں کے شکر گزار تھے۔

۶ ـــــــ خدا نے ان کو (اپنے بندوں میں سے) چُن لیا اور اپنی سیدھی راہ پر چلایا۔

۷ ـــــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو دنیا میں بھی خوبی، آسودگی اور قبولیّت حاصل ہوئی۔

۸ ـــــــ اور آخرت میں نیکو کار لوگوں میں شامل ہوئے۔

یہی صفات حسنہ اور اوصاف حمیدہ حضرت ابراہیم کے بعد ہمیں اس ہستی میں نظر آتے ہیں جس کا ذکر ہمیں بالکل متصلہ آیت میں ملتا ہے۔

ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا ؕ

پھر ہم نے (اے محمدؐ) تیری طرف وحی بھیجی کہ تو بھی ابراہیم کی راہ پر چل جو ایک طرف کے ہو رہے تھے۔ (اس آیت کی رو سے تمام اوصاف ابراہیمی کے وارث آنحضرتؐ قرار پائے)

یہی اوصاف ہیں جو شعر کا لباس پہن کر اقبال کی معرفت ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اقبال اپنے خاص انداز سے اسوہ ابراہیمی اور اسوۂ محمدیؐ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پھر قرآن ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے ان کو اس حد تک اپنایا کہ وہ بھی آنے والی نسلوں کے لیے "اسوہ" یعنی نمونہ بنے۔ حوالے کے لیے دیکھئے سورہ ممتحنہ آیت ۶ اور سورۂ فتح آیت ۳۰)

اب ذرا تفصیل سے شعر کے مذکورہ اوصاف پر نگاہ ڈالیے:

۱۔ طبع بلند، ہمت عالی یا اعلیٰ نصب العین کے بغیر بے شمار انسان کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کی زندگی میں ان کی کوئی اہمیت ہوتی ہے نہ مرنے پیچھے کوئی سلام و تحسین ان کا تعاقب کرتی ہے۔ یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثویً لھم۔ (سورہ محمد آیت ۱۲) وہ دنیوی فائدے حاصل کرتے ہیں اور حیوانوں کی طرح کھانے پینے میں مگن رہتے ہیں۔ ان کا آخری ٹھکانا دوزخ ہے ـــــ یہ ہمت عالی اور طبع بلند کے خلاف پستی طبع کا مظاہرہ ہے جو آپ اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں ـــــ طبع بلند کے دو قرآنی نمونے آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ان کے عظیم کارناموں سے کوئی مسلمان بے خبر نہیں ہو سکتا ـــــ ان کے علاوہ تاریخ و سیر میں بھی ایسے بہت سے درخشاں ستارے نظر آتے ہیں جو ابدی شہرت کے آسمان پر چمک رہے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی بلندئ طبع نے اپنے ماحول اور سماج کی معمولی سطح پر قناعت نہ کی۔ وہ نہ صرف خود ابھرے بلکہ انہوں نے اپنے ساتھ سماج کو بھی ابھارنے اور بلند کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کوشش کے لیے انہوں نے انتہائی قربانیاں پیش کیں ـــــ اس موقع پر میں مولانا ابوالکلام کے دو ایک اقتباسات کا ملخص پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جو ۱۹۱۳ء میں آج سے ۷۴ سال قبل لکھے گئے تھے۔

"یعقوب بن لیث ایک ٹھٹھیرا تھا۔ اس نے جب دکان بڑھائی اور دوستوں سے حصول عظمت و عزت کے تذکرے کیے تو لوگ اس کی باتوں پر ہنستے تھے۔

زبور یا بھی میسر ہوا بچھانے کو !! ہمیشہ خواب ہی دیکھا کیے چھپر کھٹ کے

وہ اس طعن و تشنیع کا مختصر لفظوں میں جواب دے دیا کرتا تھا۔

"میرے پاس مال نہیں ہے۔ دولت نہیں ہے۔ اعوان و انصاف نہیں ہیں۔ ملک گیری و ملک رانی میں سابقہ معرفت حاصل نہیں مگر کیا میرے پاس وہ دل بھی نہیں ہے جس نے ایک خراسانی کافر کو ابو مسلم بنا دیا تھا؟"

ابو مسلم ایک نو مسلم خراسانی تھا جس نے بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اور آل عباس کی نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

آخر ایک دن آیا کہ یہی ٹھٹھرا یعقوب بن لیث اپنے عزم راسخ اور ہمت بلند کے طفیل ایران کا بادشاہ بنا اور خلیفہ روئے زمین کی عظمت اور سپاہ و سلطنت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ تاریخ ایران یعقوب بن لیث کی داستان عظمت و جلال آج تک سنا رہی ہے۔"

اسی مضمون میں مولانا آگے بڑھ کر لکھتے ہیں :

"واشنگٹن کے ایک مدرسہ ثانویہ (سیکنڈری اسکول) میں طلبہ کا امتحان تھا۔ جوابات کے لیے ایک شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ جواب کی کاپیوں پر ہر طالب علم یہ بھی لکھے کہ تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ طالب علم کل ۲۵۰ تھے۔ ان میں سے دس کے سوا باقی لڑکوں نے آزاد کاروباری زندگی کی رغبت ظاہر کی اور وہ دس تعلیمی مشاغل کے ذریعے قومی خدمت پر رضامند ہوئے۔ ان سب میں ایک غریب گھرانے کی ایک نوخیز لڑکی بھی تھی۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ لکھا :۔

"میں امریکہ کی پریسیڈنٹ بننا چاہتی ہوں۔"

ایک فارسی شاعر نے کہا ہے :

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

یعنی ہمیشہ ہمت بلند رہو اور اعلیٰ مقاصد کو سامنے رکھو۔ کیوں کہ دنیا و آخرت دونوں میں تمہاری ہمت کے مطابق ہی تمہیں مرتبہ حاصل ہوگا۔

دور کیوں جاؤ خود اپنے ہی زمانے میں دیکھو۔ آج سے تھوڑا زمانہ پہلے لڑکی کی حالت مغربی سلطنتوں میں ایسی تھی جیسے بتیس دانتوں میں نوالہ مسیحی بھیڑیں بھیڑیوں کی طرح اس نحیف شکار کو

نکلنا ہی چاہتی تھیں کہ ایک معمولی خاندان کے ترک سپاہی کی طبع بلند کا جوہر آشکار ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر ملت کی گرتی ہوئی دیوار کو تھام لیا۔ آج مصطفےٰ کمال ترک اعظم غیر فانی شہرت کا مالک ہے۔ جس کی بدولت ترک زندہ اقوام میں شمار ہونے کے لائق ہوئے — اس سے بھی نزدیک اپنے ملک کے ایک بیرسٹر کو دیکھو۔ یہاں بیرسٹر اتنے ہوئے ہیں کہ شمار نہیں ہو سکتا۔ لیکن انہی میں سے ایک اپنی قانون دانی کے ساتھ طبع بلند بھی رکھتا تھا جس نے کروڑوں انسانوں کو انگریز اور ہندو کی دُوہری غلامی سے آزاد کرایا اور دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت (پاکستان) کی جگہ حاصل کی — یہ اتنا بڑا ملک جس میں ہم آپ بس رہے ہیں صرف ایک قائدِ اعظمؒ کے دماغ کی پیداوار ہے جو اوصاف و کمالات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے تنہا انجمن تھے۔ سچ پوچھیے تو "مسلم لیگ" انہی کی واحد شخصیت کا نام تھا۔ ان کے بعد یہ جماعت ایک پیکر بے روح ہو کر رہ گئی۔

انگریز جب یہاں حاکم بن کر آئے تو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے انہیں مشکلات پیش آئیں انہوں نے اپنے مطلب کے لیے تعلیمی ترقی کا انتظام کیا جس کے نتیجے میں کلرکی کے لیے ہر قسم کے ہندوستانی گریجویٹ ملنے لگے۔ جن کی "بلندی طبع" اس مقام تک پہنچ کر رُک گئی کہ کمائیں کھائیں، اور گورنمنٹ کی غلامی میں عمریں گزار دیں — انگریز کے چلے جانے کے بعد اب تک ہمارے نوجوان وہی لکیر پیٹتے جا رہے ہیں۔ اقبال کے زیر شرح شعر میں مرد بننے کی یہ پہلی شرط تھی جو ابھی تک مفقود ہے۔

۲۔ دوسری شرط انہوں نے "مشرب ناب" بتائی ہے۔ قرآن کی زبان میں ان کو "الدین الخالص" کہا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے :-

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد اللہ مخلصاً لہ الدین۔ الا للہ الدین الخالص والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ان اللہ یحکم بینھم فی ما ھم فیہ یختلفون ان اللہ لا یھدی من ھو کاذب کفار۔

(اے پیغمبرؐ!) ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف سچائی سے نازل کی ہے۔ پس خدا کی عبادت کرو۔ کامل اخلاص و یک جہتی سے دین کو قبول کرتے ہوئے۔ یاد رکھو خالص دین اللہ ہی کے لیے ہے اور جنہوں نے (اس اخلاص میں کھوٹ ملایا یعنی اللہ کے سوا اور دوست بنا لیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم

خدا ہی کا تقرب حاصل کرنے کے لیے غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ ایسے جھوٹے ناشکروں کو (ان کے جھوٹ اور ناشکری کی وجہ سے) ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔

ان آیات نے دین کا خلوص اور عدم خلوص دونوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ خلوص فی الدین کا مطلب خدائے واحد کی عبودیت، بندگی اور فرماں برداری ہے اور عدم خلوص یہ ہے کہ اس کے آئین وارشاد کے چشمہ صفائی میں انسانی آراء وافکار کو ملا کر ایک مرکب دین تیار کر لیا جائے ظاہر ہے کہ انبیاء سے پہلے لوگ بے دین نہیں ہوتے تھے جس کی نشان دہی خود قرآن نے بھی کی ہے۔ (لکم دینکم) لیکن وہ دین غیر خالص ہوتا ہے۔ وہ لوگ انبیاء کا نام لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو ان کا امتی کہتے ہیں جیسے کہ عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور یہود ونصاریٰ ان کے ساتھ مسیح وکلیم وغیرہ انبیاء علیہ السلام کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن ان کے پاس کسی بھی پیغمبر کی خالص تعلیم جس کو اقبال "مشرب ناب" کہتے ہیں موجود نہیں رہی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ ہر لحاظ سے پس ماندہ، ذلیل، خوار ہو رہے تھے۔ ہر قوم اتنا عرصہ ہی عروج پر رہتی ہے جب تک اس کے افراد میں "مشرب ناب" پایا جائے۔ جونہی انہوں نے اس سے روگردانی کی ان پر نکبت وادبار کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں ـــــ "مشرب ناب" افکار وعقائد کی صحت کا دوسرا نام ہے جس کا لازمہ ہے اعمال کی صحت ودرستی اور پھر نتائج کی کامیابی وبامرادی ـــــ عرب جب تک "مشرب ناب" سے محروم رہے اقوام عالم میں کسی شمار کے قابل نہ تھے۔ پھر جب مشرب ناب یا الدین الخالص کی دولت سے فیض یاب ہوئے تو ان کی کایا پلٹ گئی۔ بکریاں چرانے والے امیر المومنین اور فاتح اعظم بن گئے۔ ساری دنیا نے ان کا لوہا مانا۔ آج تک ان کے اندازِ حکمرانی کو نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد پھر جب دور پلٹا اور دین خالص میں آمیزشیں شروع ہوئیں تو وہ رعب وداب بھی گیا (تذہب ریحکم) اور وہ عروج واقبال بھی نہ رہا۔ اسلامی سلطنتیں تو آج بھی اسی مشرب ناب کی یادگار میں صفحۂ عالم پر موجود ہیں۔ لیکن کیا ان میں وہ سکت موجود ہے جو اسلام کے شایانِ شان ہونی چاہیئے؟ مقامِ مسرت ہے کہ ہر اسلامی ملک میں اس کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ مستقبل میں مسلمان انسانوں کے بنائے ہوئے آئین وقانون

سے مایوس ہوکر پھر سے صدیقؓ وفاروقؓ کے آزمودہ مشرب ناب کی پناہ میں آجائیں۔(انشاء اللہ)

۳۔ تیسری بات جو علامہ نے وصف مرد قرار دی ہے وہ "دل گرم" ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ صفات ایک دوسری کے ساتھ اس طرح کا علاقہ رکھتی ہیں جیسا ایک ہی درخت کے مختلف اجزاء پھل۔ پھول۔ پتے۔ شاخیں۔ تنا وغیرہ کہ ایک سے دوسرا جزو اور دوسرے سے تیسرا جو تھا پیدا ہوتے ہیں۔ جو شخص بلندئ طبع اور مشرب ناب سے بہرہ ور ہوگا اس کے دل میں عزم و ولولہ اور جوش سعی وعمل بھی ضرور ہوگا۔ ہم اپنی تاریخ کے بلند پایا مردوں میں اس وصف کو بھی نمایاں دیکھتے ہیں۔ ماضی قریب میں سرسید اور ان کے نیک نام رفیقوں نے ہندی مسلمانوں کو جہالت و پستی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے جس گرم جوشی کا ثبوت دیا اور جس طرح اپنے راستے کے پہاڑوں کو ریت کی طرح پیس کر رکھ دیا۔ تاریخ میں اس کی مثالیں نادرالوجود ہیں۔ دل گرم کا مالک تنہا کیا کچھ کر سکتا ہے اور اپنے ارد گرد کتنے دلہائے گرم فراہم کر سکتا ہے۔ سرسید کے علاوہ اس کا حیرت انگیز نمونہ حضرت سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد سے بھی مل سکتا ہے۔ طریق کار دونوں کا الگ الگ تھا لیکن مقصد ایک ہی تھا کہ مسلمانوں کو اغیار کے مظالم سے بچایا جائے اور عزت کے مقام پر سرفراز کیا جائے۔ ان کے بعد قائداعظم بھی اسی راہ کے کامیاب رہرو تھے ان کی راہ کی مایوس کن رکاوٹوں کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی تحریک کا آغاز و انجام سب ہمارے سامنے پروان چڑھا۔ اس وقت شاید ہی کوئی امید رکھتا ہو کہ ایک نحیف انسان ان عظیم مشکلات پر قابو پالے گا۔ جو ایک مضبوط و وسیع حکومت (برطانیہ) اور ایک دولت و ثروت والی قوم (ہندو) اور خود اپنی قوم مسلمان کی کئی جماعتوں کی طرف سے کھڑی کی جارہی ہیں۔ ہم نے قائداعظم کی مسلم لیگ کے تمام نشیب و فراز دیکھے۔ سخت مخالفت اور حیرت انگیز مقبولیت بھی دیکھی۔ بڑے بڑے ہندو لیڈروں اور انگریز اکابر سے قائداعظم کے سوال و جواب اور مکالمے بھی پڑھے۔ لیکن حاشا و کلا ہمارے دل میں یہ بات بالکل نہیں بیٹھتی تھی کہ انگریز برصغیر ہند سے اس طرح نکل جائے گا جس طرح مکھن سے بال' اور ہندو اپنی پوتر بھومی بھارت کا اتنا بڑا حصہ مشرق و مغرب میں مسلمانوں کے حوالے کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ لیکن قربان جائیے اس مردِ نحیف کے "دل گرم" کے کہ اس نے جو بات زبان سے نکال دی اس پر ایسا جما کہ کوئی زلزلہ انگن طاقت بھی اس کو ہلا نہ سکی۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو دل گرم نصیب ہو جائے تو اس سے معجزے سرزد ہو سکتے ہیں۔ دل گرم بڑی چیز ہے لیکن ہے کم یاب ونادر۔

۴ - اور آگے بڑھیے تو علامہ "نگاہ پاک بیں" کی نشان دہی فرماتے ہیں۔ نگاہ پاک بیں عنوان ہے۔ قلب کی پاکیزگی کا، قلب کی پاکیزگی جو نفس و روح کی عفت وطہارت کے سرچشمے سے پھوٹتی ہے اور نگاہ بے باک پر رضائے مولا کے پہرے بٹھا دیتی ہے۔ اس موقع پر ابراہیمی گھرانے کے ملک کریم (فرشتہ حسن) یوسف علیہ السلام کا جمال عالم آشوب چشم تصور کے سامنے آرہا ہے۔ اسرائیل علیہ السلام کا یہ فرزند جمیل ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی امتحانوں میں ڈالا جاتا ہے۔ بھائیوں کے مظالم، کنوئیں میں افتادگی، بردہ فروشوں کی چاکری، غلاموں کی منڈی میں فروختگی، عزیز مصر کی ماتحتی اور آخر میں قید و بند کی طویل مصیبت، لیکن ان سب میں سخت ترین امتحان وہ تھا جو عزیز کے گھر میں پیش آیا۔ ایک معصوم نوخیز اور ناتجربہ کار پیغمبر زادے کے گرد وپیش حسن وشباب کی بجلیاں چمک رہی ہیں، ان کے عقب میں عیش ونشاط اور جاہ وجلال کے تمام اسباب جرأت رندانہ کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔

شہر یست پُر زخوباں و زہر طرف نگارے | یاراں! صلائے عام است گر می کنید کارے

توریت اور دوسری کتابوں میں یہ داستانِ لذیذ بہت شرح وبسط سے بیان ہوئی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے اس خاص حادثہ کو ایک ہی آیت میں بر سبیل ایجاز و اعجاز سمیٹ لیا ہے ــــــــ

(اوراودتہ التی ھو فی بیتہا عن نفسہ وغلقت الابواب وقالت ۔

ھیت لک ــــ یہ اس آیت کا نصف حصہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یوسفؑ جس عورت کے گھر میں غلامانہ رہ رہے تھے وہ فریفتہ جمال ہو کر اپنے وقار و مرتبہ کو فراموش کر گئی اور ان کے سامنے دامن تمنا پھیلا دیا۔ ایسی حالت میں کہ گھر کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ یوسف اگر سرِ تسلیم جھکا دیتے تو اس پیکر رعنائی کے ساتھ اس کے شاہانہ محل کی تمام دولتیں اور آسائشیں بھی انہی کی ملکیت ہو جاتیں۔ لیکن اس نازک ترین موقع پر انہوں نے کیا کیا؟ اس سوال کا جواب آیت کے نصف آخر میں ملتا ہے۔

قال معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون ۔

ے - ایک شہر ہے معشوقوں سے بھرا ہوا - جدھر دیکھو حسن وجمال ہی کے پھول کھل رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر گل چینی کرنا چاہو تو کوئی روک بھی نہیں۔ بالکل دعوتِ عام ہے۔

ان کی زبان وحی ترجمان سے نکلا "خدا کی پناہ میرے پروردگار نے میرے ساتھ احسان کیا اور مجھے اچھا ٹھکانا دیا۔ اس کے احسان کے عوض ایسے فعل کا ارتکاب صریح ظلم ہے اور ظلم پیشہ لوگوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا ـــــ چند روزہ عیش کی خاطر دائمی فلاح و بہبود سے محرومی وہی گوارا کر سکتا ہے جو ایمانی بصیرت سے قطعاً محروم ہو۔

نفس واقعہ ختم ہوگیا۔ اس کی دنیوی سزا برسوں تک بھگتنی پڑی۔ لیکن چشم پاک بیں کے دامن عصمت کو داغ معصیت سے بچالیا۔ آخر وہ وقت آیا جب عزیز کی بیوی اور اس کی ساتھ والیوں کو بھرے دربار میں اقرار کرنا پڑا۔ قلن حاش للہ ما علمنا علیہ من سوء ـــــ قالت امرأت العزیز الئن حصحص الحق انا راودتہ ، عن نفسہ وانہ لمن الصادقین ـــــ سب پکار اٹھیں کہ "توبہ توبہ ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں پائی۔ بالخصوص عزیز کی بیوی نے اعتراف کرلیا کہ آج صداقت ظاہر ہوگئی۔ میں ہی قصوروار تھی اور یوسف سچائی پر تھا۔

قرآن اہلِ ایمان کی نگاہ پاک کی تربیت پر بہت زور دیتا ہے۔

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذالک ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون۔

اے پیغمبرؐ مسلمانوں کو کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنے جنسی جذبات کی حفاظت کریں۔ اس میں ان کے لیے نہایت ہی پاکیزگی ہے اور یاد رکھیں کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

یعلم خائنۃ الاعین ـــــ آنکھوں کی خیانت جس کو کوئی دنیوی قانون گرفت نہیں کر سکتا اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے۔

بہشتی حوروں کی تعریف میں کتنی حسین ترکیب استعمال فرمائی ہے "قاصرات الطرف" جن کی نیچی اور شرم گیں نگاہیں آنکھوں سے نکل کر ایک خاص حد پر پہنچ کر رک جاتی ہیں بے محابا ادھر ادھر جھانکنا تاکنا ان کا شیوہ نہیں۔ نگاہ پاک میں اپنی بہت سی روحانی و اخلاقی خوبیوں کے ساتھ اس بات کی نشان دہی بھی کرتی ہے کہ ایسا شخص اپنے آپ پر قابو رکھتا ہے اور اپنے اوپر قابو رکھنا ایک سلطنت پر قابو رکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

نہ مارا نفس کو جو خاک سے اکسیر بن جاتا　　اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا؟

۵۔ آخری بات جو علامہ کے نزدیک مرد میں ہونی چاہیئے۔ وہ "جان بے تاب" ہے۔ "جان بے تاب" سے ان کی مراد ایسی متحرک شخصیت ہے جو ایک حالت پر قانع و جامد ہو کر بیٹھ جائے۔ انسان کے سوا تمام کائنات اس لحاظ سے مجبور ہے کہ جو کچھ اسے بنا دیا گیا، بن گئی۔ آگے بڑھنا یا اوپر اٹھنا اس کے بس میں نہیں۔ رینگنے والے، چار پاؤں پر چلنے والے، فضا میں اڑنے والے، پانی میں رہنے والے حیوانات اپنے اپنے دائرے میں محدود چلے آ رہے ہیں اور ایسے ہی رہیں گے۔ لیکن انسان چلنے کے ساتھ اڑ بھی سکتا ہے۔ تیر بھی سکتا ہے۔ زیر زمین اور زیر آب سفر بھی کر سکتا ہے۔ اور کیا کیا کچھ کر سکتا ہے اور کر رہا ہے اور آئندہ کرے گا۔ اس کے امکانات کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ یہ سب اس کی "جان بے تاب" کی برکتیں ہیں کہ ھل من مزید (اور آگے اور آگے) کہتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اقبال انسان کی آخری پرواز اس مصرع میں بتاتے ہیں۔ ؏

"یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ"

اسی خیال کو غالبؔ نے دوسرے انداز میں ادا کیا ہے :۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

یعنی انسان دونوں جہان حاصل کر لینے کے بعد بھی چین سے بیٹھنے والا نہیں۔ اس کی "جان بے تاب" کچھ اور چاہتی ہے اور وہ "کچھ اور" کیا ہے۔

یزدان پاک ــــ پھر یزدان پاک" تو کبھی ختم ہونے والا سفر ہی نہیں۔ اس کو رومیؒ نے کہا ہے

اے برادر بے نہایت در گہیست　　ہر چہ بر دے می رسی آنجا مایست

اے بھائی اس درگاہ کی تو کوئی حد و نہایت ہی نہیں۔ جہاں بھی تو پہنچے ٹھہرنے کا کوئی مقام نہیں۔ آگے ہی آگے بڑھے جا۔ اقوام عالم میں جو قوم اور افراد انسانی میں جو فرد کسی ایک مقام پر پہنچ کر رک جائے اس کی آگے بڑھنے کی خواہش ختم ہو جائے تو یہ نہ سمجھو کہ اسے اس مقام پر قرار و تمکن حاصل ہو جائے گا۔ نہیں نہیں۔ ؏

"سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں"

بڑھنا ہے تو بڑھتے ہی چلے جاؤ۔ نہیں بڑھو گے تو صرف رک نہیں جاؤ گے۔ گر جاؤ گے

پامال ہوجاؤ گے۔ ختم کردئیے جاؤ گے۔ ایک حال پر جمے رہنا جمادات کی فطرت تو ہوسکتا ہے، انسان کی فطرت یہ نہیں ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اور احکام الٰہی سراسر حرکت وعمل پر مبنی ہیں۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ: انسان کے لیے یہاں کوئی دستر خوان بچھا بچھایا موجود نہیں ہے کہ بیٹھے اور کھانا شروع کر دے۔ اسے تو اپنے دستر خوان کا انتظام اوّل سے آخر تک خود کرنا ہوگا۔ فرد ہو یا قوم قرآن اور فطرت کا اس سے یہی مطالبہ ہے کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ ہیں وہ پانچ صفات جو اقبال ہر بالغ مسلمان میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہی کے حصول سے ہم سچے مسلمان، صحیح انسان اور حقیقی خادم ملک وملت ہوسکتے ہیں۔ ان کے بغیر ہماری اسلامیت اور انسانیت (معاف فرمائیے) محض نام کی چیزیں ہیں، آؤ ایک دفعہ پھر اس شعر کو پڑھیں:

چہ باید مرد را؟ طبع بلندے۔ مشربِ نابے
دل گرمے۔ نگاہِ پاک بینے۔ جانِ بےتابے

اقبالؒ اور ہنگامِ سحر ★

برون زیں گنبد دربستہ پیدا کردہ ام راہے
کز اندیشہ برتر می پرد آہِ سحر گاہے

مذہب یا خدا کے پرستار عموماً تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں :

(۱) وہ جو رسماً یا وراثتاً کسی مذہب کے قائل یا کسی حد تک عامل بھی ہوتے ہیں۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ عقل و تجربہ کی میزان میں ان کا یا ان کے عقیدہ و عمل کا کیا وزن ہے۔ بقول قرآن حکیم :

قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۵ : ۱۰۴) -

(کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس رسم و عمل کا پابند پایا وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا جاہل مطلق اور ہدایت سے یکسر محروم ہی رہے ہوں)

(۲) وہ جو سوچ سمجھ کر کسی عقیدہ و عمل کو قبول کرتے ہیں۔ وہ باپ دادا کی نقالی نہیں کرتے۔ بقول غالبؔ :

با من میاویز اے پدر — فرزند آزر را نگر !!
ہر کس کہ شد صاحب نظر — دینِ بزرگان خوش نہ کرد

ایسے لوگ کسی بات کے ردّ و قبول میں دلیل و برہان کی روشنی کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔

(۳) وہ جو دلیل برہانی سے گزر کر تجربہ و وجدان اور عرفان و ایقان کی سرحد میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کا ایمان و یقین سماعی، تقلیدی، بلکہ برہانی سے آگے وجدانی و عرفانی ہو جاتا ہے۔ پیر رومؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مفہوم کو ایک بلیغ و عمیق شعر میں ادا کیا ہے :

★ یہی مضمون فیض الاسلام، راولپنڈی کے اپریل ۱۹۸۰ء کے شمارے میں "اقبال اور آخر شب" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

تالبِ بحر ایں نشانِ نقش پاست　　گر بہ بحر آئی نشانِ پا کجاست

یعنی استدلال کی قدر و قیمت رہرو کے نقوشِ قدم کی سی ہے جو پیچھے آنے والوں کو راستہ بتاتے ہیں:

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

پھر جب مسافر دریا میں شناوری کرنے لگتا ہے تو نقوشِ پا یعنی دلائل پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اب وہ براہِ راست اپنی منزل سے واصل ہے۔

ہر وہ شخص جو سوچ سمجھ کر کسی دین کو قبول کرتا ہے ان راہوں سے گزرتا ہوا کبھی بہ نظر تحقیق کفر و الحاد کی وادیوں میں بھی جادہ پیمائی کرتا ہے۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام نے اپنے حالات میں لکھا ہے:

"گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد ــــ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو۔"

حق گوئی کی کتنی بڑی جرأت ہے!

علامہ اقبالؒ بھی قسام ازل سے سوچنے سمجھنے والا دماغ لے کر آئے تھے۔ ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام لینا تھا کہ وہ شکوک و شبہات میں گرفتار سوچنے سمجھنے والے دماغوں کی رہنمائی کریں۔ اپنے تجربات کی روشنی سے ان کی راہوں کی تاریکیاں دور کریں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

پیچ و تابِ رازی سے مراد وہی دلیل و برہان کی راہ ہے جس میں کوئی گر گیا اور کوئی خوش قسمت منزل تک پہنچ گیا۔ اور سوز و ساز وجدان و عرفان کا ماحصل ہے۔ اس شعر میں "راتیں" کا لفظ غور طلب ہے۔ رات کی تنہائی و یکسوئی اس راہ کے سالکوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر گرہ کشائی نہیں ہو سکتی۔ سورۂ مزمل کا آغاز "قم الیل" سے اس پر نص۔ صریح ہے۔

علامہ کے عمیق ذوقِ قرآن اور عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیضان ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ آغوشِ وحی کا پروردہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شب بیداری اور سحر خیزی قرآن حکیم ہی کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ ہمارے قدیم بزرگ اسی صراطِ مستقیم پر چل کر منزلِ حقیقت تک پہنچے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو ملک نیمروز (سجستان) کے بادشاہ نے اپنے

ہاں تشریف لانے اور شاہی مراعات سے بہرہ مند ہونے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں صرف ایک شعر لکھ دیا:

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب　　من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

یہ ملک نیم شب یعنی دولتِ شب خیزی ایک عظیم تجرباتی کیفیت و لذت ہے جو حرف و صوت اور تقریر و تحریر کی گرفت میں نہیں آسکتی:

"ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی"

ایک بزرگ فرماتے ہیں:

اللیل للعاشقین ستر　　یالیت اوقاتہ تدوم

(رات عاشقوں کے لیے خلوتِ وصال ہے۔ اے کاش ان ساعتوں کو دوام حاصل ہوتا۔)

اس موقع پر مولانا جامی یاد آرہے ہیں:

شب آمد ساز گارِ عشق بازاں　　شب آمد راز دارِ عشق بازاں

ازاں بر روز شان شب اختیارست　　کہ آں یک پردہ در وایں پردہ دارست

(رات آگئی، اربابِ عشق کی چہیتی، رات آگئی — عاشقوں کی راز دار۔ یہ لوگ دن پر رات کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ پردہ در ہے اور یہ پردہ دار۔)

رات ہی کا وقت تھا جب شبانِ وادیٔ ایمن حضرت موسیٰ علیہ السلام روشنی کی تلاش میں نکلے تو یہ واقعہ پیش آیا:

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا (۱۹ : ۵۲)

(اور ہم نے ان کو (کوہِ طور کی) داہنی طرف سے آواز دی اور ہم نے انہیں راز و نیاز کی باتیں کرنے کے لیے اپنے قریب بلایا۔)

یہی مبارک وقت ہے جس کا ذکر اس مشہور حدیث میں ملتا ہے۔ "لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل" (اللہ تعالیٰ کی معیت میں مجھ پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے جس میں کسی مقرب فرشتے اور نبی۔ مرسل کی گنجائش نہیں ہوتی۔)

اللہ تعالیٰ اپنے بندے صلی اللہ علیہ وسلم کا محبّ بھی ہے اور محبوب بھی۔ اور اسی طرح وہ

پاک بندہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ذاتِ پاک کا محبّ و محبوب ہے۔

قرآن پاک میں شب بیداری و سحر خیزی کے متعلق جو ارشادات وارد ہوئے علامہ ان سے بغایت متاثر تھے۔ ان کی نظر میں تھا کہ: "اِن ناشئۃ الیل ھی اشد وطا و اقوم قیلا"

(بے شک رات کا اٹھنا قیام میں مضبوط تر اور قول میں درست تر ہے) یعنی شب بیداری میں قوتِ عملی مضبوط اور بات پُر تاثیر ہوتی ہے۔ یہی چیزیں ہیں جن کی اصلاحِ خلق کے لیے ضرورت ہے۔

علامہ دیکھتے تھے کہ مومنوں کی شان اور ان کے ظاہر و باطن کی تصویر کشی خود خالق جل شانہٗ کے قلم اعجاز رقم نے کس حسن و جمال سے کی ہے:

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۝ تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۳۲ : ۱۵ - ۱۷)

(آیاتِ قرآن پر ایمان لانے والوں کی شان یہ ہے کہ جب انہیں ان آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کے دیئے ہوئے رزق و مال سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی شخص نہیں جانتا جو آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی نعمتیں ان کے لیے چھپا کر رکھی گئی ہیں اور وہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔)

پیرِ روم اس آیت سے نور حاصل کرتے ہیں:

آں چناں گفت پیغمبر ز نور　　کہ نشانش آں بود اندر صدور

کہ نجاتی دارد از دارالغرور　　ہم انابت آرد از دارالسرور

حدیث کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ شب خیزی سے سینوں کے اندر ایک نور پیدا ہو جاتا ہے جس کا نشان یہ ہے کہ ایسا شخص دنیوی حرص و ہوا کے فریب میں نہیں آتا۔ اس سے مستغنی ہو کر آخرت کی دائمی مسرتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

بزرگانِ دین میں ایسے بے شمار اصحاب گزرے ہیں جن کی زندگیاں اس نور و استغنا کا زندہ ثبوت تھیں۔ قرآنِ حکیم ایک اور مقام پر اہلِ تقویٰ کی صفات بیان فرماتا ہے کہ وہ صابر، صادق، فرمانبردار خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے اور رات کے پچھلے حصّے میں توبہ و استغفار کرنے والے ہوتے ہیں۔

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝ (۳ : ۱۷)

اوپر کے چار مراتب بیان کرنے کے بعد یہ پانچواں مرتبہ ترقی کا آخری مرتبہ ہے، یعنی صبر و صدق اور قنوت و انفاق کے باوجود اپنے نفس پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ بلکہ پچھلی رات کی تنہائی میں استغفار کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔

حدیث میں وارد ہے کہ جب رات کا تیسرا حصّہ باقی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسماءِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ:

"کیا کوئی سائل ہے کہ میں اس کو عطا کروں؟"

"کوئی دعا کرنے والا ہے کہ اس کی دعا قبول کروں؟"

"کوئی استغفار کرنے والا ہے کہ اس کی مغفرت کروں؟"

اس سے مراد رحمت و فضل کی خاص تجلّی ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے قلب میں قوّت جاذبہ ہونی چاہیئے۔

حضرت خواجہ بہاءالدین نقش بند رحمۃ اللہ علیہ اس کیفیت کو ایک رباعی میں بیان فرماتے ہیں:

شب خیز کہ عاشقاں بشب راز کنند　　گرد در و بام دوست پرواز کنند
ہر جا کہ درے بود بشب بر بندند　　الّا درِ دوست را کہ بشب باز کنند

(رات اہلِ عشق کے لیے راز و نیاز اور قرب و وصال کا وقت ہے۔ رات کو ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لیکن خلوت حبیب کا دروازہ اسی وقت کھلتا ہے)

خلوت کے لفظ سے نظیری نیشاپوری کا الہامی شعر یاد آگیا:

آں را کہ برد بخلوت ناز　　اول درِ زاریش کند باز

رومیؔ فرماتے ہیں:

بے تضرع کامیابی مشکل است　　کامِ تو موقوف زاریٔ دل است

یہی بات علامہ کے تجربے میں آئی :

عطار ہو رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

سرکار روم ایک اور جگہ دل کھول کر کہتے ہیں :-

خواب را بگزار امشب اے پدر　　یک شبے در کوئے بے خواباں گزر

بنگر ایشاں را کہ مجنوں گشتہ اند　　ہمچو پروانہ بوصلش کشتہ اند

می رہند ارواح ہر شب زین قفس　　فارغان از حکم گفتار و قصص

شب ز زندان بے خبر زندانیاں　　شب زِ دولت بے خبر سلطانیاں

نے غم و اندیشہ سود و زیاں　　نے خیالِ ایں فلاں و آں فلاں

(اے بزرگ! کبھی بسترِ خواب سے اٹھ کر شب بیدار لوگوں کی خلوتوں میں ان کے ذوق و محویت کا مشاہدہ کرو۔ ان کو دیکھو کہ عشق و جنون کے غلبے سے پروانوں کی طرح آتشِ قرب میں کشتہ و سوختہ ہو رہے ہیں۔ ہر رات عالمِ مادہ اور عناصر کے پنجرے سے ان کی روحیں آزاد ہو جاتی ہیں۔ بات چیت قصہ کہانی اور امر و حکم سے بالکل فارغ ہو جاتے ہیں۔ رات قیدیوں کو قید خانے سے اور سلاطین کو دولت و حشمت سے بے خبر کر دیتی ہے۔ رات کو سود و زیاں اور من و تو کے اندیشے ختم ہو جاتے ہیں۔)

قرآن پاک نے شب بیداری اور سحر خیزی کے لیے مختلف الفاظ اور بے حد اثر انگیز اسالیب سے کام لیا ہے۔ کہیں فرماتا ہے۔ "اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝" (۱۷ : ۷۸)

"مشہود" کی تفسیر کیا ہے۔ اسی آیت سے آگے دو آیتوں کے فاصلے پر خود ہی بیان فرماتے ہیں :

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ" (۱۷ : ۸۲)

یعنی اس وقتِ خاص میں جاگ کر قرآنِ حکیم کی تلاوت کرنے سے شفاء، رحمت، توفیق اور سکینت قلب آموجود ہوتی ہیں۔

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر "کشف الاسرار" میں فرماتے ہیں:

"خنک بر آن بندگان کہ بوقت سحر استغفار کنند و شراب مہر بجام عشق وقت سحر نوش کنند۔[1]

"اے محمدؐ! اگر خوش نودی ما می خواہی برود رسالت می گزار و اگر مقام محمود خواہی بشب

۱۔ ج ۱۵، ص ۶۲۳۔

بیدار باش و نماز کن"۔ [۲]

آیتِ فجر ہی کا دوسرا حصّہ ہے: وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ق (۱۷: ۷۹)
(اور رات کے خاص حصّے میں تہجّد پڑھا کرو، یہ تمہاری خاص فضیلت ہے)

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ رات کے آخری حصّے میں اللہ تعالیٰ بندے سے نہایت قریب ہوتا ہے۔

بے شک رات میں ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ اس وقت بندہ اللہ تعالیٰ سے جو خیر بھی طلب کرتا ہے وہ عطا فرماتا ہے۔

"ایک اور حدیث میں ہے کہ قیام الّیل کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ یہ صالحین کا شیوہ ہے۔ جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ تمہارے لیے قربِ ربانی کا ذریعہ ہے۔ اس سے برائیاں دور اور گناہوں سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے"۔ [۳]

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری اپنی بے نظیر تفسیر میں لکھتے ہیں:

"رابعہ عدویہ رات بھر جاگتیں۔ دل کی حفاظت کرتیں۔ جب صبح صادق ہوتی تو یہ اشعار پڑھتی تھیں:

یا نفس قُومی فلقد نام الوریٰ | ان تفعلی خیراً فذوالعرش یریٰ !
وانتِ یا عین اہجری طیب الکریٰ | عند الصباح یُحِبُّ القوم اسریٰ

"اے نفس! جاگ جب کہ سب لوگ سو رہے ہیں۔ اس وقت اگر تو کوئی عمل خیر کرے گا تو یقین کر کہ صاحبِ عرش دیکھ رہا ہے۔ اور اے آنکھ! تو نیند کی لذّت کو ترک کر۔ یہی سہانا وقت ہے جب لوگ سفر کرنا پسند کرتے ہیں"

حضرت شیخ الاسلام تہجد سے حاصل ہونے والے مقامِ محمود کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ خود انہی کے وجد آور الفاظ پیش کرنے کو جی چاہ رہا ہے:

"وقیل المقام المحمود ھو المجالسة فی حال الشھود۔ مقام محمود خاصۂ مصطفیٰ است (ص) در خلوت 'او ادنیٰ'، بر بساط انبساط، در خیمۂ 'ھو معکم'، بر سریر اصطفا شراب

۲۔ ایضاً [۳]۔ "حجۃ اللہ البالغہ"، ج ۲، بیان نوافل۔

"نحن اقرب"، بجام قدس نوشیدہ و خلعت وصال پوشیدہ و بدست "لم یزل" رسیدہ"

چار پانچ سطور اور دیکھ لیجئے :

"پیرِ طریقت گفت۔ الٰہی بہر صفت کہ ہستم برخواست تو موقوفم، بہر نام کہ مرا خوانند بہ بندگی، تو معروفم تا جان دارم رخت ازیں کوی برندارم۔ او کہ تو آن اوئی بہشت او را بندہ است۔ او کہ تو در زندگانیٔ اوئی جاوید زندہ است۔ الٰہی گفت تو راحت دل است و دیدار تو زندگانی جان، زبان بیاد تو نازد و دل بمہر و جان بعیان"۔[۴]

ان عبارتوں کے ترجمے میں وہ روح تو پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو اصل متن میں ہے۔ تاہم کچھ خلاصہ یہ ہے : مقامِ محمود کی شرح یہ کی گئی ہے کہ وہ ہم نشینی ہے دیدار اور مشاہدہ کی حالت میں۔ مقامِ محمود حضور (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا خاصہ ہے، یعنی کوئی دوسری بڑی سے بڑی ہستی اس میں آپ کی شریک نہیں۔ اس کا تعلق سورۂ نجم کی آیت "او ادنی" سے ہے۔ "او ادنی" کی شرح سے یہ بندۂ عاصی جو آپ کے سامنے حاضر ہے، قاصر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ بڑے بڑے مفسّروں کو بھی اس مقام پر قاصر ہی پایا۔ عاجز راقم کی تو کوئی ہستی ہی نہیں۔ اس موقع پر ایک بزرگ کا یہ واصلانہ شعر یاد آرہا ہے :

رشک آیدم وگرنہ نقاہت کشودمی دست تر گرفتہ بعالم نمودمی !

آیئے پھر شیخ الاسلام کے مفہوم کی طرف۔ بتا رہے ہیں کہ مقامِ محمود کیا ہے۔ یہ خیمہ معیتِ الٰہی میں برگزیدگی کے تخت پر رسائی کا نام ہے۔ جہاں آں حضور صلی اللہ علیٰ وسلّم نے ساغرِ قدس میں بادۂ قرب نوش فرمایا، خلعتِ وصال زیبِ تن کیا اور ابدی محبوب کی ہم بزمی سے لذت یاب ہوئے۔ اس کے بعد پیرِ طریقت کی باری آتی ہے۔ وہ عرض کرتے ہیں : الٰہی ! میں جس صفت سے بھی موصوف ہوں تیری مشیت کے سہارے قائم ہوں۔ کسی نام سے بھی مجھے پکارا جائے تیری ہی بندگی سے معروف ہوں۔ جب تک جسم میں جان ہے تیرے ہی در پر پڑا رہوں گا۔ وہ شخص جس کا تو ہو جائے بہشت اس کا غلام ہے۔ جس کی زندگی میں تیری شمولیت ہوئی وہ زندۂ جاوید ہو گیا۔ الٰہی تیری بات دل کی راحت، تیرا دیدار جان کی زندگی، زبان تیرے ذکر پر نازاں، دل تیری محبت میں اور جاں ملاقات میں سرشار۔

۴۔ ج ۵، ص ۶۲۳ - ۶۲۴ -

رومی فرماتے ہیں :

آدمی دید است باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

سکھ دور کے پنجابی شاعر عارف ہاشم شاہ یاد آگئے :۔

دل توہیں، دلبر بھی توہیں، میرا وید توہیں دُکھ تیرا

نین پران حیاتی توہیں اک حرف نہیں وچ میرا

اگر اس کا ترجمہ کروں گا تو اس کی جان ہی نکل جائے گی۔ تاہم جو کچھ ہو سکے حاضر ہے :۔

دل تو ہے، دل رُبا بھی تو ہے، میرا طبیب تو ہے، مجھے دُکھ بھی تیرا ہی ہے۔ آنکھیں اور اعضاء، ہاتھ پیر اور زندگی سب کچھ تو ہی ہے۔ اس پوری داستان میں ایک حرف بھی میرا نہیں۔

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہوں یا پیرِ رومی یا سید ہاشم شاہ۔ یہ سب ندیاں وحی ربانی ہی کے منبع سے نکلتی ہیں۔

"قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہِ رب العالمین"۔ (کہہ دیجئے کہ میری نماز عبادات، زندگی اور موت سب اللہ ہی کی چیزیں ہیں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔)

قرب و معیت کی بات چل رہی تھی تو علامہ کے محبوب صاحبِ دل شاعر مرزا بیدل عظیم آبادی کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں :

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما

چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنار ما بکنار ما

اب اس کی شرح نہ پوچھیے۔ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسی پر قیاس کر لیجیے۔

ایک اور واصل بزرگ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے :

اتحاد لیست میانِ من و تو　　من تو نیست میانِ من و تو

رومی اس مقام پر پہنچ کر آواز دیتے ہیں :

اتصالے بے تکیف، بے قیاس　　ہست رب الناس را با جان ناس

اس کے ساتھ اعترافِ عجز بھی کرتے ہیں :

اے برون از وہم قال و قیل من　　خاک بر فرق من و تمثیل من

حقیقت یہ ہے کہ یہ داستانِ جمیل اتنی طویل ہے کہ بقول قرآن حکیم تمام روئے زمین کے درخت قلم بن جائیں اور ان کے لیے سات سمندر روشنائی کی دوات کا کام دیں، پھر سات سمندر اور بھی ان میں شامل کرلیں تو بات وہاں سے آگے نہیں بڑھے گی۔ جہاں کھڑے ہو کر شیخ شیراز نے دست بستہ عرض کیا تھا:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

گر کسے وصفِ او ز من پرسد　　بیدل از بے نشان چہ گوید باز
عاشقانِ کشتگان معشوقند　　برنیاید ز کشتگان آواز

علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ان کے ربط و معیت الٰہی سے متعلق اشعار کا انتخاب کیا جائے تو بہت بڑا ذخیرہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس فرصت میں، میں اپنے عنوان کی مناسبت سے ان کے اعمال و اشغال اور کیفیت و سرشاری کے متعلق اپنی تلاش و تحقیق کا خلاصہ پیش کرتا ہوں اس سے معلوم ہوگا کہ وہ صرف شاعر یا صرف فلسفی یا صرف قانون دان اور سیاست فہم ہی نہ تھے۔ بلکہ اس سے ماوراء بھی بہت کچھ تھے۔ اور سچ پوچھیے تو ان کی یہی ماورائیت، ان کی شاعری، ان کے فلسفے اور ان کی فکر و سیاست پر چھائی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے کا حق دراصل کسی ایسے ہی شخص کو پہنچتا ہے جو ان تمام علوم پر حاوی ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی صاحب کیف و حال بھی ہو اور یہ بندہ بلا انکسار کچھ بھی نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ:

پائے ملخے پیشِ سلیمان بردن　　عیب است ولیکن ہنر است از موے

میرے معروضات مربوط و منظم نہ ہوں تو ان کے لیے پہلے سے ہی علامہ کے الفاظ میں معذرت طلب کرتا ہوں:

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سحر کا وقت شب و روز کے تمام اوقات میں منتخب اور اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وقت ہے جب کتابِ ہستی کا ایک ورق ختم ہونے اور دوسرے کے آغاز کی تیاری ہوتی ہے۔

علامہ فرماتے ہیں:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ عمر بھر اس اذانِ سحر کے منتظر رہے جو گوشِ عالم نے صرف ایک مرتبہ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے ریگ زاروں میں سنی۔ اس کے بعد یہ زمین اس آواز کو ترس گئی اور علامہ کی زبان سے فریاد ہوئی:

قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات
کیوں نہیں ہوتی سحر حضرتِ انساں کی رات؟

علامہ وقتِ سحر کے لمحہ قبولیت کے عاشق تھے۔ وہ جہاں بھی ہوتے، سفر ہو یا حضر، اس کی جدائی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ وہ برق و بخارات کا ملک جہاں سے ہمارے نونہال فسق و الحاد کی سوغات لے کر آتے ہیں۔ علامہ وہاں بھی اسی محبوبہ کی آغوش میں تسکین حاصل کرتے ہیں:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی !
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

یہ گرم گرم لحافوں میں غفلت کی نیند میں سونے کا وقت اور یہ رغبت الی اللہ "تتجافیٰ جنوبہم عن المضاجع" کی عملی تفسیر ہے۔ یہی وقت ہے جب باہر کے دروازے بند ہوتے ہیں اور اندر کے دروازے کھلتے ہیں۔ رقت و گداز کے ساغر لنڈھائے جاتے ہیں:

سحر در شاخسار بوستانی — چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانی
بر آور ہر چہ اندر سینہ داری — سرودی، نالہ، آہی، فغانی

اس ساعتِ حسین و جمیل کی نزاکت آج تک کسی بھی شاعر کے خیال میں کہاں آئی ہوگی۔ آئیے علامہ کی فکر نکتہ رس سے سنیں:

مانند سحر صحن گلستان میں قدم رکھ　　آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے

سبحان اللہ! کیا "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کا منظر ہے!

وہ اس عصرِ بے روح کو اپنی سحر کے پیغام سے زندہ کرنا چاہتے تھے، یعنی وہ فیضانِ سحر کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ اس دور کی بے جان مذہبی قیادت کو مخاطب فرماتے ہیں:

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال

تری اذاں میں نہیں ہے میری سحر کا پیام

"گلشنِ رازِ جدید" میں قدیم و حادث کے متعلق فلسفہ آمیز تصوّف کے انداز میں محبّ و محبُوب کی جدائی کی حکمت بیان فرماتے ہیں:

فراق او چناں صاحب نظر کرد　　کہ شامِ خویش را بر خود سحر کرد

یعنی اگر انسان وصال کی لذّت میں مست و سرشار اور محو و غرق ہو جاتا تو یہ سعی و جہد، یہ محنت و کاوش جو بے شمار ظلمتوں کو چیرتی ہوئی بے شمار صبحوں کو نمودار کرتی جاتی ہے، ظہور میں نہ آتی۔ انسان اوّل کو دیکھیے اور آج کے انسان کی ایجادات و اکتشافات پر نظر ڈالیے اور پھر آئندہ زمانوں کی رفتارِ ارتقاء کا اندازہ لگائیے۔ ان تمام کائناتی تغیرات کو جو انسان کے ہاتھوں رونما ہو رہے ہیں صرف ایک شام و سحر میں شاعرِ عارف نے سمیٹ لیا ہے:

کہ شامِ خویش را بر خود سحر کرد

خواجہ حافظ بھی قرآنِ حکیم کی رہبری میں صبح سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔ لیکن صرف اپنی ذات کے لیے:

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ　　ہر چہ کردم ہمہ از دولتِ قرآن کردم

علامہ بھی قرآن ہی کی خلوت میں گوشہ گیر ہوتے ہیں اور وہاں سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس کو پوری امّت میں تقسیم کر دیتے ہیں:

ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم　　سحر کردم صد و سی سالہ شب را

غلامی کی طویل رات جو مسلم حکومت کے انتزاع سے قوم پر محیط ہو گئی تھی، اس کو صبح کی

روشنی میں تبدیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے صحیفۂ نور قرآنِ حکیم سے نور حاصل کرتے ہیں۔

محض مادیت کی ترقی انسان کے لیے ــــ جو محض مادہ نہیں بلکہ روح بھی ہے کافی نہیں ۔ اس سے اس کی مشکلیں حل نہ ہوں گی۔اس کی تاریک رات میں سحر کا نورانی چہرہ نظر نہیں آئے گا آہ یہ بزعم خود ترقی یافتہ انسان!

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

حضرت علامہ مادی ترقی کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن اسی پر قناعت کر لینا اور زندگی کے دوسرے زیادہ اہم اور جاودانی پہلو سے بے نیاز رہنا محض شب پرستی اور سحر دشمنی ہوگی:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کی سحر کر

ہر شب کے بعد سحر کا نمودار ہونا فطرت کا ایسا تقاضا ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا یہ ہو کر رہتا ہے اور ہو کر رہے گا۔اس کے بغیر انسان اپنے فطری نصب العین سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔

علامہ خواص و عوام کو عموماً اور خاص خاص گروہوں کو خصوصاً جھنجھوڑتے ہیں۔رات کی ظلمت سے نکال کر سحر کی روشنی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ وہ خود پنجاب کے باشندے تھے۔اپنے قرب وجوار میں دہقانوں کی اکثریت کے غیر مختتم جمود کو دیکھتے تھے۔ ایسا جمود جس میں گرفتار لوگ خود بھی اپنے جمود سے آگاہ نہیں تھے اور اپنی خاک بازی پر قطعی طور پر قانع ہو چکے تھے۔ علامہ ایک مختصر نظم میں اس طبقے کو جامع پیغام دیتے ہیں۔اس کے دو شعر سن لیجیے:

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز — ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ — سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ

مسلمان کو جگانے کے لیے صرف سحر کافی نہیں، اذانِ سحر کی بھی ضرورت ہے۔ اس نکتے پر علامہ کے سوا کس کی نگاہ پہنچ سکتی تھی؟

فرزندِ صحرا کو ترکِ قعود و جمود اور ترغیبِ قیام و خرام دیتے ہوئے سحر ہی کی طرف متوجہ

فرماتے ہیں :

سحر گاہاں کہ روشن شد در و دشت　　صدا زد مرغے از شاخِ نخیلے
فروہل خیمہ اے فرزند صحرا　　کہ نتواں زیست بے ذوق رحیلے

لاہور کی سابق میورروڈ (اور اب اقبال روڈ) کی جاوید منزل میں نہیں، کسی لق و دق صحرا میں کوئی دردمند تنہا پکار رہا ہے۔ صبح پھوٹ رہی ہے۔ کھجور کے صرف دو ایک درخت اور دو ایک خیمے اور بس۔ یہ منظر کتنا دلکش و دل کشا ہے جو اس قطعے میں پیش کیا گیا ہے۔

شاعرِ عارف اپنی حیات افروز دعوت کے لیے یہی مبارک وقت انتخاب کرتے ہیں اور اس سے معجزانہ توقع رکھتے ہیں :

کیا عجب میری نواہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش جو تری خاک میں ہے

ان کے سینے میں ایک دردِ لازوال ہے جو لمحہ بہ لمحہ کئی روپ اختیار کرتا ہے :

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

یہ مہجوری کیا ہے ؟ اس عظمت و شوکت سے مہجوری جو اسلام نے بادیہ نشینوں کو بخشی۔ پھر جہاں جہاں اسلام کے نام لیوا گئے وہی شانِ جلال و جمال ان کے ہم رکاب رہی۔ اس تشریح کی تائید اسی نظم کا دوسرا شعر کر رہا ہے :

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

حکیم سنائی غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا :

مردگی جہل و زندگی دین است　　ہرچہ گفتند مغز آں این است

قرآنِ حکیم نے بھی بار بار غیر دینی زندگی کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۲۷ : ۸۰) (تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔ یعنی ان لوگوں کو جو عقل و شعور سے کام نہیں لیتے)
وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ

مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (۳۵ : ۲۲)۔ (زندے اور مُردے برابر نہیں ہو سکتے۔ خدا جسے چاہتا ہے سنا (سمجھا) دیتا ہے اور اے رسولؐ! جو قبروں میں ہیں انہیں تم نہیں سنا (سمجھا) سکتے) یہاں علماء نے مُردوں اور قبر والوں سے مراد کفار لیے ہیں اور زندوں سے مراد اہل ایمان جیسا کہ اس آیت میں ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳۶ : ۶۹-۷۰)۔ (یہ کتاب تو نصیحت اور صاف صاف قرآن ہے تاکہ جو زندہ ہو تو اُسے عذاب سے ڈرائے اور کافروں پر عذاب کا قول ثابت ہو جائے) یہاں زندہ اس کو کہا گیا جو قرآن حکیم سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انکار کرنے والے کو کافر فرمایا ہے۔

مسلمان کے لیے دین ہی دنیوی خوش حالیوں اور اُخروی نعمتوں کا وسیلہ ہے۔ اس کے بغیر ظلمت ہی ظلمت ہے، جس میں روشنی کی کوئی کرن نہیں۔ جس کے خاتمے کی کوئی امید نہیں:

شبے کہ گورِ غریبان نشیمن است اورا   مہ و ستارہ ندارد چساں سحر گردد

نئی روشنی۔ جس سے ظاہر بیں آنکھیں ایسی چندھیا گئیں کہ ابدی حقائق ان سے اوجھل ہو گئے۔ در و بام اور کوچہ و بازار تو چمک اٹھے لیکن انسانیت کا اندروں نورِ سحر سے محروم، تاریک راتوں کا لامتناہی تسلسل بن گیا!

تجلی کہ بر و پیر دیر می نازد   ہزار شب دید و تاب یک سحر ندہد

''زبورِ عجم'' کا بیشتر حصہ عابد و معبود یا طالب و مطلوب کے مکالمات پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سی باتیں آ گئی ہیں جو شرح و ترجمہ کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ان کا تعلق باطنی احساس اور روحانی تجربات سے ہے:

پُرسید کسے کہ عاشقی چیست؟   گفتم کہ چو ما شوی بدانی!

جس نے کبھی عشق و فراق کی بے تابیوں کا مزا چکھا ہی نہیں، اس کو اس کی حقیقت سمجھانے کے لیے الفاظ کہاں سے لائے جائیں۔ بقول میر تقی:

گزری ہے جن کی عمر محبت کیے بغیر   وہ بدنصیب مر گئے گویا جیے بغیر

ایسے ہی ایک مقام سے علامہ کی یہ آواز آ رہی ہے:

شب من سحر نمودی　　کہ بہ طلعت آفتابی
تو بطلعت آفتابی　　سزد ایں کہ بے حجابی

آفتاب کے سوا کون ہے جو شب کو سحر بنائے اور آفتاب کے چہرے پر کون برقع ڈال سکتا ہے؟ یہاں بے ساختہ قرۃ العین طاہرہ یاد آگئی:

سحر آن نگار رستم گرم قدمے نہاد بہ بسترم
فاذا رایت جمالہٗ طلع الصباح کانما

علامہ کی لاہوتی نوا سے اگرچہ اس نغمۂ ناسوتی کو کوئی نسبت نہیں۔ لیکن سحر و صباح کی مناسبت سے یہ بھی سامنے آگیا۔

آخری عمر میں جب مختلف عوارض نے ان کے جسم کا محاصرہ کر رکھا تھا، ذہنی احساس اور فکری توانائی میں پہلے سے بھی زیادہ برتائی و براقی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ "ارمغانِ حجاز" میں "حضورِ رسالت" کے عنوان سے جو قطعات لکھے گئے ہیں وہ اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں۔ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں:

شب ہندی غلاماں را سحر نیست　　بایں خاک آفتابے را گزر نیست
بما کن گوشہ چشمے کہ در شرق　　مسلمانے زما بے چارہ تر نیست

ہندی غلاموں کی رات کو صبح بنانے کے لیے جس آفتاب کی ضرورت تھی وہ گوشہ چشم مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ کیونکہ:

"بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"

آج بھی ہماری بے شمار مشکلات کا حل یہی ہے۔

علامہ نے اپنی شاعری کا آغاز "بانگِ درا" سے کیا۔ "بانگِ درا" کیا ہے؟ خواب کو بے داری کا، سکون کو حرکت کا، قعود کو قیام اور پھر تیز قدم چل پڑنے کا پیغام و اعلان۔ انہوں نے شروع ہی سے اپنی شاعری کا مقصد متعین کر لیا تھا کہ قوم کو میٹھی لوریاں دے کر سلانا نہیں بلکہ اس قافلے کو اٹھا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں کرنا ہے جیسا کہ انہوں نے کہا:

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا　　ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

یہی فریضہ وہ عمر بھر انجام دیتے رہے جیسا کہ فرماتے ہیں :

صبح دمید و کارواں کرد نماز و رخت بست
تو نشنیدۂ مگر زمزمۂ درائے را

ان کی صبح نماز سے شروع ہوتی ہے۔ ان کا قافلہ روانگی سے پہلے نماز ادا کرتا ہے۔ وہ تنہا روی کے قائل نہیں۔ بلکہ ایک کارواں کی صورت میں ایک نقطۂ نگاہ اور ایک متفقہ منزل کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

کبھی وہ امتِ مسلمہ کی گذشتہ پُر جلال صبحوں کو حال بنا کر سامنے لے آتے ہیں، تاکہ قوم اپنے ماضی کا عرفان حاصل کر کے مستقبل کو تابناک بنائے۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے مزار پر پہنچ کر اپنے ماحول سے الگ ہو کر، اس دورِ قدیم کا چشمِ تصور سے مشاہدہ کرتے ہیں :

وا رہیدم از جہاں چشم و گوش　　فاش چوں امروز دیدم صبح دوش

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کا جسم لاہور میں اور روح حجاز میں نغمے بکھیرتی رہتی تھی :

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

"نغمہ ساربان حجاز" یعنی "حدی" کے عنوان سے ایک نہایت دل کش اور مترنم نظم میں جابجا صبح کی تجلّیاں بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ ساربان اپنی ناقہ، سیّار و تیز رفتار سے کہہ رہا ہے :

سوز تو اندر زمام　　ساز تو اندر خرام　　بے خورش و تشنہ کام
پا بہ سفر صبح و شام　　خستہ شوی از مقام　　تیز ترک گام زن
منزلِ ما دور نیست

شام تو اندر یمن　　صبح تو اندر قرن　　ریگ درشت وطن
پائے ترا یاسمن　　اے تو غزال ختن　　تیز ترک گام زن
مہ ز سفر پا کشید　　در پس تل آرمید　　صبح ز مشرق دمید
جامہ شب بر درید　　باد بیابان وزید　　تیز ترک گام زن
منزلِ ما دور نیست

اقوامِ سرحد کو خطاب کرتے ہوئے سچے مسلمان کے اوصاف بیان فرماتے ہیں۔ اس طویل نظم کے ایک شعر میں مسلمان کی صبح کا ذکر آ گیا ہے:

صبح از بانگے کہ برخیزد زجان　　نے ز نور آفتاب خاوران

اس کی صبح آفتاب مشرق کی روشنی کا انتظار نہیں کرتی بلکہ اس کے اندر سے اللہ اکبر کی آواز اس کو صبح خیزی کا پیغام دیتی ہے۔ یعنی دینی امر و نہی اس کی سرشت بن جاتے ہیں۔ اسے ان کی تعمیل میں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوتا۔

دیارِ غزنین میں ایک مردِ شوریدہ کی مناجات میں عہدِ حاضر کے مسلمان کی نامسلمانی کا مرثیہ لکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی نشاۃِ ثانیہ کی التجا کی گئی ہے:

باز جذب اندروں او را بدہ　　آں جنونِ ذوفنوں او را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار　　صبح فردا از گریبانش برآر

علامہ امید رکھتے ہیں کہ صبح فردا یعنی مستقبل کی روشنی اسلام اور اسلامی احکام کی تعمیل پر منحصر ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آبادی کے اضافہ در اضافہ سے چھوٹی بستیاں بڑے بڑے شہروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی نسبت سے جرائم و حوادث میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دیانت و امانت اور شرافت و اخلاق قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔ مدعیانِ اصلاح ذاتی اصلاح سے بے نیاز اور کرسی نشینانِ عدل ظلم کی سوداگری سے نفع اندوز ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی مردِ صحرائی نمودار ہوتا ہے اور آوازۂ حق بلند کرتا ہے:

اے شیخ بہت اچھی کالج کی فضا لیکن　　بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

ایسی تاریک راتوں کا خاتمہ کرنے والی صبح شہروں سے نہیں کوہ و صحرا سے جلوہ گر ہوتی ہے:

دراں شب ہا خروش صبح فرداست　　کہ روشن از تجلّی ہائے سیناست
تن و جان محکم از بادِ در و دشت　　طلوع امتاں از کوہ و صحراست

"ارمغانِ حجاز" کے دور میں ان پر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ موجودہ مسلمان کی بے راہروی سے

مایوس ہوکر ایک دوسری امت کی آرزو کرتے جو اسلام کی حقیقت کو سمجھے اور اس پر عمل پیرا ہو۔

ان کے دل سے آواز اٹھتی:

بیا نقش دگر ملت بریزیم　　　　که این ملت جہاں را بار دوش است

یہ ملت تو دنیا کے لیے دوش بن گئی ہے۔ اس کی جگہ نئی ملت اور نئی قوم ہونی چاہیئے:

دگر قومے کہ ذکر لا الٰہش　　　　برآرد از دل شب صبح گاہش

ایک ایسی قوم جس کا ذکر لا الہ الا اللہ یعنی اتباعِ قانون خداوندی سے سیاہ کاریوں کی رات کا تابندہ کردار کی صبح سے خاتمہ کردے۔

یہی زمانہ تھا جب ہندو کانگرس انگریز سے برسرِ پیکار تھی اور مسلمان آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ احرار، خاکسار، نیلی پوش، مسلم لیگی اور کانگرسی مسلمان ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے تہمت طرازیاں، الزام تراشیاں اور شخصی حملوں تک سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے جلسوں کو خراب کرتے تھے۔ اختلاف ہندوؤں میں بھی تھا۔ لیکن گاندھی، پنڈت، مالوی، ٹیگور، سپرو وغیرہ مختلف مسالک کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے، بلکہ اپنی اپنی حدود میں رہ کر تعاون میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ کسی کے خلاف کوئی نازیبا کلمہ زبان وقلم سے نہیں نکالتے تھے۔ لیکن صاحبِ خلقِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ اپنی ہی قوم کے ذہن کی ترجمانی کر رہا تھا۔ علامہ ایسے حالات دیکھتے اور رکڑھتے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ "ان مختلف جماعتوں کے لیڈروں کو اپنے ہاں بلائیے اور سمجھائیے کہ یہ تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے؟ خدا را اس جنگ آرائی کو چھوڑ کر اجتماعی مفاد کے لیے متحد ہو جائیے۔" میری عرض کے جواب میں آپ نے فرمایا: "ایسی میٹنگ شیخ صادق حسن (صدر، مسلم لیگ، امرتسر) کے ہاں ہونی چاہیئے۔" میں نے عرض کیا: "شیخ صادق حسن کا کیا اثر ہے؟ وہ اس اہم خدمت کو انجام نہیں دے سکتے۔" مکرر فرمایا: "میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

اس مختصر اور بلیغ جواب کی تشریح کرنا اس صحبت میں مناسب نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے فہم کے مطابق اس کا مطلب نکال سکتا ہے۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے وہ دور بھی گزر چکا تھا جب سلطان عبد العزیز ابنِ سعود والیٔ حجاز بنا اور اس نے قبہ شکنی کی مہم سے عموماً عالمِ اسلام میں اور خصوصاً برصغیر میں ایک عظیم ہنگامہ برپا کر دیا۔ حنفی، وہابی، شیعہ، سُنّی، اہلِ حدیث وغیرہ میں سخت کش مکش شروع ہو گئی۔ مسلمان سلطان کے موافق و مخالف کی صورت میں دو متحارب گروہ بن گئے۔ یہ خانہ جنگیاں عہدِ غلامی کو طول دینے والی ثابت ہو سکتی تھیں۔ اسی دور میں علامہ کے دلِ دردمند سے یہ آواز اٹھی تھی:

اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰؐ انگریز　　سیاہ بخت مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی چیخ بھی سن لیجیے:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر　　مجھے تو ان کی بہبودی سے ہے یاس

اور حالی کا مسدس تو نرا مرثیہ ہی مرثیہ ہے۔

اسی پس منظر اور انہی اسباب و وجوہ نے اس قسم کے اشعار کہلوائے:

بیا نقشِ دگر ملت بریزم　　کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است

ان کی فکر برصغیر میں محدود نہیں تھی۔ وہ پورے عالمِ اسلام پر نظریں جمائے ہوئے تھے عرب، ترکیہ، ایران، افغانستان وغیرہ سب کو احیا و اعلاء کا پیغام ان کے کلام میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے خیالات کا زیادہ کھُل کر فارسی زبان میں اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اس دور کے افغان حکمران کو قرآن حکیم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

صد جہاں باقیست در قرآن ہنوز　　اندر آیاتش یکے خود را بسوز!

باز افغان را ازاں سوزے بدہ　　عصر او را صبح نو روزے بدہ

اس موقع پر ایک تجربے کی بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جب آپ کسی مصنف کا متن دیکھ رہے ہوتے ہیں تو براہِ راست آپ کے سامنے مصنف موجود ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کے شارح کی نکتہ آفرینیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ اوجھل ہو جاتا اور شارح سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً قرآنِ حکیم کی تلاوت کے وقت ایک صاحبِ خشوع و خضوع مسلمان اپنے آپ کو اللہ کے حضور میں تصور کرتا ہے۔ وہ اپنے محبوب و مطلوب، خالق و مالک سے شرفِ مکالمہ حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ رازی و زمخشری کی ورق گردانی کرتا ہے تو اس بارگاہ بلند سے اتر کر

اتر کر ان بزرگوں کی مجلس میں آجاتا ہے۔

میں نے اس مقالے کی تیاری میں کسی فاضل شارح سے استفادہ حاصل نہیں کیا۔ براہِ راست علامہ کی خدمت میں حاضر رہا اور میرے محدود علم و فہم نے جو کچھ اخذ کیا۔ اس کو سپردِ قلم کر دیا۔ بعض مقامات پر ان کی پروازِ فکر میری رسائی سے بہت بلند معلوم ہوئی۔ ایسے موقع پر ممکن ہے کہ میں ان کے حقیقی مقصد تک نہ پہنچ سکا ہوں۔ یہ ایک ایسی صحبت ہے جس میں یقیناً مجھ سے بہتر اقبال فہم اہلِ علم موجود ہیں۔ ان سے معذرت اور اعترافِ عجز کے ساتھ ایک ایسے ہی نازک مقام کی طرف اشارہ کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مثنوی "پس چہ باید کرد" میں "روح مومن" کی حقیقت بیان فرماتے ہیں۔ روح کسی کی بھی ہو اس کا بیان آسان نہیں، پھر روحِ مومن تو اور زیادہ عمق اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر عارفِ پنجاب حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا ہے:

"دل دریا سمندروں ڈونگھا کون دلاں دیاں جانے ہُو"

دل ایک دریا ہے جو سمندر سے بھی زیادہ عمیق ہے۔ اس کے عمق تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے؟ علامہ فرماتے ہیں:

سرِّ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست　　روحِ مومن ہیچ می دانی کہ چیست؟

مردانِ خدا پر اسرارِ خدائی کھول دیئے جاتے ہیں۔ مومن کی روح جس پر ان اسرار کا انکشاف ہوتا ہے، تم سمجھتے ہو کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک سوال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے:

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود　　عقدۂ خود را بدست خود کشود

افہام و تفہیم میں تشبیہہ و تمثیل کے بغیر چارہ نہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

روحِ مومن کو اس قطرۂ شبنم کی طرح سمجھو جس نے اپنے ذوقِ نمود سے اپنی گرہ خود ہی کھول ڈالی:

از خودی اندر ضمیرِ خود نشست
رخت خویش از خلوتِ افلاک بست

اسی ذوقِ نمود کا دوسرا نام خودی یا انا ہے جس سے وہ اپنے ضمیر تک پہنچتا ہے، یعنی خود شناسی یا اپنا عرفان حاصل کرتا ہے۔ اس کا اصلی مقام خلوتِ افلاک تھا۔ وہاں سے وہ قطرہ سفر کرتا، ہوا نیچے اترتا ہے لیکن وہ اپنی قطرگی یا انفرادیت کو قائم رکھتا ہے، اپنے آپ کو بحرِ بے کنار میں سپردِ صدف نہیں کر دیتا:

رخ سوئے دریائے بے پایاں نکرد　　خویشتن را در صدف پنہاں نکرد

وہ صبح کی آغوش میں دم بھر کے لیے تڑپتا ہے اور غنچۂ نومیدہ کے حلق میں ٹپک پڑتا ہے۔ شاید اس کا یہ مطلب ہے کہ مومن کی روح اپنے اضطراب و قلق کے لیے ہنگامِ صبح کو انتخاب کرتی ہے یہی وقت ہے جب اس کے باطن کی کلی شگفتہ ہوتی ہے اور پھر اس کی خوشبوئیں فضا کے عالم میں پھیلتی ہیں:

"یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا"

واللہ اعلم بالصواب

یہ تو تھا روحِ مومن کا عروج و نزول اور تمکین و تاثیر۔ اب آئیے اس طرف جہاں ایمان کے خورشید ظلمت ربا کی کوئی کرن نہیں پہنچتی۔ صبح تو وہاں بھی ہوتی ہے لیکن کیسی؟ اسی مثنوی میں "حکمتِ فرعونی" کے عنوان سے اس مفہوم کی مکمل تشریح فرماتے ہیں:

حکمتِ اربابِ دیں کردم عیاں　　حکمتِ اربابِ کیں را ہم بداں

یہ اربابِ کیں یعنی ایمان سے محروم قوم کیا ہے؟ اس سوال کا جواب طویل ہے۔ صرف دو شعر پیش کرتا ہوں:

ملتِ خاکسترِ او بے شرر　　صبحِ او از شامِ او تاریک تر

ایک ایسی جماعت جس کی راکھ میں کوئی چنگاری نہیں، جس کی صبح شام سے بھی زیادہ تاریک ہے — یہ اس لیے کہ:

ہر زمان اندر تلاش ساز و برگ　　کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

ہر وقت مادی آرائش و اسباب کی تلاش میں غرق۔ جسمانی لذات کی فکر میں مگن اور موت کے خوف سے لرزاں۔

دیکھا آپ نے ایمان کی صبح شاداب و تاباں اور کفر کی صبح تاریک و ترساں۔

اسی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں ایامِ عرب کی صبح یاد دلاتے ہیں:

با تو می گویم زِ ایامِ عرب　　تا بدانی پختہ و خامِ عرب

اندریں دیرِ کہن پیہم تپید　　تا جہانے تازہ آمد پدید

یہ مقدس جماعت دنیائے جدید کی خالق کہلائی۔ بقول حالی :

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے　　یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

اس موضوع پر مختلف زبانوں میں مبسوط کتابیں لکھی گئی ہیں۔ غیر مسلموں تک نے اعتراف کیا ہے کہ موجودہ علوم واکتشافات کے بانی وہی لوگ تھے جنہوں نے قرآن واسلام کی آغوش میں پرورش وتربیت حاصل کی۔ دنیا بھر میں جہاں حق وصداقت کی کوئی آواز اٹھی، اس کا آغاز اسی پاک سرشت جماعت سے ہوا

بانگِ حق از صبح خیزی ہائے اوست　　ہر چہ ہست از تخم ریزی ہائے اوست

انہی کی صبح خیزیوں نے آوازۂ حق بلند کیا۔ یہ جو کچھ آپ آج تہذیب وتمدن کی ترقیاں دیکھ رہے ہیں، اس کی تخم ریزی انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

ظاہر ہے کہ صبح کا وجود آفتاب سے ہے۔ وہ اسی منبع سے اپنا نور حاصل کرتی ہے۔ اسی لیے علامہ براہِ راست اس سے بھی خطاب فرماتے ہیں۔ ان کا نصب العین وہاں بھی انفرادی اکتساب نہیں ہے بلکہ اجتماعی تنویر ہے۔ مطلع ہے :

اے امیرِ خاور اے مہرِ منیر　　من کنی ہر ذرہ را روشن ضمیر

مہرِ منیر کی ضیا پاشیوں اور کارگزاریوں کی شرح وتفصیل بیان کرتے ہوئے صبح تک پہنچ جاتے ہیں:

خوش بیا صبحِ مرا آوردۂ　　ہر شجر را نخلِ سینا کردۂ

تو فروغِ صبح و من پایانِ روز　　در ضمیرِ من چراغے بر فروز

اپنے ضمیر کی چراغ افروزی سے کام لینا چاہتے ہیں :

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق　　بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

ایک نورانی انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں :

از نوائے پختہ سازم خام را　　گردشِ دیگر دہم ایام را

تان کہاں پر آکر ٹوٹتی ہے :

فکرِ شوق آزاد گردد از فرنگ   از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

دیکھا آپ نے کہاں سے چلے اور کہاں پہنچ گئے!

آزاد اور غلام کا فرق بتاتے ہوئے بہت سے نکتوں کی گرہ کشائی فرماتے ہیں۔ اس کے بھی دو شعر سُنیے:

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہ'   او نگنجد در جہانِ رنگ و بُو

صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ   آخرِ ما چیست؟ تلخی ہائے مرگ؟

آزاد کا ظرف و حوصلہ صرف حیاتِ مادی پر قانع نہیں:

طرح تو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم

این چہ حیرت خانۂ امروز فردا ساختی

وہ اس خدا کا بندہ ہے جس کی شان ہے وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ۔ اس کا تختِ عظمت تمام آسمانوں اور زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور غلام فرنگی کی غلامی سے نکلنے کی راہ نہیں پاتا۔ آج کہ ہم بظاہر ۲۷ برس سے آزاد ہو چکے ہیں لیکن ہمارے افکار و اعمال بدستور سابق فرنگی کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہی نظامِ تعلیم، وہی نظامِ عدل، وہی فیشن پرستی اور الحاد نوازی۔ انگریز ہماری صبحوں اور شاموں کو صرف دنیوی ساز و سامان اور نمائش کی فکر دے گیا ہے۔ ہمارا انجام کیا ہے؟ موت کی تلخیاں اور بس۔

آئیے اب ذرا لغت کی سیر کرلیں۔ عربی زبان میں آخرِ شب کے متعلق کئی الفاظ آئے ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور سحر، فجر، صبح اور غدوہ ہیں، جو قرآن حکیم میں استعمال کیے گئے ہیں۔ سحر رات کے آخری حصے کو کہتے ہیں یا صبح سے ذرا پہلے۔ امام راغب نے آخرِ شب کی تاریکی کو دن کی روشنی میں خلط ملط ہونے کے وقت کو سحر کہا ہے۔ "مصباح اللغات" نے السحر الاعلیٰ یعنی صبح کاذب والسحر الآخر یعنی صبح صادق لکھا ہے۔ صبح کے متعلق راغب لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت کا نام ہے جب افق طلوعِ آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو جائے۔ "مصباح" میں صبح کے معنی آدھی رات میں بیدار رہنا لکھے ہیں اور دن کے ابتدائی حصے کو بھی صبح کہا ہے۔ الفجر کے معنی پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں۔ اس وقت کو اس وجہ سے فجر کہتے ہیں کہ صبح کی روشنی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ علامہ

اپنی صبح کو تین یا چار بجے آخرِ شب سے شروع کرتے ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔ "صبح چار بجے، کبھی تین بجے اٹھتا ہوں، پھر اس کے بعد نہیں سوتا۔ سوائے اس کے کہ مصلّے پر کبھی اونگھ جاؤں۔"[۵] ایک دوسرے خط میں جو ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کو لکھا گیا ہے۔ مہاراجہ کو لکھتے ہیں: "انشاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کروں گا۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا۔ آج رمضان کی پہلی ہے۔ بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے۔ سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد بھی دعا کروں گا۔ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذّت حاصل ہوتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ دعا قبول ہو جائے۔"[۶]

ان چند سطور میں کتنی باتیں آگئیں:

(۱) صبح خیزی

(۲) شب خیزی

(۳) عبادت میں حصولِ لذّت

(۴) دعا پر اعتقاد

"اقبال اور دعا" کا عنوان ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ سر دست ایک شعر سُن لیجیے۔ دعا کی سرگوشیوں اور اطمینان بخشیوں کا تجربہ رکھنے والوں کے لیے اسی شعر میں کئی مقالے سما گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

بحرفے می توان گفتن تمنّائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

ایسا شعر صرف شاعری اور قافیہ پیمائی نہیں ہو سکتا۔ جب تک شاعر ذوقِ حضوری کی واردات سے نہ گزرا ہو۔ اس کے کلام میں ایسی دل کش و دل آرام واقعیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

دعا کے متعلق علامہ کے خیالات یا یوں کہیے کہ اکتشافات ایسے اہم و اخص ہیں کہ کم از کم میرے مطالعہ کی حد تک کسی محدّث، مفسّر یا صوفی کی تصنیف میں نہیں پائے جاتے۔ خطبات

۵۔ "اقبال کامل" ص ۷۳، بحوالۂ "مکاتیب شاد و اقبال"، ص ۱۹۔

۶۔ "اقبال کامل" ص ۸۵، بحوالۂ "مکاتیب شاد و اقبال"، ص ۷۳۔

میں ایک خطبے کا عنوان یہی ہے :۔" ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا" اس کی بعض سطور ملاحظہ ہوں :۔" سائنس کچھ بھی کہے مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے دعا یا عبادت کا سلسلہ بھی قائم رہے گا۔ اس فقرے میں اس حدیث کی روح بول رہی ہے : الدعا ، مخ العبادہ ۔ (دعا عبادت کا مغز ہے)

مزید فرماتے ہیں :" باعتبار نفسیات دعا یا عبادت ایک جبلی امر ہے۔ دعا کا مرتبہ غور و تفکر سے بہت بلند ہے۔ یہ بھی تفکر کی طرح تحصیل و اکتساب ہی کا ایک عمل ہے جو بحالتِ دعا ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے اور ایسی قوت و طاقت حاصل کر لیتا ہے جو فکر محض کو حاصل نہیں ۔ ۔ ۔ ہمارا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اگر خدا ہے تو ہمیں اس کی موجودگی کا حقیقی اور واقعی تجربہ ہو۔ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسا تجربہ دعا یا عبادت ہی سے حاصل ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دعا گویا ان ذہنی سرگرمیوں کا لازمی تکملہ ہے جو فطرت کے علمی مشاہدے سے سرزد ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلحاظ ایک نفسیاتی منظہر کے دعا ایک راز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دعا خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی، ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے ۔ ۔ ۔"

اس فقرے میں آیہ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان کی جھلکیاں مل رہی ہیں۔ یعنی
" میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، جب بھی وہ مجھے پکارے۔"

علامہ مزید فرماتے ہیں کہ " یہ انکشاف تجسس کا عدیم المثال عمل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دعا یا عبادت کا تعلق دراصل انسان کے باطن اور ضمیر سے ہے۔ اس لیے اس کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔ لکل امۃٍ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی ہم نے امت کے لیے ایک طریقہ عبادت مقرر کر دیا ہے۔ وہ لوگ اسی کے مطابق دعا و عبادت کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔"

میں نے طوالت سے بچنے کے لیے نہایت اختصار و تلخیص سے کام لیا ہے۔ ورنہ یہ پورا خطبہ اس قابل ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں اس کی مفصل شرح کی جائے اور اس میں عرفان و ایقان کی حقیقتوں کا مشاہدہ کیا جائے۔

یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ علامہ کے کلام نظم و نثر کی طرف عالمی سطح پر توجہ کی جا رہی ہے۔ اس کو غور و فکر کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ لیکن آخر میں میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں

گا کہ ایک پرانے اقبال شناس کے بقول، علامہ کو اگر انگریز سمجھ لیتا تو وہ ایک دن بھی جیل سے باہر نہ رہتے، اور اگر مسلمان سمجھ پاتا تو وہ ایک دن بھی غلامی کی زندگی گوارا نہ کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عملی لحاظ سے ان کی تعلیمات و پیام کو سمجھنا ابھی باقی ہے۔ یہی سوچ کر سفرِ آخرت کی تیاریوں کے زمانے میں ان کے قلب سے یہ خروش اٹھا تھا:

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود

ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

(یہ مقالہ یوم آزادی کی تقریب کے سلسلے کی ایک خصوصی نشست میں جو اقبال اکادمی کی جانب سے منعقد ہوئی تھی، ۱۷ اگست ۱۹۷۴ء کو پڑھا گیا۔)

اقبالؒ اور حیات بعد الممات

وجہ مقالہ

تقریر انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میں اجلاس میں حاضر تھا۔ لیکن انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس لیے سمجھ نہیں رہا تھا۔ اسی وقت بعض سمجھنے والوں نے مضطربانہ بتایا کہ یہ تقریر بے شک حاصلِ اجلاس ہے لیکن اس میں اقبال کی تعلیمات کو آخرت اور حیات بعد الممات سے بیگانہ ثابت کیا گیا ہے۔ صاحبِ تقریر خود بڑے شاعر ہیں اور بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں حاضرین وسامعین میں پاکستانیوں کے علاوہ ایران، افغانستان، مصر وغیرہ کے اکابر بھی شریک ہیں ——— جلسہ یومِ اقبال (۱۹۶۶ء) پر اولڈ راوینز ایسوسی ایشن کراچی کے زیرِ اہتمام ہو رہا ہے۔ غور فرمائیے! اقبال پر یہ بہتانِ عظیم کہاں کہاں پہنچ سکتا ہے اور کیسے کیسے نتائج پیدا کر سکتا ہے؟

جہاں تک میرے محدود مطالعہ کا تعلق ہے، اقبال پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کا احاطہ دشوار ہے لیکن اس موضوع پر غالباً پہلی دفعہ (ضرورتاً) قلم اٹھایا جا رہا ہے۔

دو نہیں تین مظلوم

اقبالؒ نے اپنے ایک مکالمے میں دو مظلوموں کا ذکر کیا تھا۔ اوّل قرآن، دوم حسینؓ۔ ان میں ایک کا اور اضافہ کر لیجیے اور وہ خود اقبالؒ ہے جس کے کلام سے ہر شخص اپنے مطلب کی چیز نکال کر اپنا ہم خیال ثابت کر دیتا ہے۔ مسجدوں کے مولوی اور جلسوں کے لیڈر اپنی اپنی بات ثابت کرنے کے لیے اس کے شعر پیش کرتے ہیں۔

ایک بزرگ شارح نے علامہ کو اوّل سے آخر تک "ہمہ اوستی" ثابت کیا ہے۔ کئی صاحب "مارکسزم" کا مبلغ ثابت کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ——— بھری بزم میں یہ جسارت بھی آنکھوں کے سامنے آ گئی کہ مرحوم کے شعر و حکمت کا آخرت سے کوئی تعلق نہیں تھا، پناہ بخدا! ——— انہوں نے زندگی ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ:۔

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں

میری قدر و قیمت کسی نے نہیں سمجھی۔ میں قدر ناشناس اندھوں کے ہاتھ میں ایک متاعِ گراں بہا ہوں۔

ایک اور رباعی میں فرماتے ہیں :۔

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک　　ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

میرے بعد کئی لوگوں نے میرے محرم و آشنا ہونے کا دعویٰ کیا۔ لیکن میری بات کسی نے نہیں سمجھی۔

یہ بات اقبال فہمی کے عام مدعیوں پر ٹھیک چسپاں ہوتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ جناتی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور کوئی اسے سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ آخر کچھ سلیم الطبع لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اپنے مخصوص عقیدے سے الگ ہو کر اقبال کو اقبال کی روشنی میں دیکھنے کی توفیق رکھتے ہوں گے۔ علامہ نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں　　یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

منبع اقبال

دیکھنا یہ ہے کہ علامہ کی تعلیمات کا منبع و ماخذ کیا ہے۔ اگر یہ دریافت ہو جائے تو پھر اس ماخذ کے متعلق تحقیق کرنا ہوگا کہ وہ آخرت اور حیات بعد الممات کے متعلق خاموش ہے یا انکار و اقرار میں سے کسی ایک منزل میں ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ بار بار نشاندہی فرماتے ہیں :

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　حکمتِ او لایزال است و قدیم
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

قرآنِ حکیم ایک زندۂ جاوید کتاب ہے جس کی حکمت ابدی اور لازوال ہے۔ اس کی ہر ہر بات تغیر و تبدل اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

در دلم آئینۂ بے جوہر است　　گر بحرفم غیر قرآں مضمر است

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اگر میں نے قرآن کے سوا کسی اور بات کی تعلیم و تبلیغ کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے تو روزِ قیامت مجھے ذلت و خواری نصیب ہو۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام   شرحِ رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

میں نے قرآن ہی کے دریا سے موتی نکالے ہیں اور قوم کو خدائی رنگ میں رنگین کرنیکی کوشش کی ہے۔

قرآن اور حیات بعد الممات

اب دیکھیئے قرآن قیامت، آخرت یا حیات بعد الموت کے متعلق کیا کہتا ہے۔ جب ہم اس سے پوچھتے ہیں، وہ کئی عنوانوں کے تحت اس عقیدہ و نظریہ کی توثیق کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً دار آخرت۔ کتابتِ اعمال۔ جزاء اعمال۔ نفخ صور۔ میزان حساب دوزخ۔ اعراف۔ جنت۔ دیدار الٰہی وغیرہ ذالک۔

ایسے ہر عنوان کے تحت بکثرت آیات ہیں جن کی تعداد تخمیناً پونے چار سو تک پہنچتی ہے۔ جن کو شمس العلماء مولانا ممتاز علی مرحوم نے ایک پوری جلد میں منضبط کیا ہے اور اس کا نام کتاب المعاد رکھا ہے جو ۱۹۳ صفحات میں ختم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے اس موضوع پر پورے قرآن کا احاطہ کر لیا ہے۔

قرآن حیات بعد الموت کو "یوم" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے "یوم الجمع لا ریب فیہ"[1] جمع ہونے کا دن جس میں کچھ شک نہیں۔ اسی طرح یوم الحساب، یوم البعث[2] یوم محیط[3]، یوم الاٰزفۃ[4]۔ یوم الحسرۃ[5]۔ یوم الخروج[6]۔ یوم الدین[7]۔ یوم التناد[8] یوم عظیم[9]۔ یوم عسیر[10] وغیرہ۔ اس کے علاوہ یوم القیامۃ ساٹھ سے زیادہ مرتبہ وارد ہوا ہے۔

پوری امت نے کامل اجماع و تواتر کے ساتھ ان آیات و اصطلاحات کو حیات بعد الممات سے وابستہ کیا ہے[11]۔ تاکہ ہر شخص اپنا مرجع و ماویٰ قرآن کو قرار دے۔ اس کے متعلق ایسا خیال و گمان کہ اس کا پیغام صرف اس دنیوی زندگی کے لیے ہے۔ آخرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اِنّ ھذا لشیءٌ عجاب (یہ عجیب بات ہے)

---

[1] شوری ع ۱ [2] روم ع ۶ جی اٹھنے کا دن۔ [3] گھیر لینے والا دن [4] قریب آنے والا دن۔
[5] پچھتاوے کا دن [6] جی اٹھنے کا دن۔ [7] پیشی کا دن۔ [8] پکار، فریاد کا دن۔ [9] بڑا دن۔
[10] سختی کا دن۔ [11] بعض اہلِ تاویل اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اب ہم علامہ کی زندگی اور ان کی تصانیف کے مختلف ادوار پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کسی بھی دور میں وہ عقیدۂ آخرت سے منکر رہے ہیں؟

بانگِ درا میں آخرت

بانگِ درا کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے حصۂ سوم میں ان کا وہ کلام ہے جو ۱۹۰۸ء کے بعد لکھا گیا۔ اس میں وہ "والدۂ مرحومہ کی یاد" کے تحت لکھتے ہیں :۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں — ٹوٹا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات — عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں — جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

اگلے بند میں ایک مثال دے کر سمجھاتے ہیں :۔

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب — موج مضطر توڑ کر کرتی ہے تعمیرِ حباب

اور آگے بڑھیے تو کھل کر کہتے ہیں :۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے — خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح — مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے — آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

یہ اشعار کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ کوئی شخص بعید سے بعید تاویل کے ساتھ بھی ان سے ایسا مطلب نہیں نکال سکتا جو حیات بعد الموت کے منافی ہو۔

اسرار و رموز میں آخرت

اس کے بعد ان کی شاعری کا دوسرا دور آتا ہے۔ اب وہ مثنوی گو شاعر کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں "اسرارِ خودی"

شائع ہوتی ہے ۱۹۱۸ء میں دوسرا حصّہ "رموزِ بے خودی" کے نام سے شہرت پاتا ہے۔ اس میں وہ "حُسنِ سیرت" کے عنوان سے ایک آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنی جوانی کا ایک واقعہ سناتے ہیں۔

ایک واقعہ

"ایک منگتا ہمارے دروازے پر پے در پے آواز لگا رہا تھا۔ میں نے غصّے میں آ کر اس کے سر پر ایک ڈنڈا رسید کیا۔ اس کی جھولی سے تمام سرمایۂ گدائی گر پڑا۔ جوانی میں عقل صواب و ناصواب کو نہیں سوچتی۔ میری اس حرکت سے والد آزردہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک آہ بھری اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا۔ انہوں نے زبان کھولی اور فرمایا:۔

"کل روزِ قیامت جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت پیش ہوگی اور غازیانِ ملّت، حافظانِ حکمت، شہدائے اسلام، زہاد و عشاق علماء، اور عام گنہگاروں کے مجمع میں اس دردمند فقیر کی فریاد ہوگی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے سوال کریں گے کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے ایک جوان مسلم (اقبال) تیرے سپرد کیا تھا جس نے ہمارے اخلاق سے کچھ نہ سیکھا۔ تجھ سے یہ آتنا سا کام بھی نہ ہو سکا۔ یعنی یہ مٹی کا تودا انسان نہ بن سکا۔ تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟"

والد صاحب نہایت نرمی سے کہہ رہے تھے اور میں شرمندہ ہو رہا تھا:۔

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر	اجتماعِ امتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر	لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن	پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

اے فرزند! ذرا سوچ اور اس اجتماع کا تصور کر اور پھر میری یہ سفید داڑھی دیکھ۔ میرے جسم پر خوف اور اُمید کا لرزہ دیکھ۔ باپ پر یہ نامناسب ظلم نہ کر، آقا کے سامنے غلام کو ذلیل نہ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

اس مثنوی کے آخر میں وہ اشعار ملتے ہیں جن کا حوالہ اُوپر دیا جا چکا ہے کہ:۔

اگر میں نے قرآن کے سوا کسی اور بات کی تعلیم دی ہے تو مجھے روزِ محشر ذلت و رسوائی نصیب ہو۔

مدینے میں قبر کی تمنّا

"عرضِ حالِ مصنّف بحضور رحمۃ للعالمین" میں اپنی آخری آرزو پیش کرتے ہیں :۔

از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم، خوشا فردائے من

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش   مرقدے در سایۂ دیوار بخش

اگر مدینے میں مجھے قبر کی جگہ مل جائے اور روزِ محشر اسی خاکِ پاک سے دوسری زندگی پاکر اٹھوں تو میری موجودہ زندگی اگرچہ "وائے" کی مصداق ہے۔ لیکن آئندہ زندگی کتنی مبارک ہو جائے۔ اس اقبال کو آخرت سے بے گانہ کہنا خود بقول اقبال بے بصری کی انتہا نہیں تو کیا ہے۔؟

"پیامِ مشرق" میں آخرت

"اسرار و رموز" کے بعد "پیامِ مشرق" کا دور آتا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ یہ رباعیوں، غزلوں اور مختلف نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں بظاہر آخرت اور حیات بعد الموت کے تذکرے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن شاعر کے قلب و روح میں رچی ہوئی صداقتیں خود بخود اچھل کر موزوں الفاظ میں ادا ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک رباعی دیکھیے :۔

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ   زبیمش زرد مانند زریری
بخود باز آ، خودرا پختہ تر گیر   اگر گیری، پس از مردن نمیری

موت سے ڈرنے والے اگر تو اپنی خودی کو پختہ کرلے تو موت کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

ایک اور رباعی لیجیے :۔

نفس آشفتہ موجے از یم اوست   نئے ما، نغمۂ ما از دمِ اوست !
لبِ جوئے ابد چوں سبزہ رستیم   رگِ ما، ریشۂ ما از نمِ اوست

ہمارا سانس بحرِ الوہیت کی ایک موج پریشان ہے۔ ہماری بانسری میں نغمہ اسی کے دم سے ہے۔ ہم ابد کی نہر کے کنارے سبزے کی طرح اگ رہے ہیں۔ ہمارے رگ و ریشہ میں طراوت و تازگی اسی کی آبیاری سے ہے۔۔ تیسرے مصرع میں "سبزۂ لب جوئے ابد" کی ترکیب دیکھیے۔

دائمی موت کی شہادت ہے یا دائمی زندگی کی ؟

اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں فرماتے ہیں :۔

دل من راز دار جسم و جاں است　　نہ پنداری اجل بر من گراں است
چہ غم گر یک جہاں گم شد زچشمم　　ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

میں جسم و روح کے راز سے واقف ہوں۔ موت کو اپنے لیے کوئی مصیبت نہیں سمجھتا۔ اگر ایک دنیا میری نظر سے اوجھل ہو گئی تو کیا غم، ابھی سو دُنیائیں میرے ضمیر میں پوشیدہ ہیں۔

اسی ضمیر یا دل کی دائمی زندگی کا ذکر ذیل کی رباعی میں ملتا ہے :۔

چہ غم داری حیات دل زدم نیست　　کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور رائے کم نظر اندیشۂ مرگ　　اگر دم رفت دل باقی ست غم نیست

غم کیسا ہے ! دل کی زندگی سانس سے نہیں ہے۔ دل بود و نبود کے چکر میں اسیر نہیں ہے۔ اے کم نظر موت سے نہ ڈر۔ اگر سانس ختم ہو گئے ــــ اور دل باقی ہے تو کوئی غم نہیں۔

قرآن کہتا ہے۔ ان الآخرۃ لھی الحیوان ۔ حقیقی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے ــــ ذیل کی رباعی اسی آیت کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔

زمیں خاک درِ میخانۂ ما　　فلک یک گردش پیمانۂ ما
حدیث سوز و ساز ما دراز است　　جہاں دیباچہ افسانۂ ما

یہ زمین ہمارے مے خانے کے دروازے کی مٹی ہے اور آسمان ہمارے پیمانے کی صرف ایک گردش ہے۔ ہمارے سوز و ساز کی کہانی بہت طویل ہے۔ یہ دنیا تو اس کا ایک دیباچہ سا ہے۔ (یعنی اصل کہانی تو بعد موت شروع ہونے والی ہے)

"حیاتِ جاوید" کے عنوان سے چار شعروں کی ایک غزل ہے۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں　　ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

یہ خیال نہ کرو کہ زندگی کا دور یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ مادی آنکھ سے پنہاں ہزاروں زندگیاں ہیں جن کو ابھی کسی نے دیکھا نہ سُنا۔

لَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ (سجدہ ع ۲)

کوئی شخص نہیں جانتا جو عیش و نشاطِ پنہاں آگے ملنے والا ہے۔

لاعین رأته ولا اذن سمعته ولا فطر علیٰ قلب بشر (حدیث)

کسی آنکھ نے اُسے نہیں دیکھا، کسی کان نے اُسے نہیں سُنا۔ کسی دل کو اس کا خیال بھی نہیں آسکتا۔ "زندگی" کے متعلق ایک بلند نظر بزرگ سے مختلف سوال کرتے ہیں اور وہ جواب دیتے ہیں۔ آخری سوال و جواب دیکھیے :-

گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمی دہند　　گفتا چو دانہ خاک شگافد گل تر است

میں نے کہا کہ ہم خاک سے پیدا ہو کر پھر خاک ہو جاتے ہیں۔ اس نے کہا جب بیج خاک میں شگاف پیدا کر کے سر نکالتا ہے تو تر و تازہ پھول بن جاتا ہے ــــ یعنی موجودہ زندگی کی نسبت حیاتِ آخرت زیادہ شاداب اور رنگ و بو سے بہرہ ور ہوتی ہے۔

زبورِ عجم میں آخرت

"پیامِ مشرق" کے بعد "زبورِ عجم"، ۱۹۲۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں ان کا یقین آخرت اور پختہ ہو رہا ہے۔

ازل تاب و تب پیشینۂ من　　ابد از ذوق و شوقِ انتظارم !

میندیش از کف خاکے میندیش　　بجانِ تو کہ من پایاں ندارم !

ازل میرے قدیم اضطراب کی امین ہے اور ابد میرے انتظار کے ذوق و شوق کا نام ہے۔ اس خاکی وجود کے متعلق کوئی اندیشہ نہ کر۔ تیری جان کی قسم مجھے حیاتِ جاوداں عطا کی گئی۔

حدیث مشہور "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کے مفہوم کو شعرا نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ مثلاً حافظ فرماتے ہیں۔

دہقان سال خوردہ چہ خوش گفت با پسر　　کاے نورِ چشمِ من بجز از کشتہ ندروی

تجربہ کار عمر رسیدہ دہقان نے اپنے بیٹے سے کیا اچھی کہی ہے کہ اے میری آنکھوں کی روشنی! تو جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔

علامہ اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں :-

آں جہانے کہ درو کاشتہ رامی دروند　　نورو نارش ہمہ از سبحہ و زنار من است

دوسرا جہاں جس میں اپنا ہی بویا ہوا کاٹا جاتا ہے۔ اس کا نور و نار (سُکھ دُکھ) سب میرے (یعنی انسان کے) ایمان و کفر کا نتیجہ ہے۔

اے من از فیض تو پائندہ! نشان تو کجاست　　ایں دو گیتی اثر ماست، جہانِ تو کجاست!

اے کہ میری ہستی آپ ہی کے فیض سے قائم ہے۔ آپ کا نشان کہاں ہے؟ دونوں جہاں (دنیا و آخرت) میرے (یعنی انسانی) اعمال کے آثار ہیں۔ آپ کا جہاں کہاں ہے؟

نگرد و زندگی خستہ از کار جہانگیری　　جہانے در گرہ بستم جہانے دیگرے پیش است

جہاں گیری بہت بڑا کام ہے۔ لیکن زندگی اس سے تھک کر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس جہاں کے علوم و تجربات پر قبضہ کر لینے کے بعد دوسرا جہاں سامنے آجاتا ہے۔ بقول قرآن حکیم :۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (انشقاق ع ۱) تم درجہ بدرجہ عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کرتے جاؤ گے۔

اسی آیۂ مجید کے مفہوم کو ایک اور غزل میں بیان فرماتے ہیں :۔

ایں شیشۂ گردوں را از بادہ تہی کردیم　　کم کاسہ مشو ساقی مینائے دگر مارا
شایان جنونِ ما پہنائے دو گیتی نیست　　ایں راہگذر ما را، آں راہگذر ما را

شیشہ گردوں خالی ہو گیا، لیکن انسانی عطش و طلب ابھی باقی ہے۔ اُسے مینائے دگر عنایت فرمائیے۔ دونوں جہاں کی وسعتیں ہمارے جنونِ دشت نوردی کے لیے ناکافی ہیں۔ ہم تو اسے بھی ایک رہگذر سمجھتے ہیں اور اُسے بھی۔ بقول غالبؔ :۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں؟

ایک رباعی یاد آگئی :۔

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند　　فرزند و عیال و خان و ماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

دانش مندوں کی غلطی

بعض لوگ ادیان و مذاہب کا آخری مقصود تزکیۂ اخلاق سمجھتے ہیں لیکن یہ بہت بڑی بھول ہے جس میں بڑے بڑے عالی دماغ لوگ مبتلا ہیں۔ دراصل تزکیہ اخلاقی ذریعہ ہے مقصود اصلی تک پہنچنے کا اور وہ مقصود ہے ذات

واجب الوجود سے زیادہ سے زیادہ رغبت اور براہِ راست تعلق ـــــ قرآنِ حکیم نے اسی پر ہر بات سے زیادہ زور دیا اور اسی کو منتہا و مقصود قرار دیا ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (انشراح ع ۱)

اے پیغمبرؐ! جب آپ تبلیغی امور سے فارغ ہوں تو (عبادت میں مزید) محنت کیجیے اور اپنے رب کی طرف (یک سوئی سے) راغب ہو جائیے۔ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (نجم ع ۳) تمام سلسلہ وجود کی انتہا اور سب کی آخری منزل تیرے ربؐ کی ذات پاک ہے۔ پیغمبر جلیل حضرت خلیلؑ اور ان کے ساتھیوں کو امتِ مسلمہ کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے لیے ہر چیز اور ہر دشتہ کو قربان کر دیا اور قوم و وطن سے ہجرت و رخصت کے وقت دعا کی :۔

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (ممتحنہ ع ۱)

اے ہمارے رب! ہم آپ پر بھروسہ کرتے ہیں اور آپ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور سب کا آخری مرجع و ماویٰ آپ ہی کی ذات پاک ہے۔

اسی نکتے کو پیر رومی نے "منزل ما کبریاست" سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ اسی ذوق و شوق کا ترجمان ہے۔ یہ موضوع بہت شرح و بسط چاہتا ہے۔ یہاں اس کی گنجائش ہے نہ موقع ـــــ بہرحال اُن کا معبُود اخلاق حسنہ نہیں۔ لیکن معبُود کی طرف واصل ہونے کا ذریعہ بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

اعمال کی تجسیم

بعض صوفیہ و علماء قرآنِ حکیم کے عمیق مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مومن و کافر کے اعمال صالح و غیر صالحہ ہی عالم آخرت میں انواع عذاب اور نعمت ہائے گوناگوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ علامہ بھی اس حقیقت کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔ (اس موضوع پر مزید دلائل آگے آ رہے ہیں)

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

ہماری خاک ہی ایک نئے آسمان (عالم) کی معمار ثابت ہوگی۔ یہی ذرّہ ناچیز ایک پورے بیاباں (آخرت) کی وسیع (دنیا) کو تیار کر دے گا۔

روح انسانی کی بلندیٔ پرواز کا ذکر کرتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاک داں نشیمن ماست کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بود است

اسی کرۂ ارض کو اپنا آشیانہ نہ سمجھو — کیونکہ ہر ستارہ ایک دنیا ہے یا دنیا رہ چکا ہے۔

روح اور اس کی لامحدود استعداد کے متعلق فرماتے ہیں۔

عاشق آں است کہ تعمیرِ کند عالم خویش در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد

عاشق اپنی دنیا خود تعمیر کرتا ہے۔ وہ اس جہان کو کافی نہیں سمجھتا جو محدود ہو۔ بقول پیر روم:

اے برادر بے نہایت در گہے ست ہر چہ بر دَے می رسی آں جا رہیست

اے بھائی! لا انتہا بارگاہ ہے۔ جہاں بھی تو پہنچے، ٹھہرنا نہیں ہے۔

علامہ موت کو اپنے کلام میں بار بار شکست دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید مرگ است صیدے تو در کمینی

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی!

اے زندہ جاوید! تو موت سے ڈرتا ہے؟ موت تو ایک نشکار ہے اور تو اس کی گھات میں ہے۔ وہ جان جو تجھے عطا ہوئی ہے واپس لینے کے لیے نہیں ملی۔ انسان کی موت اس کی بے یقینی (کفر) ہے۔

بقول حکیم سنائیؒ

مردگی جہل و زندگی دین ست ہر چہ گفتند مغز آں این ست

موت کیا ہے؟ (دین سے) بے خبری۔ زندگی کیا ہے؟ دین۔ تمام ربانی تعلیمات کا مغز یہی ہے۔ قرآنِ حکیم نے بیسیوں آیات میں اس نکتے کو واضح کیا ہے:۔

فنائے جسم اور بقائے روح کی مزید تائید دیکھیے:۔

اے عالمِ رنگ و بو! ایں صحبت ما تا چند مرگ است دوام تو، عشق است دوام من

اے دنیائے رنگ و بو (عالم مادہ) تیرے ساتھ ہمارا تعلق کب تک؟ تیرے ساتھ موت مستقل طور پر لگی ہوئی ہے اور مجھے لازوال عشق کی دولت دی گئی ہے۔

گلشنِ رازِ جدید "گلشنِ رازِ جدید" میں بہت سے عمیق نکتے دقیق زبان میں بیان ہوئے ہیں

اس کا انداز علامہ محمود شبستری سے ماخوذ ہے۔ انہی کی طرح سوال و جواب میں مسائل حل کئے گئے ہیں۔ چنانچہ سوال کا جواب دیتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں :۔

ہزاروں عالم افتد در رہِ ما　　بپایاں کے رسد جولاں گہہ ما
مسافر جاوداں زیٔ جاوداں میر　　جہانے را کہ پیش آید فراگیر
بہ بحرش گم شدن انجام مانیست　　اگر اورا تو در گیری فنا نیست

ہماری راہ میں ہزاروں دنیائیں ہیں۔ ہماری تگ و دو کہیں ختم نہیں ہوگی۔ اے مسافر! بے شمار زندگیوں اور موتوں سے عبور کرتا ہوا آگے سے آگے بڑھتا جا۔ نئی سے نئی دنیا جو سامنے آئے اس پر قبضہ کیے جا۔ ہمارا انجام یا آخری منزل اللہ میں فنا ہو جانا نہیں ہے۔ اگر تو اسے اپنے اندر جذب کرلے تو کبھی فنا نہیں ہوگا۔

رومی فرماتے ہیں :۔

کل شی ہالک الا وجہہٗ　　گر نہٗ در وجہ او ہستی مجو

وجہِ ذات کے سوا ہر شے ہلاک ہونے والی ہے۔ اگر تو وجہِ ذات میں نہیں پہنچا تو ختم ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ باری تعالیٰ سے حقیقی ربط ضامن ہے بقائے روح کا۔

چھٹے سوال کے جواب میں شعر ذیل دیکھیے :۔

ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است　　خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

آنے والی موت کا کیا خطرہ؟ خودی پختہ ہو جائے تو موت کی رسائی سے بلند ہو جاتی ہے۔

ساتویں سوال کے جواب میں یہ اشعار ملتے ہیں :۔

مجو پایاں کہ پایائے نداری　　بپایاں تا رسی جانے نداری

بپایاں نا رسیدن زندگانی است　　سفر مارا حیات جاودانی است

تب و تاب مجت را فنا نیست　　یقین و وید را نیز انتہا است

تیری کوئی انتہا نہیں ہے۔ انتہا تو بے جان کی ہوتی ہے۔ زندگی کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ

وہ لانہایت ہے۔ سفر ہمارے لیے دائمی زندگی ہے ـــــ محبت کی بے قراریاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ یقین اور دید کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

پیر روم فرماتے ہیں :۔

آدمی دید است و باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

یہ حال کی باتیں ہیں۔ اور بے حال یا بد حال راقم بھی یہاں پہنچ کر آپے سے باہر ہو رہا ہے۔ دل میں جو کچھ آ رہا ہے کاغذ کے اوپر انڈیل دینے کے لیے بے تاب ہے۔ لیکن نہ اتنی طوالت کی یہاں گنجائش نہ اس کے لیے موزوں الفاظ دستیاب ہوتے ہیں۔

اے خُدا بنمائے ما را آں مقام　　کاندراں بے حرف می روید کلام ! (رومی)

ع　"آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد"　　(سعدی)

کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا ہے ـــــ

گر کسے وصف اُو ز من پرسد　　بے دل از بے نشاں چہ گوید باز

عاشقاں کشتگان معشوقند　　بر نیاید ز کشتگاں آواز　　(سعدی)

ان اشعار کو بے ترجمہ چھوڑ کر آگے بڑھتا ہوں۔ ان کی روح کسی ترجمے میں نہیں سما سکتی۔

آٹھویں سوال کے جواب میں۔ کائنات اور انسانی "انا" پر تبصرہ فرماتے ہیں :۔

وجود کوہسار و دشت و در ہیچ　　جہاں فانی، خودی باقی، دگر ہیچ

ساری کائنات (بحکمِ "کل شی ھالک") زوال پذیر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی انسانی "انا" غیر فانی ہے۔

خودچوں پختہ گردد لازوال است　　فراقِ عاشقاں عین وصال است

یہ "انا" جب "انائے عظیم" سے مربوط ہو کر پختہ ہو جائے تو لازوال ہو جاتی ہے۔ "اِلّا وجہہٗ" کا یہی مطلب ہے۔ اہلِ عشق کا (عالم مادی سے) فراق حقیقتاً وصال ہے۔

"جاوید نامہ" میں آخرت

"زبورِ عجم" کے بعد شاعر کی معراج ۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ تمہید اور خاتمے کے اشعار کو چھوڑ کر یہ پوری مثنوی عالم آخرت کے مشاہداتی واردات و حالات پر مشتمل

ہے۔ جن سے روح شاعر کو سابقہ پڑا۔ مختلف مذاہب و ممالک کے مشاہیر جن کے نام عالمی شہرت کی پیشانی پر ثبت ہو چکے ہیں۔ جنہوں نے تاریخ کے بہاؤ کا رُخ موڑ کر اپنی مرضی کے مطابق کر لیا۔ جنہوں نے شعر و ادب کے فرسودہ پیکر میں نئی روح پھونکی۔ جن کی عظمت و عقیدت ہر زمانے میں کروڑوں انسانوں کے دلوں اور روحوں میں جاگزیں رہی ہے اور رہے گی۔ شاعر ان کی ارواح کو خلد و ماورائے خلد کی فضاؤں میں دیکھتا ہے۔ ان سے عمیق سوالات کرتا ہے۔ ان کے تسلی بخش جوابات حاصل کرتا ہے۔ ان کے علاوہ تاریخ کے بعض ابلیسی مظاہر کے جہنمی انجام کا بھی مشاہدہ کرتا ہے اور واپس آ کر اس کرہ خاک کے باشندوں کو اُس عالم کے عبرت و حکمت آموز حالات سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ مثنوی سوز و گداز اور دردمندی و اخلاص کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس میں حسین ترین شعریت، حکمت، فلسفہ، اخلاق، سیاست، دین، خشوع وغیرہ علوم و اوصاف کے خزانے مکنون کر دیے گئے ہیں۔ کوئی ایسا شاعر جو حیات بعد الممات کے عقیدے میں خلوص نہ رکھتا ہو۔ اس کے قلب پر ایسے ربانی الہام کا نزول ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اقبال حیات بعد الموت کے قائل نہیں تھے تو اسے بتانا چاہیئے کہ اس کا مطلب و مراد کیا ہے؟ یا پھر اقبال کی طرف اس کی نسبت کو غلط ثابت کرنا ہوگا۔ ناممکن ہے کہ اس کتاب سے حیات اخروی کے سوا کوئی اور مفہوم نکالا جائے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ علامہ اقبال کے کسی اور شاعر کی تصنیف ثابت کیا جائے۔ آخر یہی بات رہ جاتی ہے جو اوپر کہی گئی ہے کہ

"آں متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں"

تاہم نمونے کے طور پر چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:۔

علامہ فلک قمر پر پہنچتے ہیں، ایک ہندی عارف سے ملاقات ہوتی ہے۔ نہایت دلچسپ و دلکش سوال و جواب کے بعد چند نکتے بیان فرماتے ہیں۔ ان میں سے ایک نکتہ ملاحظہ فرمائیے:۔

زادن اندر عالمے دیگر خوش است　　تا شباب دیگرے آید بدست

اس دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں جنم لینا۔ حقیقی مسرت سے ہم آغوش ہونا ہے۔ اس کے سوا نئی لافانی اور ابدی رعنائی حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

پروازِ سفر اوپر سے اوپر ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ علامہ ماورائے افلاک پہنچ جاتے

ہیں۔ وہاں جرمنی حکیم نٹشے سے ملاقات ہوتی ہے۔ پیر رومی تعارف کراتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں تو جنت الفردوس میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اس "جہانِ بے جہات" کے تاثرات بیان فرماتے ہیں۔

اندراں عالم جہان دیگرے　　اصل او از کن فکانے دیگرے
لازوال و ہر زماں نوع دگر　　ناید اندر وہم و آید در نظر
ہر زماں او را کمالے دیگرے　　ہر زماں او را جمالے دیگرے
روزگارش بے نیاز از ماہ و مہر　　گنجد اندر ساحت او نہ سپہر
ہر چہ در غیب است آید روبرو　　پیش از اں کز دل بروید آرزو
در زبان خود چساں گویم کہ چیست　　ایں جہاں نور و حضور زندگی است

اُس عالم میں ایک نئی دنیا آباد ہے۔ اس کا "کن فیکون" اس دنیا کے "کن فیکون" سے مختلف ہے۔ وہاں زوال و فنا کا گذر نہیں۔ تغیر و تجدد کی عالمگیری ہے۔ وہم و قیاس سے بالاتر، لیکن آنکھوں کے سامنے موجود۔ ہر دم نیا کمال اور ہر دم نیا جمال کُلَّ یومٍ ھوفی شان کی مجسم تفسیر — ماہ و مہر کی خنکی و حرارت سے بے نیاز (لا یرون فیھا شمساً ولا زمھریراً — (دہر ع ۱) وہاں نہ تپش پائیں گے اور نہ جاڑا) اس کی فراخی و وسعت نہ آسمانوں کو اپنے اندر لیے ہوئے (عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران ع ۱۴) جنت کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے) جس کو اس دُنیا میں غیب کے طور پر مانا جاتا ہے۔ وہاں روبرو آجاتا ہے۔ آرزو دل میں پیدا ہونے سے پہلے پوری ہوجاتی ہے — میں اپنی زبان میں کیا کہوں کہ وہ کیسا مقام ہے۔ وہ تو نور و حضور اور ابدی زندگی کا جہان ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی صدی کے فاضل اجل علامہ اقبال قرآن حکیم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے بیٹھے ہیں۔ اور استاذ ازل سے جو درس حاصل کر رہے ہیں ساکنانِ خطۂ خاک کو اس کی افادیت اور لذت میں شریک کرتے جا رہے ہیں۔

آگے بڑھ کر وہ اپنے عقیدۂ اعمال و جزائے اعمال کو رومی کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ (اس موضوع پر اوپر بھی اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے)

گفت رُومی اے گرفتارِ قیاس　　در گذر از اعتبارات حواس

ایں کہ بینی قصر ہائے رنگ رنگ　　اصلش از اعمال، نے از خشت و سنگ

رومی نے کہا:۔

اے گرفتارِ قیاس! حواس کے ذریعے جو علم و یقین حاصل ہوتا ہے اس سے آگے بڑھ یہ جو بہشت میں تو رنگ برنگ قصر و ایوان دیکھ رہا ہے یہ دنیا میں کیے ہوئے نیک اعمال ہیں جو یہاں اصل شکل میں موجود ہو گئے ہیں۔ یہ اینٹ پتھر کی عمارتیں نہیں ہیں۔

آنچہ خوانی کوثر و غلمان و حور　　جلوہ ایں عالم جذب و سرور

کوثر، غلمان، حور، اس عالم کا جلوہ، کشش اور لطف و مسرت سب اعمال صالحہ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔

"بالِ جبریل" میں آخرت

جاوید نامہ کے بعد شاعر کی توجہ پھر اردو کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ اس کا پہلا ثمرہ "بالِ جبریل" ۱۹۳۵ء میں منصۂ شہود پہ آتا ہے۔ مصنف "اقبالِ کامل" مولانا عبدالسلام ندوی کے قول کے مطابق اس میں "زبورِ عجم" کی تمام خصوصیات یعنی جوش، بلندی اور رنگینی سب کچھ موجود ہے"۔ اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے بہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟　　کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے　　کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی؟　　اگر بے زار ہو اپنی کرن سے

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

لینن کی زبانی

مشہور نظم "لینن خدا کے حضور میں" کے ابتدائی اشعار میں لینن کے انکارِ خدا اور آخرت کا ذکر اس کی اپنی زبان سے ہو رہا ہے۔ اس میں وہ عالم آخرت کا مشاہدہ کر لینے کے بعد کہتا ہے :-

آج آنکھ سے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت　　میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

یعنی میں جس عقیدے کو زندگی بھر مذہب کی بیہودگی سمجھتا رہا آج موت کے بعد اس کا وقوع آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ غالباً علامہ اس آیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں :-

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (ق ع ۲)

تو اس سے غفلت میں پڑا ہوا تھا۔ سو اب ہم (خدا) نے تجھ سے تیرا پردہ غفلت دور کر دیا ہے۔ پس آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔

ساقی نامہ

"ساقی نامہ" میں ان لوگوں کو نادان کہہ رہے ہے جو دوسری زندگی کے قائل نہیں :-

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات　　اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

حیاتِ روح کو غیر محدود سمجھتے ہیں :-

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے　　نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے

اس حیات ارضی کو منزل اوّلین قرار دیتے ہیں :-

یہ عالم یہ بت خانہ چشم و گوش　　جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزل اوّلیں　　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود　　کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا　　تری شوخیٔ فکر و کردار کا

یعنی دوسرا جہاں عالمِ غیب سے متعلق ہے جو انسانی روح کا انتظار کر رہا ہے۔

"ضربِ کلیم" میں آخرت

"بالِ جبریل" کے بعد جولائی ۱۹۳۶ء میں ضربِ کلیم کی باری آتی ہے۔ اس میں "بالِ جبریل" کی شعریت و دل آویزی تو نہیں۔ لیکن بہت سے اہم مسائل پر اپنی بصیرت سے روشنی ڈالی ہے۔ اسی ضمن میں "حیاتِ ابدی" کے عنوان سے قطعہ ذیل ارقام فرمایا ہے۔

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

مثنوی "مسافر"

"بالِ جبریل" کی اشاعت سے پہلے ایک چھوٹی سی مثنوی "مسافر" کے نام سے لکھی تھی۔ اس میں سیاحت افغانستان کے متعلق علامہ نے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ اس کا مطلع ہی ثبوت آخرت کے لیے کافی ہے۔

موجودہ شاہ افغانستان کے والد نادر شاہ شہید کے ذکر سے آغاز کرتے ہیں :-

نادرِ افغان شہِ درویش خو — رحمتِ حق بر روانِ پاک او

نادر شاہ افغان درویش سیرت بادشاہ تھا۔ اس کی رُوح پاک پر رحمت ہو — اگر آخرت کوئی چیز نہیں تو روح پاک پر رحمت کے کیا معنی ؟

آگے بڑھ کر ایک مناجات کے ضمن میں انکارِ آخرت کو کفار کا عقیدہ بتاتے ہیں :-

مرگ را چوں کافراں داند ہلاک — آتش او کم بہا مانند خاک

عصرِ حاضر کا فرنگی زدہ مسلمان کافروں کی طرح موت کو ہلاکت (قطعی خاتمہ) تصور کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی آگ بجھ کر راکھ سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔

"ارمغانِ حجاز" میں آخرت

علامہ کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" ہے جو نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں بھی ان کا ایمانِ آخرت ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پہلے حصے "حضورِ حق" میں عرض کرتے ہیں:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر — شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ ما را — حسابِ من زچشمِ او نہاں گیر

اس کے ساتھ ہی وہ مشہور رباعی بھی سُن لیجیے جسے بعض اہلِ دل آخر شب کے نوافل میں

بطورِ دِرد پڑھتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا ہے۔ اس میں شاعر کو آخرت قریب آتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را تو بینی ناگزیر　　از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

مفہوم دونوں رباعیوں کا ایک ہی ہے۔ درد بھرے اور ندامت میں ڈوبے ہوئے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کر رہے ہیں کہ روزِ قیامت جب غیب کے چہرے سے نقاب اٹھایا جائے میرے گناہ معاف فرمائیے۔ یوم حساب کی تلخی و سختی سے بچا لیجیے۔ اور اگر آپ کے علم و حکمت کا تقاضا یہی ہے تو میرا محاسبہ حضرت محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں کے سامنے نہ ہو۔ مجھے انؐ کے حضور ذلیل نہ کیجیے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان رباعیوں کی عام شہرت و قبولیت کے باوجود کوئی ذہین و فطین شخص کس طرح علامہ کو عقیدۂ آخرت سے بے نیاز کہہ سکتا ہے۔ بار بار علامہ کا اپنا قول یاد آ رہا ہے۔

"آں متاعم کہ شود دست زد بے بصراں"

"ارمغانِ حجاز کا کچھ حصہ اردو میں ہے۔ اس میں "صدائے غیب" کے عنوان سے ایک قطعہ ہے۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام　　گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

مرثیہ سر راس مسعود | اس حصے میں سر راس مسعود مرحوم کے مرثیے میں لکھتے ہیں:۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحاں ثبات
نگاہ ایک تجلّی سے ہے اگر محروم　　دو صد ہزار تجلّی تلافیٔ مافات

اسی حصے میں ملازادہ ضیغم (فرضی نام) کی بیاض کے حوالے سے یہ شعر پیش کرتے ہیں:۔

سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو
نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی

مزید شواہد

علامہ مرحوم کے منظوم عقیدہ و اعتراف کے بعد ان کے نثری ملفوظات و مضامین میں بھی بکثرت اس کے شواہد ملتے ہیں۔ اس وقت خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی مبسوط تصنیف "فکرِ اقبال" میرے سامنے ہے۔ اس سے استفادہ کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

..... مرض الموت کے آخری ایّام میں فرمایا کرتے تھے کہ ..... میں دوسرے عالم میں قوی انا کے ساتھ داخل ہونا چاہتا ہوں۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ "اس عالم اور دوسرے عالم کے درمیان ایک برزخ ہے۔ لیکن اس برزخ کی وسعت بھی مختلف انسانوں کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ شہداء کے لیے کوئی برزخ نہیں، وہ براہِ راست ایک برتر عالم میں داخل ہو جاتے ہیں۔"

اس سے آگے علامہ کی وہ نظم دی ہے جس میں وہ دوزخ کے متعلق اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے آخری شعر میں اس کی ماہیّت بتاتے ہیں۔"

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں　　اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں　　ص۱۲۷

حضرت آدم کی متروکہ جنت اور متقیوں کو ملنے والی جنّت کا فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

آئندہ زندگی کی پیکار اور تسخیر سے جو جنّت حاصل ہوگی وہ پہلی جنّت (آدم) سے افضل ہوگی اور اسی طرح آگے جو جنّتیں آئیں گی ان میں کہیں ایک حالت پر قیام نہ ہوگا۔ "تخلقو باخلاق اللہ" کی سعی مسلسل اگلے مرحلے میں جاری رہے گی۔ ہر جنّت ایک نئے انداز کا دارالعمل ہوگی ص۶۲۵

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اس شعر کے ضمن میں خلیفہ مرحوم لکھتے ہیں:۔

..... فقط دنیا ہی دارالعمل نہیں بلکہ آخرت بھی دارالعمل ہے ..... زندگی کا مقصود درجۂ حیات سے آگے گزرتے رہنا ہے۔ ص۷۳۶

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:۔

جب کونین کی قوتیں اس (عقل) کی گرفت میں آجائیں تو اس حکمت کے مالک کو موت نہیں آسکتی .....

اگر ایں ہر دو عالم را بگیری　　ہمہ آفاق میرد، تو نہ میری

بہ تسخیر خود افتادی اگر طاق　　ترا آساں شود تسخیر آفاق　　ص ۵۲۱

اگر یہ دونوں جہاں تیری گرفت میں آ جائیں تو دنیا چاہے مرجائے تو نہیں مرے گا۔ اگر تو نے اپنے آپ کو مطیع و مسخر کر لیا تو کائنات کی تسخیر تیرے لیے آسان ہو جائے گی۔

"گلشن راز جدید" سے تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" اگر خدا اور انسان کے درمیان عشق کا رابطہ نہ ہوتا تو انسانی نفس بھی مادی مظاہر کی طرح ایک آنی جانی چیز ہوتا۔"

من و اُو چیست اسرار الٰہی است　　من و اُو دوام ما گواہی است　　ص ۵۲۵

" میں اور وہ کیا ہے ؟ خدائی راز ! " میں اور وہ " ہمارے دوام اور غیر فانی ہونے کی شہادت ہے "

صوفیہ سے اختلاف

عام صوفیہ سے الگ علامہ کا ایک خاص عقیدہ ہے۔ ان کی آخری منزل فنا فی اللہ ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ "خدا کو اپنے اندر مسلسل جذب کرتے رہنے سے انسان ہمیشہ باقی رہے گا۔ انسان کا مقصودِ حیات یہ ہے کہ زندگی کی ہر پہلی صورت کو فنا کرتا ہوا ارتقا یافتہ صورتوں کی آفرینش کرتا چلا جائے۔

ہزاراں عالم افتد در رہِ ما　　بپایاں کے رسد جولاں گہہ ما

مسافر! جاوداں زی جاوداں میر　　جہانے را کہ پیش آید فرا گیر

بہ بحرش گم شدن انجام مانیست　　اگر او را تو در گیری فنا نیست　　ص ۵۴۲

ان اشعار کا مفہوم اُوپر آچکا ہے۔

" اقبال نے جا بجا زندگی کو ایک لامتناہی سفر قرار دیا ہے اور اسے " مرحلہ شوق " کہا ہے۔ جس کو سکون منزل کی آرزو نہیں۔

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی　　کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

؎ بڑھے جا زندگی ذوقِ سفر ہے　　ص ۵۵۵

اس سفر کی کوئی انتہائی منزل نہیں۔ کیوں کہ اگر کوئی آخری منزل آجائے تو ہماری جان ہی فنا ہو جائے۔ جان تو جستجو اور آرزو کا نام ہے۔ اگر کوئی انجام آگیا تو آرزو ناپید اور اس کے ساتھ زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔

مجو پایاں کہ پایانے نداری | بپایاں تا رسی جانے نداری

خطباتِ اقبال

علامہ کے سات انگریزی خطبات، ان کے عمیق تفکر کا نتیجہ ہیں۔ ان میں بھی کئی جگہ حیات بعد الممات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوسرے خطبے میں فرماتے ہیں :-

" زندگی مسلسل اموات میں سے گزرتی رہتی ہے، بقاء کی طرف ہر قدم فنا کی بدولت اٹھتا ہے۔"

مردم از حیوانی و آدم شدم | پس چہ ترسم کہ ز مُردن کم شوم — رومیؒ ص ۸۵

مرتبۂ حیوان میں موت کی راہ سے گزر کر انسان کے مرتبے پر فائز ہوا ہوں۔ پھر ڈرنے کی کیا بات ہے؟ مرنے سے کچھ کم تو نہیں ہو جاؤں گا۔

تیسرے خطبے میں مشہور ماہرِ نفسیات ولیم جیمز کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

" طبعی سائنس خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے انسان دعا مانگتے ہی رہیں گے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسانی نفس اپنی ماہیت اور بطون میں صحبت، رفاقت اور رجاعت کا طالب ہے۔ وہ رفیق چاہتا ہے اور "رفیق اعلیٰ" اس کو ایک جاودانی نصب العینی عالم میں ملتا ہے۔" ص ۸۰

اگر موت کے بعد کوئی زندگی نہیں تو یہ جاودانی نصب العینی عالم کیا ہے؟ اور دائمی رفیق اعلیٰ (جل شانہٗ) کی طلب کیا معنی رکھتی ہے؟

چوتھے خطبے میں کہتے ہیں کہ :-

" عارف رومیؒ کہتا ہے کہ خدا کا علم ولی کے علم کے اندر گم ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس قسم کے استغراق میں خودی کی نفی نہیں ہوتی بلکہ ایک لامحدود زندگی کا اثبات ہوتا ہے۔" ص ۱۱۰

اس اقتباس میں "لامحدود زندگی" حیات بعد الممات نہیں تو کیا ہے؟

اسی خطبے میں آگے بڑھ کر یہ الفاظ ملتے ہیں :-

یہاں (دنیا میں) نیکی اور مسرت ہم آغوش نہیں۔ اس لیے آخرت کی ضرورت ہے۔ جہاں نیکی اور مسرت ہم آہنگ ہو سکیں۔" ص ۱۱۹

یہ دلیل کتنی پختہ اور مشاہداتی ہے۔ اکثر نیک اور پاک سرشت بزرگ دُکھ پر دُکھ اٹھاتے ہوئے

دنیا سے بذریعہ موت یا قتل رخصت ہو گئے۔ مسیحؑ، سقراط، زکریاؑ، یحییٰؑ اور بے شمار صلحا و ابرار کی زندگیاں اس پر گواہ ہیں اور لبسا اوقات شریر و موذی قسم کے لوگ عمر بھر عیش و نشاط کے مزے اڑاتے رہتے ہیں اور ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوسرا عالم جسے عالم انصاف کہہ سکیں نہیں ہے تو "اندھا راجہ بے داد نگری" ہوئی۔ کیا کوئی عاقل اس "اندھیر اور بے داد" کی ابدیت کو تسلیم کر سکتا ہے؟

اس خطبے کے چند اور اقتباسات دیکھیے:۔

"قرآن کریم ہر ہستی کے احیائے بعد الموت کی تعلیم دیتا ہے۔"

"انسان کی انفرادیت موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔"

"قرآن کہتا ہے جس خدا نے تم کو لم یکن شیئاً[1] مذکورا سے لے کر احسن تقویم تک پہنچایا ہے کیا وہ تم کو اب یونہی ردی مال سمجھ کر چھوڑ دے گا؟ خودی کا ارتقاء بقا کا ضامن ہے۔"

"عالم برزخ ایک دوسرے عالم میں عبور کرنے کی تیاری ہے۔ جہاں نہ مادی عالم ہو گا نہ یہ زمان و مکان۔" ص ۸۲۰ و ص ۸۲۱

"احیائے بعد الموت کوئی خارج سے وارد شدہ واقعہ نہیں بلکہ ارتقائے نفس کی ایک منزل ہے، قرآن کا استدلال یہی ہے کہ جو خدا تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور جس نے ترقی کی کئی منزلیں طے کرائی ہیں۔ کیا وہ اس سے عاجز ہے کہ وہ تم کو پھر جوں کا توں کھڑا کر دے یا ایسی صورت میں لے آئے جس کا تم تصور نہیں کر سکتے"؟

"جو ہستی ذرات و حشرات سے یہاں (انسانیت) تک پہنچتی ہے اس کی آئندہ ترقی محض مفروضہ نہیں بلکہ ایمان بر بنائے تجربہ ہے۔" ص ۸۲۲

کیا دوسری زندگی کو "ایمان بر بنائے تجربہ" کہنے والا شخص حیات آخرت سے منکر ہو سکتا ہے؟ یا للعجب! اس خطبے میں بار بار اپنے اس عقیدے کو دُہراتے ہیں۔ "فقط اتنی بات بر بنائے مطالعہ فطرت، بر بنائے حکمت اور بر بنائے تعلیم قرآن یقینی معلوم ہوتی ہے کہ نفس یا روح کی زندگی اس جسم کی تحلیل کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ ایمان اور امید کے لیے یہی کافی ہے۔"

---

[1] معدوم ص ۲ بہترین انداز

"یہ بات بھی قرآن نے وضاحت سے بتادی ہے کہ یوم حشر میں انسان کی نظر حقائق کو پوری طرح دیکھ لے گی۔ خدا کہے گا کہ "دیکھ تیری نظر آج کس قدر تیز ہو گئی ہے"۔

جنت کے متعلق علامہ کا ایمان و یقین ملاحظہ فرمائیے :۔

"جنت تخریب و انتشار کی قوتوں پر غلبے کا نام ہے اور کوئی تعطیل طویل اور بے کاروں کی عشرت گاہ نہیں۔ بلکہ مزید تجلّی اور مزید ترقی کے لیے وہ بھی میدانِ عمل ہے ..." ص ۸۲۳

پانچویں خطبے میں فرماتے ہیں :۔

"مظاہر فطرت کے سامنے سے آنکھیں بند کر کے گزرنا قرآن کے نزدیک قابلِ مذمت حرکت ہے۔ جو یہاں اندھوں کی طرح زندگی بسر کرے گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ کیونکہ آخرت کی زندگی اسی دنیا کی زندگی کا ثمرہ ہے۔" ص ۸۲۷

ساتویں خطبے میں رومی کے نظریہ ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

وہ (رومی) ذرات سے ترقی کرتے ہوئے الوہیت کے دامن کو چھونے کا آرزومند اور امیدوار ہے۔ وہ ارتقاء کی بدولت جز کو کل سے ہمکنار کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ وہ طبعی موت سے خائف نہیں، بلکہ اس کو ترقی کا ایک زینہ سمجھتا ہے۔

مردم از حیوانی و آدم شدم پس چہ ترسم، کہ ز مردن کم شوم؟ (رومی)

آخر میں راقم سے علامہ کا ایک مکالمہ بھی سُن لیجیے :۔

میں نے ایک ملاقات میں "بیعت صوفیہ" کا مفہوم پوچھا تو فرمایا :۔

"میں نے فلاں کتب خانے (نام یاد نہیں) میں پیر جہانیاں جہاں گشت کا قلمی سفر نامہ دیکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ ایک طالب حق ایک بزرگ کے پاس گیا اور بیعت کی خواہش کی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس سے توحید رسالت آخرت اعمال صالحہ وغیرہ ارکانِ اسلام پر اسرار کیا۔ پھر اسی طرح خود ان الفاظ کو دہرایا کہ میں بھی تمہارے سامنے انہی باتوں کا اقرار کرتا ہوں جن کا تم سے اقرار لے چکا ہوں۔

آخر میں کہا "دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔ پیر و مرید دونوں نے ہاتھ اٹھائے۔ اور پیر صاحب

نے صرف اتنی دعا کی :۔

"پروردگار! روزِ قیامت ہمیں ذلیل نہ کرنا۔"

علامہ یہاں تک پہنچے تو ان پر رقت طاری ہو گئی۔ کئی منٹ تک اسی حال میں رہے۔

میں بھی بہت متاثر ہوا۔

یہ تھا ان کا آخرت پر ایمان۔ نہ صرف ایمان بلکہ آخرت کا خوف بھی۔

حضرت خواجہ احمد الدین اور علامہ اقبال رحمہما اللہ

"مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر میں نے اخبارات میں دیکھی۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ اس زمانے میں ان کا دم غنیمت تھا۔ ایسے عالم باعمل روز روز نہیں پیدا ہوتے۔"

(حضرت خواجہ کی وفات پر علامہ کا مکتوب

بنام عرشی - خط ۱۴، ص ۳۰، اقبال نامہ حصہ اوّل)

: ০ :

مئی ۱۹۷۳ء کا آخری اتوار صبح سے شام تک سمن آباد (لاہور) میں گزرا۔ ناشتے سے قبل ہی صوفی تبسم صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان میں پرانے وقتوں کی صحبتوں کا ذکر آگیا۔ میں اسی مقصد کے لیے حاضر ہوا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں صوفی صاحب نے انکشاف کیا کہ علامہ اقبال ماہ نامہ "بلاغ" (امرتسر) کے باقاعدہ مطالعہ کی وجہ سے حضرت خواجہ احمد الدین کے غیر معمولی قرآنی مطالعہ وتدبر وتعمق سے خوب واقف تھے۔ علامہ اپنے ایک مکتوب (بنام صوفی تبسم) میں تحریر فرماتے ہیں :-

"مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی تھی، کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں "عبادات" و "معاملات" کے متعلق صرف قرآن[1] سے استدلال کیا گیا ہو۔ "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لیے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں۔ اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سُن رہے ہیں

---

[1] 'صرف قرآن' کی شرط قابل توجہ و مزید تحقیق ہے۔

کہ قرآن کامل کتاب ہے۔ اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ[1] "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی کے رسالہ[2] اشاعۃ القرآن کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سعادت انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔

نیز جو قواعد (عبادات یا معاملات، بالخصوص موخرالذکر) کے متعلق دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، ان کا قرآنی نقطہ نگاہ سے استقصا کیا جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سعادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جُورس پروڈنس (JURISPRUDENCE) (قانونی تعزیرات) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔ افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے مزاج سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سُنا کہ حضرت امام ابوحنیفہ کا نظیر ناممکن ہے۔

غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

(مخلص: محمد اقبال (اقبال نامہ: جلد اوّل[3] خط ۱۹ - ۴۸)

---

[1] خواجہ صاحب اور ان کے رفقاء اس علمی و دینی پرچہ کو نکالا کرتے تھے اور حضرت علامہ اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔

[2] یہ پرچہ مولوی حشمت علی صاحب کے شاگرد رشید مولانا عبداللہ چکڑالوی نکالا کرتے تھے۔ یہ پرچہ جماعت 'اہلِ قرآن' کا نقیب تھا۔

[3] اس مکتوب کے متعلق ایک لطیفہ ہے کہ جب یہ مکتوب پہلی مرتبہ شائع ہوا تو چونکہ اس کی تمہید میں علامہ نے خواجہ کے مقابلہ میں اپنی مذہبی واقفیت کے نہایت محدود ہونے کا اعتراف کیا تھا اس لیے علامہ کے دوست میاں محمد حسین مرحوم نے اس کو جعلی قرار دیا۔ ان کے خیال میں ایسا

علامہ کے اس خط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف خواجہ صاحب اور ان کے رفقاء کے خیالات سے واقف تھے بلکہ اس دور کی سب سے بڑی اسلامی خدمت یعنی "تشکیل جدید فقہ اسلامی" کے لیے ان کے نزدیک حضرت خواجہ اور ان کے رفقاء سب سے زیادہ موزوں تھے۔

اسی سلسلے میں حضرت علامہ خواجہ صاحب سے ملاقات کے متمنی تھے۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان دنوں خطبات مدراس (تشکیل جدید الٰہیات اسلام) کی تیاری میں مصروف تھے اور قرآن مجید سے جس قسم کی محققانہ اور حکیمانہ رہنمائی چاہتے تھے اس میں مدد کرنے والا ملک بھر میں ان کو خواجہ صاحب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

صوفی صاحب نے بتایا کہ ملاقات کی تحریک علامہ کی طرف سے ہوئی۔ مگر وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے امرتسر نہیں جا سکتے تھے۔ اس لیے خواہش تھی کہ اگر کوئی صورت ہو سکے تو خواجہ صاحب لاہور تشریف لے آئیں۔ میں (صوفی تبسم) جب امرتسر گیا تو خواجہ صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا:۔ بہت بہتر میں تو خود ان سے مستفید ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ صورتحال علامہ کو لکھ دی۔

اس کے جواب میں علامہ نے لکھا: (۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

اعتراف علامہ کی عظمت کے منافی تھا۔ پھر جب صوفی صاحب نے اصل خط کا فوٹو چھپوا دیا تو محمد حسین کے لیے مفر نہ رہا۔ اس کے بعد جب صوفی صاحب کی ان سے بالمشافہ ملاقات ہوئی تو صوفی صاحب نے ان سے کہا:۔ اگر بلا تحقیق جعلی نہ کہتے تو آپ کو یہ شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔ (اب اس خط کی اصل نیز علامہ کے مزید کئی خطوط کی اصلیں جو صوفی صاحب کے نام تھیں، اقبال اکیڈیمی کراچی کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی فوٹو کاپی صوفی صاحب کے پاس بھی ہے)

ایسا ہی ڈاکٹر شاہ علی نے کراچی ریڈیو پر رات ۹½ بجے کی بزم طلبہ کی نشریات میں کہا کہ علامہ اقبال کے خطوط بنام علامہ سید سلیمان ندوی کی اشاعت کو رکوانے کی بہت کوشش کی گئی۔ ایسے لوگ علامہ کے ذوق علم اور جذبۂ استفادہ کو ان کی عظمت کے منافی اور کسر شان سمجھتے ہیں۔ حقیقت کو چھپانا نہ ممدوح کی خدمت ہے اور نہ علم تاریخ سے انصاف۔

"...... مجھے یقین ہے کہ مولوی[1] صاحب موصوف کو میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے۔ اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادے سے امرتسر سے لاہور آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو ان کی بہت مہربانی ہے جس کے لیے میں ان کا نہایت تشکر گزار ہوں گا۔

(اقبال نامہ حصّہ اوّل خط ۱۹ - ۳۸)

علامہ کے مندرجہ بالا جواب آنے کے بعد ہمیں لاہور پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوگئی تو چار دن بعد پھر ایک خط آیا: (۶ ستمبر ۲۵ء)

"جناب من السلام علیکم!

میں کل شام مولوی صاحب کا منتظر رہا۔ لیکن چونکہ وہ تشریف نہ لائے، اس واسطے مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خط سے کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔ میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں وقت کا تعین اس واسطے نہ کیا تھا کہ اس بارے میں مولوی صاحب موصوف کی آسائش کو مدّ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی یہ عنایت کم نہیں کہ وہ محض میرے فائدے کے لیے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں۔ یہ بات قرینِ انصاف نہیں کہ ان حالات میں میں اپنی سہولت اور اوقات ملحوظ رکھوں۔ مجھ کو یہ بات اس خط میں واضح کر دینی چاہیئے تھی کہ وہ جب چاہیں تشریف لائیں۔ مجھ کو صرف ایک روز پہلے مطلع کریں۔ تاکہ میں ان کی تشریف آوری کے وقت مکان پر ہی رہوں۔ کہیں ادھر ادھر نہ چلا جاؤں۔

آپ کو گذشتہ خط لکھنے کے بعد میں نے چند باتیں نوٹ بھی کر رکھی تھیں جن پر میں مولوی صاحب کے خیالات سے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا آرزومند ہوں۔

مخلص۔ محمد اقبال

---

[1] یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ ان دنوں خواجہ صاحب کو عام طور پر مولوی صاحب کہا جاتا تھا۔ بعد میں ان کی "خوجہ برادری" کی ایک کانفرنس نے اپنا قومی لقب "خوجہ" کے بجائے "خواجہ" قرار دیا تو راقم (عرشی) نے جو ان دنوں "بلاغ" کی ادارت کے فرائض انجام دیتا تھا لفظ "مولوی" پر اس کو ترجیح دی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ یہ لفظ اپنی معنویت کھو چکا تھا۔

مولوی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر دیجیے گا۔"[1]

علامہ کے اس خط کے بعد میں (صوفی تبسم) خواجہ صاحب کو لاہور لے آیا اور گڑھی شاہو میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی ایچ ڈی (امرتسری) کی قیام گاہ پر انہیں ٹھہرا کر علامہ کو اطلاع دینے کے لیے گیا کہ خواجہ صاحب آگئے ہیں۔ اجازت ہو تو انہیں آپ کے ہاں لایا جائے۔

علامہ نے فرمایا:۔ "وہ تو میرے مہمان ہیں، انہیں دوسری جگہ کیوں اتارا گیا۔ سیدھا یہاں لانا چاہیئے تھا۔" بہرحال صوفی صاحب اور خواجہ صاحب تانگے پر حضرت علامہ کی کوٹھی پہنچے اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (خواجہ صاحب کی خواہش تخلیہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے) ان کے پیچھے پیچھے سائیکل پر آگئے اور اس طرح اوٹ میں بیٹھ گئے کہ خواجہ صاحب کو دکھائی نہ دیں۔ رات کا وقت تھا اور خواجہ صاحب کی نظر مزمن مرض رمد چشم کی وجہ سے رات کو بخوبی کام نہیں دیتی تھی۔

علامہ نے قبل ملاقات تبسم صاحب سے یہ دریافت کیا تھا کہ جدید فلسفیانہ اصطلاحات کا استعمال اس گفتگو میں ناگزیر ہوگا۔ کیا مولوی صاحب کو اس میں مشکل تو پیش نہیں آئے گی؟ صوفی صاحب نے اس کے متعلق ان کو مطمئن کر دیا تھا۔

صوفی صاحب کہتے ہیں:۔

"قرآن حکیم کے مختلف مقامات کے متعلق یہ گفتگو مسلسل چار گھنٹے تک جاری رہی، مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ہو، جو زیر بحث نہ آیا ہو۔ علامہ نے ابتدا میں کہا کہ "مجھے خطبات مدراس کی تیاری میں بعض حقائق قرآنی کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کئی مقامات پر میں غور کر چکا ہوں۔ بعض مقامات ابھی غور طلب ہیں۔ اس میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" چنانچہ علامہ سوال کرتے اور خواجہ جواب دیتے جاتے تھے۔ نہایت بلند و عمیق حقائق سامنے آرہے تھے۔ میں (صوفی) اپنے آپ کو خود فراموشی اور جہاں فراموشی کے عالم میں بالکل ہی کسی دوسری نادیدہ دنیا میں محسوس کر رہا تھا۔ کاش میں ان دنوں ان مکالمات کو قلمبند کر لیتا جو اس طویل مدت کے گزر جانے کے بعد ذہن میں محفوظ نہ رہ سکے۔" مجھ (عرشی) کو یاد پڑتا ہے صوفی صاحب نے انہی دنوں مجھے بتایا تھا کہ آیہ "ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ"

---

[1] اس خط کی اصل بھی اقبال اکیڈمی کراچی میں موجود ہے۔

پر بہت غامض اور قدرے طویل گفتگو ہوئی تھی، صوفی صاحب نے یہ بھی کہا کہ دوران کلام میں کسی مقام پر بھی خواجہ صاحب کو علامہ کا نقطۂ نگاہ سمجھنے میں رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ جدید فلسفہ کی ہر اصطلاح کو بے تکلف سمجھتے اور اس پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ حالانکہ بعض مقامات پر مجھ (صوفی) کو فہم معانی میں مشکل پیش آتی تھی۔ گفتگو کے اخیر میں صرف ایک مسئلہ پر خواجہ صاحب نے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کیا وہ حسب ذیل ہے :۔

علامہ نے تجدد امثال کے متعلق قرآنی روشنی چاہی۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ "میں نے اس نقطۂ نگاہ سے قرآن میں غور نہیں کیا۔"

صوفی صاحب نے یاد دلایا کہ وہ (صوفی) اس ملاقات کے متعلق مختصر طور پر "رادی" (گورنمنٹ کالج لاہور میگزین) میں لکھ چکے ہیں۔ رادی کا وہ پرچہ تو نہیں ملا۔ لیکن ماہِ اگست ۱۹۳۸ء کے "بلاغ" (امرتسر) نے یہی تحریر بشکریہ "رادی" درج کی ہے، اسی کی نقل پیشِ خدمت ہے :

"ذیل کا خط[1] علامہ مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں میرے نام لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قبلہ محمود شیرانی مدظلہ العالی کی وساطت سے پہلے پہل مجھے ڈاکٹر صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اگرچہ میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور سے اپنے وطن چلا گیا تھا۔ تاہم ان سے ملاقات کا اشتیاق ہمیشہ دامن گیر رہتا اور میں گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی عالمانہ گفتگو سے استفادہ کرتا رہتا۔

اسی زمانہ میں امرتسر سے رسالہ "بلاغ" شائع ہوا۔ اس رسالہ میں خواجہ احمد الدین مرحوم کے مضامین اور قرآنِ حکیم کی تفسیر انہی کے قلم سے شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں باقاعدہ پہنچتا تھا اور بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس خط میں جن مولانا کا ذکر آیا ہے وہ یہی خواجہ احمد الدین مرحوم ہیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب کی ملاقات ہو اور دونوں بزرگوں نے خود بھی بارہا اس کے لیے انتہائی اشتیاق کا اظہار فرمایا لیکن یہ چیز ہمیشہ معرضِ التوا میں پڑی رہی۔ آخر کار ایک موقع نکل آیا۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ملاقات سے پہلے دونوں بزرگوں نے زبانی اور تحریری طور پر نہایت عجز و انکسار سے کام لیا۔ جیسا کہ اس خط کے اندازِ بیان سے ظاہر ہے۔ ہر

---

[1] یعنی مکتوب اقبال بنام صوفی تبسم مندرجہ اقبال نامہ مرتبہ عطاء اللہ حصہ اوّل ۴۹-۴۶ ۔

ایک اسی بات پر زور دیتا تھا کہ ملاقات کا مقصد محض دوسرے سے استفادہ کرنا ہے اور بس۔ میں عجیب الجھن میں تھا اور مجھے اس بارے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس لیے کہ اظہار انکسار میں کسی نمائش یا تصنع کا شائبہ تک نہ تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ علم کی غایت اور انتہا عجز و انکسار کے سوا کچھ نہیں اور دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں کا یہ ارشاد کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ ہر صاحب بصیرت کائنات کی گہرائیوں میں کھو جانے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

مولانا احمد الدین لاہور تشریف لائے اور میں ان کی معیت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دونوں بزرگوں میں مسلسل چار گھنٹے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو جو زیر بحث نہ آیا ہو۔

یہ بابرکت صحبت رات کے ایک بجے ختم ہوئی۔ اس صحبت میں شریک ہونے والے میرے محترم دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ بی۔ ایچ۔ ڈی بھی تھے۔ یہ واقعہ آج سے تقریباً تیرہ[1] برس پہلے کا ہے۔ لیکن میرے تاثرات ابھی تک تازہ ہیں۔ آج بھی جب کبھی اس ملاقات کا خیال آتا ہے تو دل پر ایک خاص محویت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ جب ہم اس رات ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر چلے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں۔ (تبسم)

(ماہنامہ "بلاغ" اگست ۱۹۳۸ء بحوالہ راوی[2] لاہور)

صوفی صاحب نے اپنی اس تحریر میں یہ فرمایا ہے کہ "وہ (علامہ) بالاستعاب اس (ماہنامہ "بلاغ") کا مطالعہ کیا کرتے تھے"۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو رسالہ "بلاغ" کے مالک و مدیر اوّل حکیم شہاب الدین (امرتسری) کی زبان سے راقم نے سنا تھا جس سے علامہ کی اس رسالہ سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ حکیم صاحب لاہور آتے تو علامہ سے بھی ملاقات کرتے اور "بلاغ" کا سالانہ چندہ دستی وصول کرتے تھے۔ ایک دفعہ علامہ نے ان سے کہا:

"میرے پاس سب رسائل و اخبارات بے قیمت پہنچ جاتے ہیں۔ صرف آپ ایسے ہیں

---

[1] یاد رہے کہ یہ تحریر ۱۹۳۸ء کی ہے۔

[2] حضرت خواجہ احمد الدین مرحوم۔

کہ مجھ سے 'بلاغ' کی قیمت وصول کرتے ہیں"۔

یہ تھی خواجہ و علامہ کی ملاقات کی سرگذشت۔ راقم کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ علامہ کو خواجہ صاحب سے مکرر ملاقات کا شوق رہا۔ ان کے ذہن میں بعض اہم قرآنی سوالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ جن کے متعلق وہ خواجہ صاحب سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سورۂ نساء کی آیت ۱۵۹ " و ان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ" کا ذکر آیا تو اس کی ضمیروں کی تعین کے متعلق راقم علامہ کے استفسار کا جواب نہ دے سکے اور خواجہ صاحب کی طرف رجوع چاہا۔ علامہ کو جب ان کی تحقیق معلوم ہوئی تو اس سے دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

ایک اور صحبت میں توریت کے مسئلہ "عول" کے متعلق راقم سے حضرت خواجہ کی تحقیق دریافت فرمائی۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی اور امرتسر پہنچ کر خواجہ صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ علامہ کے روبرو اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔ (خواجہ صاحب "عول" کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ اسے قرآنی تصریحات کے عدم فہم کا نتیجہ قرار دیتے تھے) ان کی منظوری سے علامہ کو مطلع کیا تو آپ نے یہ مکتوب سپردِ قلم فرمایا:۔

لاہور ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب السلام علیکم

آپ کا والا نامہ آج صبح مجھے مل گیا۔ مولوی صاحب قبلہ کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر کے بہت بہت شکریہ ادا کیجیے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں گذشتہ ۱۸ ماہ سے ہائی کورٹ کا کام نہیں کرتا۔ اس واسطے مولوی صاحب سے گفتگو کرنے کے لیے مجھے کچھ پہلے کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس کے لیے اس وقت میری طبیعت حاضر نہیں۔ اور نہ اس قدر

۱۔ تفسیر بیان الناس

۲۔ مروجہ قانون وراثت کی فاش اغلاط گذشتہ صدیوں میں کسی کی نظر میں نہیں آئی تھیں۔ فقہاء نے "سراجی" کو پاک از خطا صحیفہ سمجھ کر رائج کر رکھا تھا۔ خواجہ صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس پر گرفت کی اور ملک بھر کے فقہاء و علماء کی طرف متوجہ کیا۔

محنت برداشت ہوسکتی ہے۔ انشاء اللہ کچھ مدت بعد ایسا کرسکوں گا۔

فی الحال میرے خیال میں چاہیئے کہ ایسی مثالیں لی جائیں جن میں فقہاء کے نزدیک "عول" کی ضرورت پڑتی ہے اور تقسیم سے ثابت کیا جائے کہ "عول" کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی مثالیں انگریزی کتاب میں موجود ہیں۔ مولوی سراج الدین پال آپ کو بتاسکیں گے۔ یہ مسئلہ نہایت ضروری ہے میں تو دبھی "عول" کی تردید میں بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔

امید کہ مولوی صاحب کا مزاج بخیر ہوگا۔ اگر "عول" پر ایک علیحدہ رسالہ لکھا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ جو کچھ مولوی صاحب نے 'بیان القرآن' میں لکھا ہے اس کو مزید تشریح و توضیح کے ساتھ علیحدہ چھاپ دیا جائے تاکہ اس مسئلہ کی طرف علماء کی خاص توجہ ہوجائے اور وکیل و بیرسٹر

(باقی پچھلے صفحہ کا)

جمود پسند علماء کی طرف سے اس پہ بہت لے دے کی گئی، مگر بعض حضرات پر اس رسالہ کے دلائل قاطعہ کا اتنا اثر ہوا کہ باوجود اختلاف عقائد کے انہیں اس رسالہ کی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

معجزۂ قرآنی دربیان میراث مسلماناں: احمد الدین صاحب مدرس مدرسۃ المسلمین امرتسر نے مسائل میراث اسلامی پر ایک ناقدانہ رسالہ لکھا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ علماء میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جو مسائل فقہیہ میں بلاخوف لومۃ لائم فقہائے متقدمین شکراللہ مساعیہم کے اجتہادات پر قلم اٹھاتے ہیں۔" (پھر یہ لکھنے کے بعد کہ ہمیں تو اہلحدیث علماء سے علمی کاموں کی توقع تھی مگر انہیں تو مجادلہ، مقاتلہ اور مقادمہ (باہم مقدمہ بازی) سے ہی فرصت نہیں ملتی، تحریر کرتے ہیں):۔

"اس بناء پر ہم نے مولوی صاحب کے رسالہ میراث کو پوری توجہ اور غور کے ساتھ پڑھا اور پھر اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ اس میں بہت سی باتیں لائق توجہ ہیں اور درحقیقت ان مسائل میں ہمارے فقہاء کتاب و سنت سے کسی قدر دور جا پڑے ہیں۔ لیکن تعین کے ساتھ ان مسائل پر اظہار خیال کے لیے فرصت درکار ہے واللہ تعالیٰ مسئول ان یوفی لسھا۔"

(ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ صفر ۱۳۳۶ھ دسمبر ۱۹۱۷ء صفحہ ۵۶)

مولانا مفتی حافظ محمد اسلم جیراج پوری نے خواجہ صاحب کے اس رسالہ کا عربی میں الوراثۃ فی الاسلام کے نام سے ترجمہ کردیا ہے۔ لیکن کسی مصلحت ذاتی کے سبب یہ نہیں بتایا کہ یہ ان کی اپنی تصنیف نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔

صاحبان بھی اس میں خاص دلچسپی لے سکیں۔

مخلص محمد اقبال

(اقبال نامہ حصہ اوّل صفحہ ۱۳ صفحہ ۲۸)

افسوس ہے کہ دونوں بزرگوں کی پیروی و علالت کی وجہ سے یہ ملاقات وقوع پذیر نہ ہو سکی اور ۲ر جون ۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب انتقال فرما گئے۔

★★★

خواجہ صاحب کی تحریروں کے مطالعے اور ان سے ملاقات کا علامہ اقبال پر کیا اثر ہوا ؟ اس کے لیے اقبال نامہ اور خطبات مدراس کے مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیں :۔

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں علامہ لکھتے ہیں :۔

" دوسرا امر جو اس کے متعلق دریافت طلب ہے یہ ہے کہ جو جواب وحی کی بناء پر دیا گیا وہ تمام امّت پر حجت ہے اور وہ وحی بھی قرآن شریف میں داخل ہو گئی ہے لیکن جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا گیا جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام امّت پر حجت ہے ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں ؟"

(اقبال نامہ حصہ اوّل صفحہ ۶۹ ص ۱۴۱)

ایک اور خط میں سید سلیمان ہی کو لکھتے ہیں :

" اگر صحابہؓ کے اجماع نے کوئی حکم نص قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ امدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بناء پر ہوا ہے۔ وہ ناسخ حکم سوائے حدیث نبویؐ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخ قرآن ہو سکتی ہے جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہوگا۔"

تشکیل جدید الٰہیات اسلام کے چھٹے خطبۂ اجتہاد میں ایک امریکی مصنف پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " پیغمبرؐ کی کسی حدیث میں بھی یہ شان نہیں کہ وہ قرآن کی تنسیخ کر سکے۔"

(چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر جلد دوم صفحہ ۸۳)

اسی خطبہ میں حضرت عمرؓ کا نقطۂ نظر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشوونما اور ارتقاء کی گنجائش ہے ؟ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا۔ گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اس مسئلہ میں وہی روح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا اور امت کے اولین دل و دماغ میں جو ہر معاملہ میں آزادئ رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حالتِ نزع میں یہاں تک کہہ دیا کہ "حسبنا کتاب اللہ" ہمارے لیے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔"

(تشکیل جدید ترجمہ سید نذیر نیازی صفحہ ۵ ۱۹۵۸ء بزم اقبال۔ لاہور)

اسی خطبہ میں حدیث کے ضمن میں یہ بتاتے ہوئے کہ ان کا بڑا حصہ اپنے مخصوص حالات کے لیے تھا۔ لکھتے ہیں :۔

پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے احادیث سے اعتناء نہیں کیا۔ انہوں نے اصول استحسان یعنی فقہی ترجیح کا اصول قائم کیا۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں بااحتیاط مطالعہ کریں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ فقہ اسلامی کے ماخذ کے بارے میں ان کا رویہ کیا تھا۔ رہا یہ کہنا کہ امام موصوف نے احادیث سے اس لیے اعتنا نہیں کیا کہ ان کے زمانہ میں کوئی مجموعۂ احادیث موجود نہیں تھا۔ تو اس سلسلہ میں اوّل تو یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس زمانہ میں تدوین نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ عبدالملک[1] اور زہری کے مجموعے امام صاحب کی وفات سے کم از کم تیس برس پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ ثانیاً اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ امام موصوف ان مجموعوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے یا یہ کہ ان میں فقہی احادیث موجود نہیں تھیں، جب بھی وہ ضروری سمجھتے تو امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی طرح خود اپنا مجموعہ احادیث تیار کر سکتے تھے۔

لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے میں جو روش اختیار کی سرتاسر جائز اور درست تھی۔ اندریں صورت اگر آزادی اجتہاد کی وہ تحریک جو

اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے۔ احادیث کو بلا جرح وتنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس سے اہلسنت والجماعت کے ایک امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے۔"

(تشکیل جدید صفحہ ۲۶۶، ۲۶۷)

'اقبال[1] کامل' میں مولانا عبدالسلام ندوی سینئر رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ علامہ اقبال کے مسلک کے متعلق تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"وہ اہلِ قرآن تھے۔ لیکن اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہنا بھی ایک قسم کی فرقہ بندی تھی۔ اس لیے انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اہل قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا۔[2] تاہم ان کے اشارات بلکہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقیٰ صرف قرآن تھا۔ مثنوی رموز بے خودی میں فرماتے ہیں :-

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست — از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش — در نمے سازد بقرآں محفلش
واعظ دستاں زن افسانہ بند — معنیٔ او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتار او — با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

---

[1] یہ کتاب سلسلۂ دارالمصنفین میں شامل ہے۔ ۲۷ ہے، دارالمصنفین ہی کی مطبوعہ ہے۔ زیر نظر اڈیشن ۱۹۲۸ء کا ہے۔ اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "اس کتاب کا نام اقبال کامل' سید سلیمان ندوی نے رکھا ہے۔ نیز اس کتاب کا پورا مسوّدہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر سے بھی گزر چکا ہے جو فلسفی ہونے کے ساتھ صوفی اور سخن فہم بھی ہیں اور اب جبکہ اس کتاب کا مسوّدہ پریس میں جارہا ہے مزید اطمینان کے لیے اس کو ہمارے عزیز دوست اور دارالمصنفین کے پرانے رفیق مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی نے بھی ..... بنظرِ غائر دیکھ لیا ہے اور ان کے مشورے سے اس کتاب کی بہت سی خامیاں دور ہوگئی ہیں۔" گویا یہ کتاب دارالمصنفین کے چار اہلِ علم کی مصدقہ ہے اور علامہ کی کوئی سوانح عمری غالباً اتنی مستند نہیں۔ (دیباچہ صفحہ ۵)

[2] یہی نقطہ نظر حضرت خواجہ احمد الدین کا تھا اور وہ اس کی بنیاد قرآن کریم کی اس آیت پر رکھتے تھے کہ ھو سماکم المسلمین کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام 'مسلم' رکھا ہے تو اس سے روگردانی حکم قرآنی کی مخالفت ہے۔

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب　　تو ازو کامے کہ میخواہی بیاب

اس باب میں ان کی گفتگوئیں اور زیادہ واضح ہیں۔ عرشی صاحب البیان دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ "ایک بار ان سے میں نے پوچھا:۔

اسلام بتمام قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا "مفصل کہو" میں نے کہا:۔ خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ انہوں نے فرمایا "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں بتمام و کمال آچکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لیے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔"

ایک اور گفتگو میں جو انہوں نے ایک غالی الحدیث سے کی، فرمایا "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔" اس پر ایک صاحب ذرا گرم ہو کر کہنے لگے:۔ "اگر اس طرح حدیث سے بے پروائی کی جائے گی تو مسلمانی ختم ہو جائے گی۔ ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ قرآن تو نماز ایسی روزمرّہ کی چیز کے لیے بھی ہمیں کوئی تفصیل نہیں بتاتا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ اہلِ قرآن نے اپنے لیے عجیب قسم کی نمازیں تراش لی ہیں۔ جن کا جمہور اہلِ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی نمازوں کے اوقات، اذکار اور رکعات وغیرہ سب عالم اسلامی سے مختلف ہیں۔ کیا ایسی حالت میں آپ ان کو کافر نہ کہیں گے؟"

ڈاکٹر صاحب نے اس تیز کلامی کے جواب میں نہایت نرمی سے فرمایا: "کافر نہ کہو۔ کوئی اور نام رکھ لو۔ یہ شدّت ہے۔ تم لوگ نمازوں کی رکعات اور اذکار پر لڑتے ہو، مجھے تو سرے سے نمازوں کا وجود ہی کہیں نظر نہیں آتا[1]۔ یعنی مسلمان نماز ہی نہیں پڑھتے۔

لیکن بایں ہمہ وہ حدیثوں کے سرے سے منکر نہ تھے بلکہ بہت سی حدیثوں پر شدّت

---

[1] ۔ البیان امرتسر دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۴

سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کو جو کچھ شک و شبہ تھا وہ احادیث کی شرعیت[1] کے متعلق تھا۔ چنانچہ ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :-

شرعیت احادیث کے متعلق جو کھٹک میرے دل میں ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں۔ ان میں ایسے بیش بہا اصول ہیں کہ سوسائٹی باوجود اپنی ترقی و تعالی کے اب تک ان کی بلندیوں تک نہیں پہنچی۔ مثلاً ملکیت شاملات دہ کے متعلق المرعی[2] للہ و رسولہ

(بخاری)

(اقبال نامہ حصہ اول ۲۷ صفحہ ۱۵۲)[3]

---

[1] ۔ یعنی حدیث کی حجیت پر ۔

[2] ۔ یعنی "چراگاہ اللہ اور اس کے رسول کی ہیں" یعنی تمام امت میں مشترکہ ہیں ۔

[3] ۔ اقبال کامل ۔ صفحہ ۵۵ تا صفحہ ۵۷ ۔

علامہ اقبالؒ ــــ مردِ خُدا مست ★

علامہ اقبال کی شاعری کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ میں نے پہلے پہل ان کا نام ایک طرحی گلدستہ میں دیکھا۔ اس وقت وہ صرف شیخ محمد اقبال تھے۔ مدیر رسالہ نے ان کی غزل کی خاص طور پر تعریف کی تھی اور انہیں ایک ہونہار نوجوان شاعر قرار قرار دیا تھا۔

یہی زمانہ انجمن حمایت الاسلام اور رسالہ مخزن کی تاسیس سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دو ذریعوں سے شیخ محمد اقبال کی شہرت لاہور سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئی۔ خصوصاً ان کی نظم "شکوہ" نے دنیائے شعر و ادب میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ مخالف و موافق دونوں قسم کی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستانیوں میں غلامی کا احساس ابھرا ــــ میں نے مولانا ظفر علی خاں کے مشہور عالم اخبار "زمیندار" کا وہ دور بھی دیکھا جب اس کے پہلے صفحے پر نمایاں طور سے یہ شعر لکھا ہوا تھا :-

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس قسم کے خیال رکھنے والوں کو مولانا نے "ٹوڈی" کا ذلیل خطاب بلکہ گالی عطا فرمائی اور اس شعر کی بجائے یہ نیا شعر تاج سر "زمیندار" بنا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہی زمانہ مولانا ابوالکلام کے "الہلال" و "البلاغ" اور مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد"

★ یہ مقالہ اقبال اکادمی کی خصوصی نشست میں بتاریخ ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء پڑھا گیا۔

اور "کامریڈ" کے عروج کا تھا۔

ہندوؤں کو صرف انگریز کی غلامی سے نجات کی فکر تھی۔ مسلمانوں کو اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک کی زبوں حالی کا غم بھی کھائے جاتا تھا۔ علامہ اقبال ملّت بیضا کی زبان بن کر ایک طرف وطنیت کے نغمے الاپ رہے تھے تو دوسری طرف ملت اسلامیہ کے عالمگیر ادبار پر بھی آنسو بہا رہے تھے۔ ترکی علاقے بلقان، طرابلس، ایڈریانوپل، سمرنا وغیرہ ایک ایک کر کے مغربی حکومتوں کے قبضے میں آتے جا رہے تھے۔ جب بھی کوئی ہولناک خبر آتی ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب غم و اضطراب کا گہوارہ بن جاتے، جلسے ہوتے، ترکوں کی مدد کے لیے چندہ جمع کیا جاتا۔ مسلمان عورتیں اپنے زیورات تک اتار کر دے دیتیں۔ وفود مرتب ہو کر کبھی ترکی اور کبھی برطانیہ جاتے۔ مجھے یاد ہے سقوطِ سمرنا کے موقع پر امرتسر میں ایک کہرام برپا تھا۔ ایک نوجوان گلیوں اور بازاروں میں بہت بلند اور سوزناک آواز سے ایک پنجابی نظم پڑھتا تھا تو لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جاتے، آہیں بھرتے اور آنسو بہاتے تھے۔ اس نظم کا ایک شعر مجھے ابھی تک یاد ہے اور وہ آواز گویا ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

روندے سمرنا دے بال وے، بیوہ ہوگیاں مائیاں
مصطفٰے پاشا کمال وے، تیریاں دور بلائیاں[1]

دنیائے اسلام کی نظریں اس وقت مصطفٰے کمال پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کا اپنا بیان ہے:

"خراب و خستہ ملّت کو دشمن کے رحم پر چھوڑ کر وہ لوگ جنہوں نے اسے جنگ کی آگ میں جھونک دیا تھا ملک سے فرار ہو چکے تھے۔ فوجیوں کے پاس ہتھیار اور گولہ بارود ختم ہو چکا تھا۔ اتحادی سلطنتیں ترکی کے حصّے بخرے کرنے کے لیے کوشاں تھیں اور دارالسلطنت میں ان کی فوجوں کا ہجوم تھا۔ آطنہ کی ولایت پر فرانسیسی قابض تھے۔ مرعش، عین تاب اور عرفہ پر انگریز۔ انطاکیہ اور قونیہ میں اطالوی فوجیں موجود تھیں۔ مرزیفون اور سمسون میں بھی انگریز سپاہی نظر آتے تھے۔ ہر سمت اجنبی ضابطہ مامور اور جاسوس کارفرما تھے۔ حکومت، سلطنت اور خلافت سب الفاظ بے معنی ہو چکے تھے۔" ترکی شاعر نامق کمال نے کہا تھا:-

---

[1] ۔ ترجمہ: سمرنا کے بچے رو رہے ہیں۔ مائیں بیوہ ہوگئیں۔ اے مصطفٰے کمال پاشا تیری بلائیں دور ہوں۔

"وطن کے گلے پر دشمن نے اپنا خنجر رکھ دیا ہے۔ اس سیہ بخت ماں (یعنی مادر وطن) کو نجات دلانے والا کوئی بھی نہیں"

مصطفیٰ کمال جو نجات دلانے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے استنبول کی حکومت نے ان کے خلاف علماء سے فتوے لے کر شائع کیے۔ بلکہ ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ ان کی گرفتاری کے خفیہ احکام بھیجے گئے۔

انہی دنوں ہمارے شہر امرتسر کی بڑی عید گاہ میں مولانا ابوالکلام نے جو اس وقت تک مسلمانانِ ہند کے متفقہ عظیم رہنما سمجھے جاتے تھے ایک آتشیں تقریر کی جس کی تاثیر سے پورا مجمع آہوں اور آنسوؤں کا ہنگامہ زار بن گیا۔ خلاصۂ تقریر کچھ اس طرح تھا :۔

"آج اس دنیا میں پرندوں کے لیے گھونسلے ہیں، چرندوں کے لیے چراگاہیں ہیں، بھیڑیوں اور بچھوؤں کے لیے بھی رہنے کے ٹھکانے ہیں، سانپوں اور چوہوں وغیرہ، حشرات الارض کے لیے زمین میں بل ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں، کوئی پناہ نہیں"۔

اسی زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی کی واقعاتی نظمیں "زمیندار" کے صفحۂ اوّل پر شائع ہوتی تھیں۔ ان کی ایک طویل نظم "شہر آشوب اسلام" اور "ہنگامۂ طرابلس و بلقان" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ جس کے دو آخری شعر یہ ہیں۔

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک؟

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں ؟
کہ اب امن و اماں شام و نجد و قیرواں کب تک ؟

لسان العصر اکبر الہ آبادی کے دل کی گہرائیوں سے یہ چیخ نکلی :۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی بہبودی سے ہے یاس

سب سے پہلے امت مرحومہ کے سب سے بڑے مرثیہ گو مولانا حالی نے فریاد کی :۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسُل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
فریاد ہے اے کشتیٔ اُمّت کے نگہبان
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

علامہ کی نظمیں بروقت نکلتیں اور مسلمانوں کے گہرے جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ وہ جلسوں میں نظم پڑھتے، ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے، ساتھ ہی سارا مجمع اشک بار ہو جاتا۔

سقوط طرابلس کے وقت ان کی نظم جو "بانگِ درا" میں حضور رسالت مآبؐ میں" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے ایسے ہی جذبات کی عکاسی کرتی ہے جس میں وہ تحفے کے طور پر ایک آبگینہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے عرض کرتے ہیں :-

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اور نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" بھی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی اسی دور کی یادگار ہے۔

فاطمہ تو آبروئے ملّت مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

لیکن حیرت انگیز بات یہ کہ حضرت علامہ اس عالمگیر حرمان و یاس کی حالت میں بھی مایوس نہیں تھے جیسا کہ اسی نظم سے ظاہر ہوتا ہے۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

ایک اور نظم "بعنوان" مسلم"، میں لکھتے ہیں :۔

آشکارا ہیں میری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات!
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملّت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عُنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

یہ شعر جون ۱۹۱۲ء میں لکھے گئے جب کہ ہر طرف یاس کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس کے گیارہ برس بعد ۱۹۲۳ء میں اقبال کی "فتح کامل"، کا ظہور مصطفٰے کمال اتاترک کے تدبر و شجاعت سے چشمِ عالم نے دیکھا ــــ علامہ نے زندگی بھر کسی وحی و الہام وغیرہ کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس کے باوجود ان کی زبان سے نکلی ہوئی بہت سی باتیں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ میں اس کی تفصیل اپنے ایک مضمون "اقبال کی پیش گوئیاں"، میں عرض کر چکا ہوں۔ ایک سوچنے والے دل میں بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایک شاعر کو پیش بینی کی قوت کہاں سے حاصل ہوئی؟ اس کا جواب بھی وہ بہت پہلے یعنی ۱۹۰۵ء سے قبل کی ایک نظم "تصویرِ درد"، میں دے چکے ہیں۔

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینہ دل ہے قضا کے رازدانوں میں

علامہ ہی کی شاعری پر یہ پرانا مصرع صادق آتا ہے :۔

"شاعری جزویست از پیغمبری"

اور یہ شعر بھی :۔

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر است

یہی بات مولانا گرامی استاد نظام دکن نے کھل کر کہہ دی تھی :۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت !

آج ہمارے جسم کا آدھے سے زیادہ حصّہ کٹ گیا۔ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسی ناکامی کی کوئی نظیر نہیں، اور دشمن کی ہزارہا سالہ "مہابھارت" اور "رامائن" میں ایسی کوئی کامیابی نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے دیدۂ بے نم سے ایک قطرہ اشک نہیں ٹپکا۔ بالائی طبقہ کی عیش کوشیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ علامہ کے الفاظ میں :۔

"کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا"

اس تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔

اس یاس و قنوط کے عالم میں لوگ علامہ کی نظم کے منتظر رہا کرتے تھے۔ جب کوئی نئی نظم بذریعہ "زمیندار" یا بذریعہ جلسۂ "حمایت الاسلام" عوام تک پہنچتی تو ان کی ڈھارس بندھ جاتی اور ایک حد تک تسکین و امید کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ اسی دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ علامہ بالکل خاموش ہوگئے۔ ایک عرصہ تک ان کی طرف سے حالات حاضرہ پر کوئی منظوم تبصرہ سماعت نواز نہ ہوا۔ لوگ حیران تھے کہ ترجمان حقیقت علامہ اقبال کا قلب حسّاس آج کل کس مقام و منزل میں ہے ؟

یہ نہ بھولیے کہ میں آج سے نصف صدی سے بھی چند سال قبل کی صحبتوں میں آپ کو لیے جا رہا ہوں جبکہ مسلمانوں کے تمام مذہبی اور سیاسی رہنما اسلامی اخلاص کی چنگاریاں سینے میں لیے ہوئے زبان اور قلم کی پوری قوت سے سرگرم عمل تھے۔ سنا جاتا ہے کہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے غیر معمولی سکوت کو برداشت نہ کرتے ہوئے بعض لوگوں نے مختلف ذرائع سے اپنے جذبات ان تک پہنچائے۔ لیکن ادھر سے "صدائے برنخاست" کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ آخر میرے ایک محترم اور فاضل دوست ماسٹر شیخ عبیداللہ امرتسری مرحوم نے جو حضرت علامہ کے عشق و عقیدت میں سرشار تھے، مجھ سے کہا کہ ایک نظم ایسی لکھو جو حضرت علامہ کی خدمت میں عقیدت مندوں کے جذبات کی ترجمانی کر سکے

میں نے اپنی ہیچ میرزی کے اعتراف کے ساتھ معذرت کر دی۔ لیکن وہ مُصر رہے۔ میں نے بار بار کہا ایسی عظیم ہستی کے سامنے مجھ ایسے نا اہل کی بات کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ ادھر سے اصرار بڑھتا گیا میں نے ہتھیار ڈال دئیے۔ اتنی پرانی بات اب اچھی طرح تو یاد نہیں۔ کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور میں شعر لکھواتا گیا۔ ان کا ذوق شعری بہت بلند تھا۔ اتفاق سے ان کو یہ اشعار پسند آگئے اور انہوں نے مولانا ظفر علی خاں کی خدمت میں برائے اشاعت ارسال کر دئیے۔ یہ اشعار اس وقت کی آواز تھے۔ دوسرے تیسرے ہی دن "زمیندار" کے صفحۂ اوّل پر جلی قلم سے شائع ہو گئے۔

اتنی بات یہاں اور کہتا چلوں کہ نظم کا عنوان میں نے غالباً "ڈاکٹر اقبال سے خطاب" لکھا تھا۔ مولانا نے بدل کر "خطاب بہ علامہ اقبال" کر دیا۔ شاید یہ ان کی انگریز اور انگریزیت سے نفرت کا اثر تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر کے لفظ پر عربی لفظ علامہ کو ترجیح دی۔ اس کے علاوہ نظم میں بھی ایک جگہ تبدیلی کی۔

میرا مصرع تھا:۔

"بادہ کیف آموز از جذبات ذوق افزائے تو"

مولانا ظفر علی خان نے "جذبات" نکال کر اس کی جگہ لفظ "تخیل" رکھ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربی میں جذبات کی ذال متحرک ہے اور میں نے اسے ساکن باندھا تھا جو اساتذہ نے جائز رکھا ہے۔ لیکن مولانا کی عربیت نے اتنا بھی گوارا نہ کیا۔

اس کے بعد فوراً ہی دوسرے یا تیسرے دن علامہ کی طرف سے جواب شائع ہو گیا۔ میری نظم کے بعض مقصدی اشعار پیشِ خدمت ہیں۔ تمہید و خطاب کے بعد عرض کیا تھا:

اے توئی در آشیاں و گلشنت بربادرفت
نغمۂ ماندی و پرواز تو با صیاد رفت

خیز و گلبانگ دہل در گنبدِ خضرا فگن
از قبور آئند خلقے شور صور آسا فگن

خیز ازیں کنج متانت جلوۂ بر ما فگن!
ہاں بیا ہمچوں سنائی گوئے در میداں بزن!

جواب میں حضرت علامہ نے جو تابندہ و رخشندہ اشعار کہے وہ بھی سُن لیجیے:۔

دانی کہ چیست شیوۂ مستان پختہ کار
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست

دارم ہنوز از کرم ساقیٔ حجاز
آہے در دنہ تاب کہ خیزد ز سینہ مست

از شاخسار فطرت من می دمد ہنوز
آں لالہ کہ موج نسیمے دلش نخست

لیکن شنیدۂ کہ دم گردش شراب
پیر عجم چہ گفت برندان مے پرست

داناکہ دید شعبدۂ چرخ حُقّہ باز
ہنگامہ باز چید و در گفتگو بہ بست

مولانا ظفر علی خاں نے جو نظم و نثر کے بحر ذخار تھے اور بدیہہ گوئی میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے علامہ کے قطعہ کے نیچے اپنی طرف سے اسی زمین میں اتنے ہی اشعار اردو میں رقم فرمائے جن میں میری عرض نیاز کی تائید کرتے ہوئے علامہ سے مخاطب ہوئے :۔

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی
پیر فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست

مانا کہ آسماں سے شمس و قمر کی فوج !
پیہم اتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست

مانا کہ ان کو جو نظر آتے ہیں سربلند
چرخ ستیزہ کار کرے گا زبون و پست

لیکن نہ قول سعدی شیراز بھولیے
چھوٹا کہیں جو ہاتھ سے سررشتۂ الست

رفتن بہ پائے مردئی ہمسایہ در بہشت
حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

میرے استاد مولانا حکیم فیروزالدین احمد طغرائیؒ رحمۃ اللہ علیہ ان دنوں جموں کے کسی سکول میں معلّم تھے۔ ان کی نظر سے میری گزارش تو نہیں گزری۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار انہوں نے دیکھ لیے۔ بہت متاثر ہوئے۔ اپنا یہ تاثر انہوں نے اسی زمین میں چند اشعار کی شکل میں منتقل کر دیا اور ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر مجھے بھیج دیا۔ میں نے وہ پوسٹ کارڈ لفافے میں بند کر کے مولانا ظفر علی خاں کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ حکیم صاحب نے بھی میری تائید میں یہی چاہا کہ اس وقت علامہ کو اپنے حیات افروز کلام سے افرادِ ملّت کی رہنمائی کرنی چاہیئے۔ کچھ نمونہ ان کا بھی دیکھ لیجیے۔ راقم الحروف کو مخاطب فرماتے ہیں :۔

امروز در فضائے زمیندار دیدہ ام — ز اقبال پاسخے کہ دل آرزو بجست
نادیدہ خاطرم بخطاب تو وا رسید — نشنیدہ مدعائے تو در ذہن من نشست
خواہم کہ نکتۂ بسرائم دریں خصوص — ہرچند غم نوائے نشاط مرا شکست
عالم بصد ہزار زباں کنج خامشیست — شاعر دراں میانہ لب نطق پر درست
باشد برائے دیدۂ بینا مقام حیف — گر کور و چاہ دید و و صد اُلتش بداد است
گیرم کہ گنج فلسفہ و حکمت است کس — اما چہ سود مہر سکوت از لبش بربست

ان اشعار میں حضرت علامہ کے فلسفہ و حکمت کا صحیح اعتراف کرتے ہوئے موثر پیرائے میں ان سے مہرِ سکوت توڑنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس زمانۂ سکوت میں علامہ اپنی بعض کتابوں کی تالیف و تصنیف میں منہمک رہے جو بعد میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد قوم کے ہاتھوں میں پہنچتی رہیں۔

یہی زمانہ تھا جب صوفی تبسم سے میرا تعارف ہوا۔ صوفی صاحب ان دنوں خالصہ کالج امرتسر میں پڑھتے تھے اور شعر کا شوق بھی کرتے تھے۔ یہی شوق باعث ہوا میرے ان کے درمیان دوستی کا۔ انہوں نے مجھ سے اس معاملہ میں مشورہ چاہا۔ میں انہیں اپنے استاد حکیم طغرائی مرحوم کی خدمت میں لے گیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ حکیم صاحب سے استفادہ کیا۔ پھر ایم اے کلاس کا داخلہ لاہور کے (غالباً) اسلامیہ کالج میں لے لیا۔ جہاں ان دنوں حضرت محمود شیرانی (والد اختر شیرانی) اور مولانا محمد شفیع ایسے اساتذہ سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں وہ حضرت علامہ سے بھی ملتے رہتے تھے اور جب ان کی کوئی تصنیف شائع ہوتی تو دلی اشتیاق سے خرید لاتے، پڑھتے اور امرتسر آتے تو غیر معمولی علمی و ادبی تحفے کے طور پر مجھے دکھاتے۔ میرا معمول یہ تھا کہ جب بھی علامہ کی کوئی نئی چیز سامنے آتی میں اپنے تمام مشاغل چھوڑ کر بالکل تنہائی میں اس میں محو ہو جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ایک ہی دن میں پوری کتاب پڑھ ڈالی۔

بال جبریل اور جاوید نامہ کا مجھ پر غیر معمولی اثر ہوا۔ تنہا بیٹھا پڑھ رہا ہوں اور آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں ہے۔ جاوید نامہ نے تو مجھ پر ایسا جادو کیا کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت علامہ "زندہ رود" کے نام سے روح رومی علیہ الرحمۃ کی رہنمائی میں ہفت افلاک و ماورائے افلاک کی سیر کر رہے ہیں۔ ساکنانِ عالم بالا کی ارواح سے مکالمے ہو رہے ہیں۔ نکتہ آفرینیاں اور حکمت آموزیاں ہو رہی ہیں اور میں بھی ان دونوں بزرگوں کے پیچھے پیچھے وہ سب کچھ دیکھ اور سُن رہا ہوں جو وہاں پیش آ رہا ہے۔ یوں سمجھیے کہ گویا میں اس عالم مادی سے کٹ گیا ہوں۔ یہ کمال شعر، یہ تاثیر، یہ عمق اور یہ ساحری، سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مثنوی رومی اور مثنوی جاوید نامہ کے سوا کسی بھی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آئی۔

جاوید نامہ میں ایک مقام ایسا ہے جہاں میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ تاہم اس رکاوٹ کو دل میں رکھ کر سیرِ افلاک و ماورائے افلاک پوری طرح ختم کی۔ جب صوفی تبسم صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس خاص مقام کی طرف انہیں متوجہ کر کے اظہارِ خیال کیا۔ اگلے دن انہوں نے لاہور پہنچ کر علامہ سے اس کی وضاحت چاہی۔ پھر جب امرتسر آئے تو علامہ کی تشریح سے مجھے مستفیض کیا۔ میں نے اس پر اپنی رائے ظاہر کی۔ صوفی صاحب نے لاہور جا کر علامہ سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے پھر جو کچھ ارشاد فرمایا مجھ تک پہنچایا گیا۔ اب یہ یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ یہ غائبانہ مکالمہ ہوتا رہا۔ آخر ایک دن صوفی صاحب آئے مجھ سے کہا:۔ لاہور آئیے اور حضرت علامہ سے روبرو بات ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا موقع فراہم کیا۔ میں لاہور پہنچا اور ہم حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری کے لیے تیار ہوئے۔ مجھے یہ بات یہاں واضح کر دینی چاہیئے کہ میں اس بارگاہ علم و فضل میں حاضر ہونے اور دو بدو گفتگو کرنے کے قابل اپنے آپ کو نہیں سمجھتا تھا۔ میں بڑی ہچکچاہٹ سے اس شرط پر تیار ہوا کہ میرا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ اگر علامہ

پوچھیں تو صوفی صاحب اتنا ہی کہہ دیں کہ یہ شخص امرتسر میں ان کا ہمسایہ ہے۔ ملنے کا شوق لے کر حاضر ہوا ہے۔ صوفی صاحب نے میری یہ شرط تسلیم کر لی۔ چند امرتسری دوست اور بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ یہ واقعہ علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے متعلق ہے۔

صوفی صاحب نے میری شرط کی پروا نہ کرتے ہوئے جاتے ہی کسی اور کا تو نہیں میرا نام ظاہر کر دیا۔ میں سخت شرمسار ہوا۔ بات چیت کا آغاز ہوا۔ علامہ کے اندازِ گفتگو میں سادگی، بے تکلفی، اور اپنائیت سی تھی جس سے میری مرعوبیت دور ہو گئی اور میں ہر نکتے پہ اظہارِ خیال کرتا رہا۔ وہ میری معروضات پر توجہ فرماتے اور مجھے مطمئن کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔

یہ مکالمہ میں نے انھیں دنوں اپنے ماہنامے "بلاغ" میں شائع کر دیا تھا۔ یہاں اس تفصیل و تطویل کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

اس ملاقات کے بعد میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ملاقات کا کوئی موقع نہیں ملا۔

امرتسر میں میرا اسلوب زندگی ایسا رہا کہ ہر سال موسم گرما میں کسی پہاڑی مقام کشمیر وغیرہ اور سرما ضلع ساہیوال (جو ان دنوں منٹگمری کہلاتا تھا) کے ایک کشت زار میں دو چار ہفتے گزارتا اور مطالعہ کے لیے کچھ کتابیں ساتھ رکھتا۔ ایک مرتبہ میں نے مثنوی رومی اور تفسیر المنار (دروس مفتی محمد عبدہ مصری) کا انتخاب کیا۔ میرا یہ سفر ایک بہشتی تخلیہ تھا۔ دوران مطالعہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیر رومؒ کی مجلس میں بیٹھا ان کے کلمات حکمت و عرفان سن رہا ہوں۔ مولانا اپنی محفل میں بہت کم تنہا ہوتے تھے۔ کبھی ان کے پاس عطار و سنائی اور کبھی بایزید بسطامی و ذوالنون مصری اسرارِ عشق و عرفان بیان کرتے نظر آتے تھے۔ کبھی اور بے شمار انبیاء و اولیاء اور حکماء و عقلاء متکلم معلوم ہوتے تھے۔ تقریباً اٹھارہ دن میں میں نے نصف سے زیادہ متن مثنوی کا مطالعہ کر لیا۔ ایک شعر سے بھی سرسری عبور نہیں کیا۔ ہر شعر پر غور کرتا، ہر ترکیب سے لذت یاب ہوتا۔ لیکن اس دوران میں بہت سے مقام ایسے آئے جہاں میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا اور ایک رفیق راہ کی طلب میں بے چین ہو جاتا۔ بعض اوقات پیر رومؒ خود فرما دیتے :-

یار باید راہ را تنہا مرد — از سر خود اندریں صحرا مرو!
کے تراشد تیغ دستہ خویش را — رو بجراحے سپار ایں ریش را

ایسی حالت میں، مَیں نے اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالی تو مجھے حضرت علامہ کے سوا کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو حل مشکلات میں میری مدد کر سکے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بالِ جبریل اور جاوید نامے کے مطالعے سے مجھ پر یہ حقیقت واشگاف ہو چکی تھی کہ مثنوی کے واعظ اور مدعی تو بہت ہیں۔ لیکن رومی کے بحرِ بے پایاں میں غوطے لگا کر درہائے ناسفتہ نکالنے والا علامہ کے سوا کوئی نہیں۔ بالِ جبریل میں انہوں نے اپنے آپ کو مریدِ ہندی اور مولانا کو پیرِ رومی کہہ کر کئی اہم نکتوں کا انکشاف فرمایا ہے اور جاوید نامہ تو سارے کا سارا ہی ایک ایسا روحانی سفر ہے جس میں حضرت علامہ پیرِ رومی کے ساتھ ساتھ اور کبھی پیچھے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔

میں گاؤں سے امرتسر واپس پہنچا تو آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ علامہ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا جس میں اپنے شوق و طلب اور خواہش استفادہ کا اظہار کیا۔

علامہ جواب خط میں کبھی تساہل نہیں کرتے تھے اور سائل کی پوری تسلّی کرنے میں بھی بے پروائی نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب بہت جلد مجھے موصول ہو گیا اس تبرّک کو ملاحظہ فرمائیے:

لاہور ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میری صحت عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفہ کے بعد بھوپال جانا ہو گا

آپ اسلام اور اس کے حقائق کے لذت آشنا ہیں۔ مثنوی رومی کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیئے۔ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعۂ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔ افسوس ہے ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں ایک بھی صاحب سرور نہیں۔

بہر حال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیے۔ مجھ سے بھی کبھی کبھی ملتے رہیئے۔ اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں۔ بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خیال میں بھی نہیں ہوتے۔

یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے جس کو جاننے والے مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔

محمد اقبال

اس کے بعد میں برابر حاضرِ خدمت ہوتا رہا اور استفادہ کرتا رہا۔ میرے اکتساب و استفادہ کا طریقہ شروع ہی سے کچھ اس قسم کا رہا ہے کہ ابتدائی چند کتابیں تو باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھتا۔ پھر خود ہی گھر پر مطالعہ کر لیتا۔ اور صرف مشکل مقامات اساتذہ سے دریافت کر لیتا۔ اس طرح تھوڑے وقت میں زیادہ اکتساب ہو جاتا ہے اور استاد کو بھی زیادہ مغز پاشی کی زحمت نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ میرا حضرت علامہ کے ساتھ رہا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے سوالات کی ایک مختصر فہرست بنا لیتا اور حاضر ہو کر یکے بعد دیگرے عرض کرتا اور ان کے ارشادات سے پوری طرح مطمئن ہو کر آگے بڑھتا جاتا۔ آپ جاوید منزل میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہ علاقہ ان دنوں میورو ڈ کہلاتا تھا اور اب اقبال روڈ ہے۔ میں اسٹیشن سے اتر کر اپنے دوسرے کاموں کو مؤخر کر کے پہلے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ کبھی پہنچتے ہی حاضری کا شرف حاصل ہو جاتا۔ اگر کبھی آپ پہلے سے آئے ہوئے کسی ملاقاتی یا ملاقاتیوں سے مصروف گفتگو ہوتے تو علی بخش کی چارپائی پر بیٹھ کر انتظار کرتا۔ عموماً میں تنہا حاضر ہوتا۔ کبھی کبھی میرے ساتھ آپ کا کوئی شائق و عقیدت مند میرا دوست بھی شامل ہو جاتا۔

میرے سوالات عموماً عمق قرآنی، علمی، ادبی، تاریخی، اخلاقی، حکیمانہ اور صوفیانہ نکات پر مشتمل ہوتے تھے۔ علامہ ہر سوال کے جواب میں عموماً ایسے ایسے دلائل و شواہد ارشاد فرماتے کہ میرا دامن سوال کوتاہ اور ان کی بخشش جواب اتنی وافر ہوتی کہ :

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین جمال تو ز داماں گلہ دارد

والا معاملہ ہو جاتا۔ ایک طرف تو وہ مطالعہ و معلومات کا خزانہ تھے۔ دوسری طرف طویل مرض اور پیرانہ سالی کے باوجود حافظہ اتنا قوی و محفوظ تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ ہر سوال کا فوری اور شافی جواب مثالیں دے دے کر پوری تفصیل سے سمجھاتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو اکتائے

اور تھکے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ میری ہی طرف سے سلسلۂ کلام بند ہوتا اور میں رخصت طلب کرتا تھا۔ امرتسر پہنچ کر اس صحبت کا خاص قسم کا اثر کئی کئی دن تک مجھ پر قائم رہتا۔ امرتسری احباب مجھ سے ملاقات کا حال دریافت کرنے کے لیے منتظر رہتے تھے اور مجھ سے علامہ کی باتیں سُن کر متاثر ہوتے تھے۔ اگر میں ان گفتگوؤں کو انھیں دنوں سپردِ قلم کر لیا کرتا تو عجیب و غریب معلومات کی ایک کتاب بن جاتی۔ آج مجھے اپنے اس تساہل پر افسوس ہو رہا ہے۔ ان کی رحلت کے بعد محمود نظامی مرحوم نے ان کے ملنے والوں کو آمادہ کیا کہ اپنی اپنی ملاقاتوں کے حالات قلمبند کر کے انہیں دے دیئے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے "ملفوظات" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا۔ مجھے جو کچھ مختصر سا یاد رہ گیا وہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس کو پڑھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان گفتگوؤں میں کیسے کیسے مشکل مسائل اور عمیق نکات ان کی زبان مبارک سے واضح ہو کر سائل کو مطمئن کر دیتے تھے۔

یہ تحریر یہاں تک پہنچی تو مجھے اپنی ایک پرانی یادداشت مل گئی جو ماہِ اگست ۱۹۳۸ء کو علامہ کی رحلت سے تقریباً تین ماہ بعد سپردِ قلم کی گئی تھی۔ اس کے بعض اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

مجھے علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے میں کچھ دیر ہو جاتی تو صوفی صاحب کے توسط سے خود یاد فرما لیتے۔ مجھے جب کبھی لاہور جانے کا اتفاق ہوتا تو بالعموم ہر کام سے پہلے جاوید منزل کا رخ کرتا۔ گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ مختلف مسائل پر جامع اور سیر کن گفتگو ہوتی۔ میں تنہائی میں ملاقات سے لطف اندوز ہونے کے خیال سے عموماً اتوار کی حاضری سے مجتنب رہتا۔ کیونکہ اتوار کو ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دوسرے دنوں میں خوب موقع مل جاتا تھا۔ میں نے آپ کو دور اور نزدیک دونوں طرح سے دیکھا۔ بے حد مخلص اور دردمند پایا۔ صبح سے شام تک آپ کی زبان سے جو تقریر تیر شح ہوتی تھی اگر وہ قلم بند ہو سکتی تو ہر روز ایک نہایت بلند پایہ، نہایت دلچسپ اور معلومات پر مبنی کتاب بن جایا کرتی۔ میں جب ملاقات کر کے آتا تو کئی دنوں تک اسی نشہ میں سرشار رہتا۔ احباب سے بھی یہی باتیں رہتیں۔ آخری چند سالہ مرض کے ایام میں آپ کی روح مادی اثرات سے بہت کچھ آزاد ہو چکی تھی۔ آپ کی صحبت میں ایک طالب حقیقت کو وہی حظ حاصل ہوتا تھا جس کی طرف عارف رومی نے توجہ دلائی۔

یک زمانے صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

میں نے حضرت علامہ کے وجود میں کیا پایا؟ ایک باخبر رفیق راہ جو کٹھن منزلوں میں پوری رفاقت کرے۔ ایک شفیق بزرگ جو کامل دل سوزی سے حل اشکال کردے۔ ایک مرشد طریق جو نشیب و فراز جادہ و منزل سے آگاہ ہو۔ ایک واقعی ہم خیال جو اس دنیا میں ناپید ہے۔ ایک محبوب دوست جس کی محبت روز بروز پھلتی پھولتی محسوس ہو۔ ایک خدا رسیدہ عارف جس کی صحبت میں دنیوی مصائب کا گلا گھٹ جائے۔ ایک جامع شرق و غرب فاضل جس کی زنبیل علم و فضل میں ہر سوال کا جواب مہیا ہو۔ آہ یہ مقام جہاں یہ دولت میسّر ہوتی تھی۔

ایا منازل سلمٰی فاین سلماک

اے سلمٰی کے ٹھہرنے کی جگہو! تمھاری سلمٰی کہاں روپوش ہو گئی؟

آج جو لوگ ان کے ماتم میں پیش پیش ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر ان کی تعلیم کے عملی پہلو کے منکر ہیں۔ قدردانی یہ نہیں کہ ہم ان کے ماتم میں عظیم الشان جلسے کیا کریں اور طویل مرثیے لکھیں۔ اگر ہم ان کی روح کو تسکین دینا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کی تعلیم کی عملی تبلیغ کرنی چاہیئے ان کا ذوق خودداری، خلوص، سوز و گداز، وسعت مشرب اور بلندیٔ عزائم ہمارا مطمع نظر ہونا چاہیئے۔ انہوں نے ایک ہی گیت ہولے ہیں گایا، ایک ہی رمز ہزار طرح سمجھائی۔ ایک ہی بات بار بار کہی۔ صرف اس لیے کہ ہم سمجھیں، سمجھ کر متاثر ہوں اور حیوانیت و غلامی کے زنداں سے نکل کر انسانیت و آزادی کی روح پرور فضا میں سانس لینے کے قابل ہو جائیں۔ میں اس گزارش کو علامہ مرحوم کے ایک مناسب محل شعر پر ختم کرتا ہوں جو عہد جہانگیری میں کہا جاتا تو شاعر پر گوہر و الماس نچھاور کر کے بھی قدردانی کا حق ادا نہ ہو سکتا۔ فرماتے ہیں:

بحرفے می تواں گفتن تمنّائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

علامہ کی رحلت پر میرا یہ تاثر ماہنامہ "بلاغ" ماہِ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔

فقید الشرق

علامہ سر اقبال رحمۃ اللہ علیہ

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح تمام عالم انسانیت کے لیے وہ زہرہ گداز پیام لے کر طلوع ہوئی جس کو تاریخ علم و دیانت میں بیسویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا حادثہ تسلیم کیا جائے گا۔ عارف رومی سے سات سو سال بعد رفقائے اسلام و انسانیت کو بیدار کرنے کے لیے ایک مردِ خدا مست مبعوث ہوتا ہے جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بادل امنڈ رہے ہیں۔ گلے میں فریادیں ابل رہی ہیں۔ سینے میں آہوں کے آتش کدے فروزاں ہیں۔ وہ اپنی چنگاری سے جہانِ بارد کی پہنائیوں کو گرمادینا چاہتا ہے — اقبال، آہ وہ اقبال جو اس دنیائے دُوں میں انسانیت کبریٰ کا نمونہ تھا۔ جو اپنے منتظر فوق البشر (SUPERMAN) کی خود مثال تھا۔ جس کی صحبت

یک زمانے صحبتے با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کا صحیح مصداق تھی جس کی خلوت و جلوت، اللہ، محمدؐ، قرآن، حجاز اور بیت العتیق کے رُوح افروز تذکروں سے معمور تھی، جس نے ہمارے "رہ بتر کستان"، قافلے کو اپنی بانگ درا کے جوش، جبریلی بال کی جنبش اور کلیمی ضرب کی صولت سے منزل کعبہ کی طرف رہنمائی کی — آج عظمت انسانی کا یہ مقدس دانہ بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے خلوتِ خاک میں گوشہ نشیں ہوتا ہے — وقت آگیا ہے کہ ہم اس کی چہل سالہ فریادوں کا مطلب سمجھیں اور اس کی حقیقی زندگی سے جو اب شروع ہے بہرہ اندوز ہوں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اقبالؒ اور تشکیلِ کردار

کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میں اور جناب خالد اسحاق، ایڈووکیٹ کراچی، مولانا ماہر القادری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس شعر و ادب اور مائدۂ اکل و شرب سے فارغ ہو کر گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ میرا قیام ان دنوں خالد صاحب کے بنگلے پر تھا۔ وہ اپنی کار خود ہی چلا رہے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ ان کا کتب خانہ کراچی کے بڑے بڑے کتب خانوں میں ایک ہے۔ اس وقت ان کے پاس مختلف علوم فنون اور مختلف مشرقی و مغربی زبانوں کی انیس ہزار کے لگ بھگ کتابیں تھیں آج تو ان کی تعداد ۲۵ ہزار سے بھی زیادہ ہو گئی ہو گی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور حافظہ قابلِ رشک ہے۔ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ کتابوں ہی پر صرف ہو جاتا ہے۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے مجھے صحابی بخفی کی ایک رباعی یاد آ گئی۔ میں نے اس کا دوسرا شعر پڑھا پوری رباعی اس طرح ہے:

عشق آمد و سوخت بادِ کفر و دیں ہا
شد آئینۂ جمال او آئیں ہا

ہر چند کہ علم و فضل گفتم رد کرو
کاے گول منم مراد و مقصد زیں ہا

اس کے ساتھ مولانا جامی کی ایک رباعی کا پہلا شعر یاد آ گیا:

در رفعِ حجب کوش نہ در جمع کتب
کز جمع کتب نمی شود رفعِ حجب

خالد صاحب معروف، کامیاب اور ملک بھر کے ممتاز قانون دان اور ماہرِ اسلامیات ہیں۔ مختلف علمی، ادبی، دینی، قانونی، تاریخی اور فلسفیانہ موضوعات پر مدلل اور موثر گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت انہوں نے مذکورہ بزرگوں کے کلام پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ شاید

اس کی وجہ یہ ہو کہ کتابیں جمع کرنے اور ان سے مستفیض و مستفید ہونے کا ذوق اپنی جگہ کتنا ہی اہم سہی، کتابی علم روحِ بشر کا حقیقی مقصود نہیں۔ البتہ علم نافع حصولِ مقصود کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس وقت سحابی ہی کی ایک اور رباعی سامنے آرہی ہے جو مذکورہ رباعی سے بھی تیز تر ہے۔

خود آرائی و ننگ و نام است ایں ہا
در مذہبِ عاشقاں حرام است ایں ہا
ایں علم و فنِ تو شیوۂ خاصاں نیست
بل آرزوئے قبولِ عام است ایں ہا

یہ عاشقوں یعنی عارفوں کی باتیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے پاس صرف ایک کتاب اور اس کا عملی پیکر ایک ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ کوئی کالج، یونیورسٹی اور لائبریری ان کے پاس نہیں تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے نصف صدی سے کم مدت میں تینوں برِّ اعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ، میں اپنی دینی، اخلاقی اور سیاسی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے اس کی وجہ علمی اسناد یا ڈگریاں نہیں تھیں۔ کردار کی پاکیزگی اور عظمت تھی۔ علم کی مخالفت یا تردید مقصود نہیں۔ کیونکہ علم تو انسان کا وہ شرف ہے جس کی وجہ سے وہ مسجودِ ملائک بنا۔ لیکن اگر علم کا صحیح استعمال نہ کیا جائے تو وہ بقولِ پیر روم "علم را بر تن زنی مارے بود" کا مصداق بن جاتا ہے۔

ہم جیسے جیسے پہلی صدی ہجری سے آگے بڑھتے گئے علم پھیلتا گیا۔ اس کے نتیجے میں فرقے بنتے گئے۔ قوم کردار سے تہی دست ہوتی گئی۔ ہر فرقے نے اپنی کتابوں کو آگے اور خدا کی کتاب کو پیچھے کر دیا۔ (الا ما شاء اللہ)۔ اقبال کو کہنا پڑا:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر[1]

لسان العصر اکبر الہ آبادی نے مذہب کے اس پھیلاؤ اور اختلافی کتابوں کی کثرت سے تنگ آکر کہا تھا:

یہ صندوقِ کتب اب مجھ سے یارب اٹھ نہیں سکتا
یہ مذہب ہے تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا

---

[1] "کلیاتِ اقبال اردو" ("بانگ درا") ص ۲۰۴۔

یہ صندوقِ کتب جس کو حقیقتاً جہازہائے کتب بھی کہیں تو شاید واقعیت کا پورا اظہار نہ ہوسکے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے ہوتا اور وہ شب و روز ان کی تشریح، تدریس اور ریسرچ میں منہمک ہوتے تو جہاد کون کرتا اور اقصائے عالم میں اسلام کس طرح پہنچتا؟ علامہ نے کہا تھا:۔

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را[۲]

سقراط عظیم فلسفی تھا اور صاحبِ تیغ و سپر بھی تھا۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بکثرت ہوتے رہے ہیں جن کے علم و کمال نے ان کو تیغ و سپر سے بیگانہ نہیں بنایا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جس کو انگریز نے غدر کا نام دیا، ہمارے علماء ہی تھے جنہوں نے انگریز کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا اور بے پناہ مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ برِصغیر کی تقسیم کے وقت بھی ہمارے علمائے کرام میدانِ عمل میں اترے۔ انہوں نے قوم کو تین زبردست مخالف قوتوں کے سامنے صف آراء کردیا۔ انگریز، ہندو اور کانگرسی مسلمان ہر قیمت پر مسلم لیگ اور اس کے مطالبۂ پاکستان کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ لیکن قائدِ اعظم کے بے مثل تدبر نے علمائے کرام کا عملی تعاون حاصل کرکے سب کو شکست فاش دے دی۔

علامہ اقبال ان دنوں اپنے طویل مرض میں صاحبِ فراش تھے لیکن وہ اپنے بسترِ علالت سے مسلمانوں کی صحیح سمت رہنمائی کرتے رہے۔ ان کا ذہن و دماغ اس وقت بھی صراطِ مستقیم پر رواں دواں تھا۔ انہوں نے قوم کی عملی قوتوں کو متحرک کیے رکھا۔ یہ ان کی غیر معمولی بصیرت ہی تھی کہ ان کو مسلمانوں کی کئی جماعتوں، فرقوں، انجمنوں اور ان کے بڑے بڑے مشہور مخلص و جانباز اور شعلہ بیاں قائدوں کے ہجوم سے الگ صرف ایک شخص ایسا نظر آیا جو ان کے نزدیک قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچا دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ یہ ان کے اسلامی شعور قرآنی بصیرت اور عقل دوررس کا ایک معجزانہ عمل تھا جو قائداعظم کو ان کے گوشۂ عافیت سے نکال کر قوم اسٹیج پر لے آیا اور پھر اپنے آخری سانس تک اپنے مشوروں سے ان کی رفاقت کا

۲۔ "کلیاتِ اقبال فارسی" ("زبورِ عجم") ص ۴۹۶۔

حق ادا کرتے رہے۔ یہ فیض تھا اس کتابِ نور کا جو اپنی ابتداء سے اختتام تک جہد و عمل ہی کی تلقین و تاکید سے معمور ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :-

"کوئی مسئلہ ہو۔ کیسی بھی مشکل پیش آئے، قرآنِ مجید سے رجوع کرتا ہوں تو مجھے اس کا حل مل جاتا ہے۔"[۳]

اس موقع پر حضرت فاروقِ اعظمؓ یاد آرہے ہیں جنھیں علامہ نے اپنے خطبات میں "اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب" قرار دیا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "امیر المومنین! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی تھیں"۔ آپ نے کہا "کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی باتیں لکھی ہیں"؟ اس نے کہا "نہیں"۔ آپ نے فرمایا۔ "یاد رکھو! تم سے پہلی امتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے یہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا"! آپ ہی کا یہ ارشاد مشہور ہے جو حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں آپ کی زبان سے نکلا: "حسبنا کتاب اللہ"۔

امّتِ مسلمہ کو تمام سابقہ امّتوں میں یہ امتیاز حاصل ہوا کہ قرآنِ حکیم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی۔ جس کو دشمنانِ اسلام بھی ماننے پر مجبور ہیں۔ جیسا کہ سر ولیم میور نے کہا ہے :-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی کتاب قرآن آج بھی کسی کمی بیشی کے بغیر ویسی کی ویسی موجود ہے جیسی محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے اپنے پیروؤں کو دی تھی"۔

قرآنِ حکیم کے بہت سے اسماء و صفات خود قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً شفا، برہان، مبارک، حکیم، عزیز، مہیمن وغیرہ ان میں ایک نام "نور" بھی ہے :-

"تمھارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آچکی ہے"۔ (۵ : ۱۶)۔

"ہم نے اس قرآن کو نور قرار دیا، اس کے ذریعے ہم بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں"۔ (۴۲ : ۵۲)۔

۳۔ سید نذیر نیازی، "دانائے راز" (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۹ء) ص ۴۳۰۔

"تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے یقینی دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمھاری طرف واضح نور اتارا ہے۔" (۴ : ۱۷۵)

علمائے لغت کے نزدیک نور اُسے کہتے ہیں جو خود واضح ہو اور دوسری اشیاء کو روشن اور واضح کردے۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح قرآن خود روشن دلیل ہے۔ اسی کی روشنی میں ہم تمام کائناتی علوم سے صحیح استفادہ کرسکتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ غلطی لگی کہ ہر فرقے نے اپنے علماء و مشائخ کی تصانیف کی روشنی میں قرآن کو دیکھا اور اللہ کی کتاب کو انسانوں کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر علامہ اقبال چیخ اٹھے :۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق[۴]

زمن بر صوفی و مُلّا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند ما را

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خُدا و جبریلؑ و مصطفیٰؐ را[۵]

جن بزرگوں نے قرآن مجید کی مخلصانہ خدمت کی ہے امت ان کے آگے احسانات کی ہمیشہ معترف رہے گی۔ وہ اس بے توفیقی اور تاویل پسندی سے مستثنیٰ ہیں (رحمۃ اللہ علیہم)

قرآن مجید اس لیے نازل نہیں ہوا کہ خوش الحان قاریوں کی سریلی آواز کو سُنیں اور تحسین و آفریں کے نعرے بلند کرتے رہیں۔ بقول لسان العصر اکبر الہ آبادی :۔

داد قرآں کی نہ دو بھائی عمل اس پہ کرو
پیش درگاہِ خدا داد کی حاجت کیا ہے؟

۴۔ "کلیاتِ اقبال اردو" ("ضربِ کلیم") ص ۴۸۴۔
۵۔ "کلیاتِ اقبال فارسی" ("ارمغانِ حجاز") ص ۹۵۶۔

نہ یہ غرض تھی کہ عمر بھر ریسرچ کی محفلیں سجاتے رہیں اور اپنی ساری توانائیاں محض نکتہ آفرینیوں میں صرف کرتے رہیں۔ قرآن حکیم کا اوّل و آخر سعی و عمل ہے۔ بیس مرتبہ یہ تاکید دہرائی گئی ہے "**الذین آمنوا و عملوا الصالحات**"۔ یعنی ایمان اور اعمال صالح دونوں مل کر اسلام مکمل ہوتا ہے اور صحیح نتائج پیدا کرتا ہے۔

اعمالِ صالحہ کیا ہوتے ہیں؟ صرف وہی جو قرآن حکیم نے بتائے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے کر کے دکھائے اور اپنی حیاتِ مبارکہ میں صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت اپنے اسوۂ حسنہ کی متبع تیار کر دی۔ لیکن ہمارے بے شمار فرقوں نے اپنے اپنے اعمالِ صالحہ غیر اقوام کی نقالی میں ایسے ایسے ایجاد کر لیے جن کا نام و نشان بھی صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عہد میں نہیں ملتا۔ علامہ نے اپنے کلامِ نظم و نثر میں بتکرار قوم کو متنبہ کیا ہے۔ آپ کا آخری پیغام قوم کے نام یہ تھا:۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است[۲]

اور بقول سعدی:۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
بزہد و ورع کوش و صدق و صفا — ولیکن میفزای بر مصطفیٰؐ

یعنی دین پورے کا پورا حضورؐ کے اسوۂ حسنہ میں محدود ہے۔ اس سے ہٹ کر ہم نے اپنے اپنے طور پر جو بے شمار اسلام بنا لیے ہیں علامہ بڑے سوزِ دل سے اس کو "بولہبی" قرار دیتے ہیں۔

یہی پیغام شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے "مکتوبات" میں بار بار دہرایا کہ اسلام میں کسی قسم کی سیئہ ہو حسنہ، بدعت کی گنجائش نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ سرتاپا عمل تھی۔ جس کا اعتراف لسانِ وحی میں اس طرح کیا گیا ہے:

"آپ کو دن کے وقت بہت کام ہوتے ہیں"۔ (۷۳ : ۸)۔

اور آگے بڑھیے تو اسلام کا خدا کسی وقت بھی عمل سے فارغ نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"ان ربک فعال لما یرید" تیرا رب جو چاہتا ہے کر کے رہتا ہے۔ (۱۱ : ۱۰۸)۔

۲۔ "کلیاتِ اقبال اردو" ("ارمغانِ حجاز") ص ۶۹۱۔

"فعال" صیغۂ مبالغہ ہے" فاعل سے یعنی بہت زیادہ کام کرنے والا۔

" کل یوم ھو فی شان" (ہر روز اس کو ایک دھندا ہے (شیخ الہند)۔) (۵۵ : ۳۰)

"دھندہ" کے معنی ہیں کام کاج، کاروبار، مصروفیت، پیشہ، ہنر" (نسیم اللغات)

او لم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما :

(جانوروں کو تم نے نہیں بنایا۔ اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا ہے) (علامہ عثمانیؒ)

(۳۶ : ۷۲)

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی صناعی اور حکیمانہ کارکردگی سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان صحیح معنی میں مسلمان جب ہی ہو سکتا ہے کہ تخلق باخلاق اللہ اور اسوۂ نبویؐ کے مطابق سراپا عمل ہو جائے۔

علامہ اقبال اپنے پیغام کی تفصیلات میں ہماری بے عملی اور بدعملی سے نالاں رہے اور مسلسل عمل ہی کی دعوت دیتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے :

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے [۷]

وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کلام طاؤس و رباب کی زینت بنا رہے یا محض ریسرچ کے مشغلے پر اکتفا کی جائے۔ قرآن اللہ کا پیغام ہے زندگی بخش : " اللہ اور رسولؐ کی بات سنو۔ جب وہ تم کو زندہ کرنے کے لیے پکارے"۔ (۸ : ۲۴)۔

اسی کی پیروی میں علامہ قوم کے تنِ مردہ میں زندگی کی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ فرماتے ہیں : " کہ خاکِ راہ کو میں نے سکھایا رازالوندی"۔ [۸]

وہ سرتاپا حرکت و عمل اور سعی و جہاد کے پیامبر تھے۔ بقول مولانا گرامی :

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ان کی فارسی شاعری کا آغاز ہی تلوار سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کے کلام کی فضا میں

۷۔ ایضاً۔ " بانگِ درا" (ص ۲۷۴)

۸۔ ایضاً "بالِ جبریل" (ص ۳۰۶)

جا بجا تلوار چمکتی نظر آتی ہے یا اس کے مترادفات و مفہومات۔ انہوں نے اپنی پہلی مثنوی "اسرارِ خودی" میں قوم کو یہ نعرہ دیا اور اسی کے ذریعے اپنے پیغام کا تعارف کرایا:

مصرع کارید دشمشیرے دردو[۹]   باغبان زورِ کلامم آزمود

ان کے زورِ کلام اور صحیح سمتِ فکر نے مسلمانوں کو ایک مجاہد اعظم عطا کیا جس نے انگریز اور ہندو کے بے پناہ لشکروں کے سامنے مسلمانوں کو صف آرا کر دیا اور ایسی فتح حاصل کی جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

علامہ اسلاف کا اسوۂ عمل پیش کرتے ہوئے "جواب شکوہ" میں فرماتے ہیں:

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا
ان کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اُسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا[۱۰]

اور اب یہ حالت ہے کہ "بے عمل تھے ہی جواں، دین سے بدظن بھی ہوئے[۱۱]"، لیکن علامہ اقبال ایسے حالات میں بھی مایوس نہیں ہیں۔ جیسا کہ اسی نظم میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:

قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا[۱۲]
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے[۱۳]
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری[۱۴]

۹۔ "کلیاتِ اقبال فارسی" ("اسرارِ خودی") ص ۵۔
۱۰۔ "کلیاتِ اقبال اردو" ("بانگِ درا") ص ۲۰۳۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۴   ۱۲۔ ایضاً۔ ص ۲۰۶۔
۱۳۔ ایضاً۔   ۱۴۔ ایضاً۔

یہ اشعار آج سے قریباً پونی صدی پہلے انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں پڑھے گئے تھے جبکہ پورا عالمِ اسلام مغرب کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور آج پچاس کے قریب اسلامی ممالک آزاد ہیں۔

آخری بند میں مسلمان کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مردِ درویش! خلافت ہے جہاں گیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں[۱۵]

وہ سکون و جمود کو زندگی کی ضد اور موت کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ سرشتِ حیات کا راز ان کے نزدیک کیا ہے :

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی[۱۶]

اور

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی[۱۷]

ان کی طویل نظم "طلوعِ اسلام" پوری کی پوری جہد و عمل کا پُرجوش نعرہ ہے۔ فرماتے ہیں :۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۰۷، ۲۰۸
۱۶۔ ایضاً، ص ۳۲۳۔ ۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۹۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں[۱۸]

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا[۱۹]

یہ شعر تفسیر ہے اس آیت پاک کی: "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ انؐ کے ساتھ ہیں وہ کفّار کے خلاف پُرجوش ہیں۔ لیکن آپس میں نرم اور مہربان ہیں" (۴۸: ۲۰)

"جہانِ عمل" کے عنوان سے ایک نظم میں علم کو عمل کے بغیر مردہ کہتے ہیں۔ اس میں نفخِ روح کردیں تو وہ عمل بن جاتا ہے:

ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم
علم را جاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم[۲۰]

علامہ کے نزدیک کردار کی اہمیت اس نظم سے بہت نمایاں ہوتی ہے جس کا عنوان ہے "نپولین کا مزار":

راز ہے، راز ہے تقدیرِ جہاں تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز[۲۱]

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۷۲۔ ۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۳
۲۰۔ "کلیاتِ اقبال فارسی" (پیامِ مشرق)، ص ۲۹۴۔
۲۱۔ "کلیاتِ اقبال اردو" ("بالِ جبریل")، ص ۴۴۱، ۴۴۲

یہ شعر غالباً اشارہ ہے اس آیۂ کریمہ کی طرف: "کافروں کو تم نے نہیں مارا تھا بلکہ ان کو اللہ نے مارا تھا اور جب تو نے پتھر پھینکے، تو نے نہیں پھینکے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکے تھے" (۸ : ۱۸)۔

فانی زندگی، اس کا مصرف پھر، اس کے بعد ــــ یہ تینوں نکتے ایک شعر میں سمیٹ لیے ہیں:

ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

یہ مبحث خواجہ حافظ کے ہنگامہ پرور شعر پر ختم کرتے ہیں:

"عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز"[۲۲]

علامہ کے نزدیک کردار کی عظمت کے مقابلے میں ہفت اقلیم کی شہنشاہی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ یہ آنی و فانی ہے اور وہ جاودانی۔ علامہ کا حسنِ تقابل ملاحظہ فرمائیے:۔

میرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی[۲۳]

فقر اور آدم گری سے مراد کردار سازی ہے جس کو فراموش کر کے ہم ان کے زندگی بخش پیغام کو طبلہ و سارنگی کے حوالے کر کے مطمئن ہو گئے اور نازک آئینہ سازی کو اپنا نصب العین بنا لیا جس کا انجام چکنا چور ہو جانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس شعر میں بھی اس آیت کا پرتو نظر آ رہا ہے:۔

"تم جلدی سے ملنے والی نعمت کو پسند کرتے ہو اور بعد میں آنے والی نعمت کو نظر انداز کر دیتے ہو" (۷۵ : ۲۲)۔ پنجابی ضرب المثل ہے: اِہ جگ مٹھا، اگلا کس ڈٹھا۔

کردار کا استحکام اور تاثیر سورۂ مزمل کی ابتدائی آیات میں ملتی ہے۔ "قم اللیل" سے "اشد وطاء لک" پڑھ جائیے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ شب خیزی اور تفکر فی القرآن سے خفتہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور نفس بہیمی کو پامال کرنے میں مدد ملتی ہے۔ علامہ کا ارشاد ہے:

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۴۲۔ ۲۳۔ ایضاً، ص ۴۳۸۔

واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پُر اسرار[۲۴]

اس موقع پر حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نورانی رباعی پیش کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بقول نظیری نیشاپوری :۔

پائم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟

خواجہ فرماتے ہیں :

شب خیزی کہ عاشقاں بشب راز کنند
گردِ در و بامِ دوست پرواز کنند
ہر جا کہ درے بود بشب بر بندند
الا درِ دوست را کہ بشب باز کنند

اللہ ! اللہ !! رات کو جب سب دروازے بند ہو جاتے ہیں، قبولیت اور التفاتِ دوست کا دروازہ اسی وقت کھلتا ہے۔ بقولِ شاعر :

اللیل للعاشقین ستر یالیت اوقاتہ تدوم

(رات عاشقوں کے لیے پردہ یعنی خلوتِ دعا ہے۔ اے کاش یہ لذت جاودانی ہوتی)

حضر علامہ علم اور فقر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ[۲۵]

اگر تحصیلِ علم کے بعد عقل و خرد کو پاک باز و پاک اندیش نہیں کر سکے تو وہ علم بے مقصود و نامراد رہ گیا۔ اسی طرح اگر فقر کی مزاولت سے قلب و نگاہ عفیف نہ ہو تو وہ فقر نہیں، مجاوری یا پیری کے بہروپ میں گداگری ہے۔ زیادہ فاش گوئی سے کام لیا جائے تو اللہ والوں کے نزدیک حرام خوری اور استخوان فروشی ہے۔

۲۴۔ ایضاً ، ص ۳۳۷ ۲۵۔ ایضاً ، ص ۳۶۹

علامہ حقیقی فقر اور نمائشی فقر کا تعارف کراتے ہیں :

" قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن[۲۶] !

ان کی ایک غزل کا مطلع ہے :-

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی[۲۷]

کردار سے تہی دامنی ہمارے احبار و رہبان کی اکثریت پہ چھا گئی - اس احساس نے علامہ سے یہ شعر کہلوایا :-

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی ، نہ محبّت ، نہ معرفت ، نہ نگاہ[۲۸]

- یہی چاروں چیزیں زندگی ، محبت ، معرفت اور نگاہ ، کردار کے عناصر اربعہ تھے - جب ہمارے مقدس اداروں سے یہ رخصت ہوگئے تو ہم جو عوام ہیں ، یہ سودا کس دکان سے خرید سکتے ہیں ؟

حضرت ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے :-

" ھل افسد الدین الا الملوک و احبار سوء و رھبانھا " (دین کی خرابی کا باعث اہلِ اقتدار اور بے کردار علماء و مشائخ ہوتے ہیں)

کردار کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو علامہ کے کلام میں ایسے اشعار کی اتنی کثرت ملتی ہے کہ اگر انہیں پیغمبرِ کردار کہا جائے تو کچھ بھی مبالغہ نہ ہوگا - اس سلسلے میں اشعارِ ذیل خصوصاً ملاحظہ طلب ہیں :-

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی[۲۹]

---

۲۶ - ایضاً ، ص ۳۵۳ - ۲۷ - ایضاً ، ص ۳۶۷ -
۲۸ - ایضاً ، ص ۳۳۸ - ۲۹ - ایضاً ، ص ۳۴۹ -

کردار کا قدیم ترین اور متاعِ انبیاء نمونہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اصحاب میں ملتا ہے:
"ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں تمہارے لیے ایک اچھا نمونہ موجود ہے"۔ (۶۰ : ۵)۔
علامہ فرماتے ہیں:

براہیمیؑ نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں[۳۰]

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا[۳۱]

زندگی سراپا جہاد ہے۔ پختگیٔ کردار کے سوا حقیقی فتح مندی حاصل نہیں ہو سکتی:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں[۳۲]

قوت، پاکیزگی اور عظمتِ کردار کا منبع صرف اللہ کی ذات ہے۔ غیر اللہ کی غلامی ان صفات حسنہ سے محرومی کے مترادف ہے:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا، نہ تن[۳۳]

خودی کی بیداری کی تاثیر دیکھیے:

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق[۳۴]

مومن کی شان بتاتے ہیں:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان[۳۵]

۳۰۔ ("بانگِ درا")، ص ۲۷۱۔ ۳۱۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔
۳۲۔ ایضاً، ص ۲۷۲۔ ۳۳۔ ایضاً ("بالِ جبریل")، ص ۳۲۳۔
۳۴۔ ایضاً ("ضربِ کلیم")، ص ۵۲۲ ۳۵۔ ایضاً، ۵۲۲

جس کے ایمان میں "کل یوم ھو فی شان" کا ایقان شامل ہو جائے وہ ایک حال میں جامد کیسے رہ سکتا ہے؟ بقول پیر روم :-

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بروے می رسی آنجا مبیست

خواجہ فرید بھی اسی مقام سے بول رہے ہیں:

عمراں گذریاں پند کریندیاں اجے یار دا ڈیرہ پرے توں پرے
تھک نہ بہیں تے نہ ہار فریدا بھاویں یار قبول کرے نہ کرے

صوفیہ کرام کی اصطلاح میں اس کو "سیر فی اللہ" کہتے ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں۔ کردار کا اعجاز یہ ہے کہ متضاد صفات ایک ہی ذات میں مرتکز ہو کر ایک دوسرے کی معاون بن جاتی ہیں:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن[36]

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز[37]

"اشداء علی الکفار رحماء بینھم" (کفار کے خلاف پُرجوش، آپس میں نہایت نرم و رحیم)۔ (۴۸ : ۳۰)۔

صاحبِ کردار کی دلوں کو موہ لینے والی خوبیاں دیکھیے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے[38]

خود علامہ کو اللہ تعالیٰ نے نگاہِ بلند، سخنِ دل نواز اور جاں پُرسوز سے بہرہ وافر عطا فرمایا تھا۔ جن لوگوں کو ان کی ہم نشینی کی سعادت میسر آئی ہے وہ ان کا اعتراف کریں گے۔

ایک اور جگہ صاحبِ کردار کا تعارف کراتے ہیں:

---

۳۶ - ایضاً، ص ۵۰۷ - ۳۷ - ایضاً ("بالِ جبریل")، ص ۲۸۹ -

۳۸ - ایضاً، ص ۳۴۱ -

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز[۳۹]

ہماری اکثریت حصولِ زر اور تلاشِ معاش کی لگن میں کردار سے محرومی کا شکار ہو جاتی ہے۔ علامہ اس پر زبردست ضرب لگاتے ہیں :

اے طائرِ لاہوتی ! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی[۴۰]

صدق، عدل اور مردانگی کا اجتماع انسان کو مرتبۂ امامت کا مستحق بنا دیتا ہے :-

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا[۴۱]

آج جو میکیاولی یا چانکیہ کے پیرو قیادت کے مدعی ہیں ان اسلامی اوصاف سے عاری ہونے کے باعث فرعون کی طرح انسانیت کو جہنّم کی طرف لیے جا رہے ہیں اور نہیں سمجھتے:

"وھم لایشعرون" (۱۷ : ۹۶)۔

علامہ کے نزدیک ان کے پیکرِ خاکی جان سے محروم ہیں :

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے[۴۲]

حکیم سنائی غزنوی فرماتے ہیں :

مردگی جہل و زندگی دین است ہرچہ گفتند مغز آں ایں ست

ان بزرگوں نے یہ نکتہ قرآنِ حکیم سے حاصل کیا ہے جو کفار کو اموات موتیٰ اور من فی القبور کہتا ہے :-

"تو ہرگز مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔" (۲۷ : ۸۱)

"زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سننے کی توفیق دیت

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۸۹ ۴۰۔ ایضاً، ص ۳۴۸۔
۴۱۔ ایضاً ("مانگ درا")، ص ۲۷۰۔ ۴۲۔ ایضاً، ص ۲۵۹

ہے۔ تو ان کو نہیں سنا سکتا جو قبروں میں دبے ہوئے ہیں۔" (۲۵ : ۲۳)۔

کردار ہی سے تقابل و تصادم کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کی قوت پیدا ہوتی ہے :

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم　　زورِ خود را از مہماتِ عظیم[۴۳]

زندگانی قوتِ پیداستے　　اصلِ او از ذوقِ استیلاستے[۴۴]

با توانائی صداقت توام است　　گر خود آگاہی ہمیں جام جم است[۴۵]

مردانِ حق پہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ اپنی جان کی بازی لگا کر حق کا علم بلند رکھتے ہیں:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست[۴۶]

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو۔ وہ اپنے رب کے حضور زندہ ہیں اور انہیں رزق ملتا ہے۔" (۳ : ۱۷)۔

علامہ کی شاعری کارزارِ حیات میں ایک بلند آہنگ رجز کی شان رکھتی ہے۔ ان کے اشعار ہنگامہ و نبرد کے پروردگار ہیں :

بے خبر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی[۴۷]

کہاں یہ جرأت و جسارت اور کہاں رابندرا ناتھ ٹیگور کی خواب آور میٹھی لوریاں۔ یہی عزم و ہمت اور بے خوفی و بے باکی علامہ کو شعرائے عالم میں ممتاز کرتی ہے۔

کلمۂ توحید پہ ایمان و ایقان دلبری و قاہری دونوں کو ایک ذات میں جمع کر دیتا ہے۔ اس کے فقدان پہ علامہ آنسو بہاتے ہیں :۔

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ[۴۸]

۴۳۔ "کلیاتِ اقبال فارسی" ("اسرارِ خودی")، ص ۴۹۔　۴۴۔ ایضاً، ص ۵۰۔
۴۵۔ ایضاً۔　۴۶۔ ایضاً، ص ۴۹۔　۴۷۔ "کلیات اقبال اردو" ("بانگِ درا")، ص ۱۷۸۔
۴۸۔ ایضاً، بالِ جبریل ۳۴۶

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے[۴۹]

دوسروں کی تقلید، نقالی اور احتیاج اپنی ذات اور ملی روایات پر عدمِ اعتماد اور غیروں کے سہارے زندگی گزارنا کردار کی موت ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگراں رفتن عذاب است[۵۰]

درجہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں با پرو بالِ دگراں[۵۱]

بقول سعدی:

رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت
حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است

مشرق کی اکثریت مغرب کی ذہنی غلامی پر نازاں ہے۔ اس کی ہر بھونڈی ادا کو بھی اپنا قبلہ مقصود سمجھ رہی ہے۔ علامہ کے نزدیک یہ زندگی کی علامت نہیں ہے:

زندگی از طوفِ دگر رستن است — خویش را بیت الحرم دانستن است[۵۲]
آتشے افروز از خاشاکِ خویش — شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش[۵۳]
از گلِ خود آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن[۵۴]

یہ اعلیٰ صفات نازنینی اور آسائش طلبی سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس کے لیے کردار کی محکمی کی ضرورت ہے:

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن — تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن[۵۵]

جن لوگوں نے امتوں کی بنیادیں رکھی ہیں وہ عصرِ حاضر کے ناز پروردہ، راحت کوش اور

۴۹۔ ایضاً، ۳۲۵۔ ۵۰۔ "کلیاتِ اقبال فارسی" ("پیغامِ مشرق")، ص ۲۲۹۔
۵۱۔ ایضاً، ص ۲۴۴۔ ۵۲۔ ایضاً ("اسرارِ خودی")، ص ۶۶۔
۵۳۔ ایضاً، ص ۶۷۔ ۵۴۔ ایضاً، ص ۴۹۔
۵۵۔ ایضاً، ص ۴۸۔

عیش پسند انسانوں کی طرح ہوتے تو کوئی بھی حیات افروز تحریک جنم نہ لے سکتی! عقائد و اخلاق کی پاکیزگی کا تصوّر ہی پیدا نہ ہوتا۔ انسانیت کو دورِ وحشت سے نکلنا ہی نصیب نہ ہوتا وہی کوہ وقار اور اسوۂ استقلال لوگ تھے جنہوں نے انسان کو حیوان کی سطح سے بلند کیا۔ انہی کے اسمائے گرامی سلسلۂ ذہب کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی ایک کڑی علامہ اقبال کے وجود میں نمودار ہوئی۔ علامہ نے اسی مقدّس و مطہر اور زندہ و پائندہ پیغام کو ایسے حسین اسلوب اور جرأت و جسارت کے پیکر میں بین الاسلامی بلکہ بین الاقوامی اسٹیج پر جلوہ افروز کیا۔ جس کی نظیر گذشتہ کئی صدیوں کی عالمی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ان پر قابلِ قدر تحریری کام عالمی سطح پر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ انشاءاللہ العزیز۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اور آگے بڑھ کر کردار و عمل کی وادی میں قدم رکھا جائے۔ نوجوانوں کی ایک جماعت صرف اسی کو اپنا نصب العین بنائے۔ اس کے ارکان خود اسوۂ کردار بنیں اور صحابہ کرامؓ کی پیروی میں اسی کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرتے جائیں۔ ان کے سامنے علامہ کا یہ ارشاد رہنا چاہیئے:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن[۵۶]

قرآنِ حکیم سے دوری کی وجہ سے آج ہمارا جو حال ہے علامہ نے پوری وضاحت سے اس کی تصویر کشی کی ہے:۔

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو!
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار[۵۷]

روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۵۷۔ "کلیاتِ اقبال اردو" ("ضربِ کلیم")، ص ۵۰۲۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلا نہ فقیہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام[۵۸]

اس آخری مصرعے کی شرح ایک مرحوم اقبال شناس نے یوں کی ہے :۔
اگر مسلمان اقبال کو سمجھ لیتا تو وہ ایک دن بھی غیر کا محکوم و غلام نہ رہ سکتا اور اگر انگریز پر ان کی تعلیم منکشف ہو جاتی تو وہ ایک دن بھی فرنگی کی قید سے آزاد نہ رہ سکتے۔

۵۸۔ ایضاً ، ص ۴۸۷

گر بحرفم غیر قرآں ـــــ اقبالؔ

اقبالؔ پر ایک دلچسپ تنقیدی مکالمہ

نہیں بھائی
آسمان کے نیچے صرف ایک ہی
کتاب ہے جو عقلِ سلیم کی حرف گیری سے بالاتر ہے۔
زیرِ سوال ہیں
" لا لیسل عما لفیعل وھم یسعلون"
ہم مسلمان آپس میں بے شمار اختلاف ہوتے ہوئے بھی قرآن مجید اور خدائے پاک کی اس خصوصیت میں بالکل متحد ہیں ۔

یہ تھے وہ الفاظ جو خواجہ غلام محمد محقق مرحوم امرتسری نے ایک صحبت میں کہے۔ جب کہ میں غالب اور اقبال کو غلطی سے بالاتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہوں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا :

"فنِ تنقید اپنی جدید ترین ترقیوں کے باوجود ابھی اس مقام سے بہت پیچھے ہے جہاں اسے ہونا چاہیئے ۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کسی شخص سے عقیدت رکھتے ہیں تو اس کی خامیوں کو بھی محاسن ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور بے تکلفی یا مخالفت کی صورت میں زیرِ تنقید شخص کی خوبیاں بھی ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس باب میں بھی قرآن ہمارا بہترین رہنما ہے۔ انسانی جماعت کے بہترین افراد انبیاء اور رُسل ہیں ۔ قرآن پاک ان کی فوق البشر فضیلتیں بیان کرتا ہے۔ لیکن جہاں ان کے دامن تقدس پر گرد بشریت کا ایک ذرہ بھی دیکھتا ہے تو اسے بھی مربیانہ اور مصلحانہ انداز میں واضح کر دیتا ہے۔ اس طرح

اگر وہ شدید ترین مخالفوں میں خوبی کی کوئی جھلک دیکھ پاتا ہے تو اس کا اعتراف کرتا ہے۔ غالبؔ ہو یا اقبالؔ یا کوئی اور بزرگ ہمیں سب کو اپنی منصفانہ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ ورنہ غلط روی اور کوتاہ اندیشی کا امکان ہے۔"

میں نے کہا۔

حضرت! اس وقت غالبؔ کو تو چھوڑیئے صرف اقبالؔ کو دیکھیے۔ اس نے عرض حال بحضور رحمۃ اللعالمین میں اپنے متعلق خود کہا ہے۔

گر بحرفم غیر قرآں مضمر است
در دلم آئینہ بے جوہر است

اے فروغت صبح اعصار و ہُور!
چشم تو بتیدۂ ما فی الصدور

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

جب اقبالؔ "غیر قرآں" بات ہی نہیں کہے گا تو اس پر اعتراض کس پہلو سے ہو گا؟ وہ قرآنِ پاک کا ترجمان ہے۔ کیا اس کی غلطی نکالنے والا بالواسطہ قرآن کی غلطی نکالنے کا مرتکب نہیں ہو گا؟

محقق صاحب نے فرمایا:

دیکھو بھائی یہی بات رومیؔ کے متعلق مشہور ہے ع

"ہست قرآن در زبان پہلوی"

اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ شاعر اپنے ماحول اور اپنے فہم و فراست کے مطابق قرآنی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن قرآن کسی خاص ماحول یا انسانی فہم کی پیداوار تو نہیں۔ وہ تو ہر زمانے کے اعلیٰ سے اعلیٰ دماغوں کی رہنمائی کرتا ہے اور انہیں آگے سے آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

اے برادر بے نہایت در گہے است ہر چہ بروے می رسی آں جا مایست (رومیؔ)

اگر ہم یہ نظریہ قائم کر لیں کہ قرآن کے کسی ترجمان پر اعتراض، قرآن پر اعتراض ہو جائے گا۔ تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ قرآنِ پاک کا ہر مترجم و مفسر اعتراض سے بالاتر ہے۔ حال آں کہ آج تک کسی بزرگ کے متعلق ایسا اعتقاد نہیں رکھا گیا۔ دور کیوں جائیں، خود اقبال کے یہی شعر جو تم پیش کر رہے ہو "غیر قرآں" ہوئے جاتے ہیں۔

"حضرت یہ کیونکر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو بھائی ناراض نہ ہو جانا" محقق صاحب فرمانے لگے:

میرے دل میں اقبال کی عظمت تم سے کم نہیں۔ میں اسے نہ صرف شاعرِ مشرق بلکہ شاعرِ انسانیت اور مصلحِ عالم مانتا ہوں۔ تاریخ کے کسی گوشے میں اقبال کی رنگا رنگ خصوصیات کا شاعر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن پھر بھی ہم مسلمان قرآن عزیز کو رہنما مانتے ہوئے اقبال کو اس کی حدود سے آگے لے جائیں تو اقبال شناسی سے محروم رہ جائیں گے۔ اب ان اشعار کو دیکھو محض شعر کی حیثیت سے دیکھیں تو ان کی رعنائی، تاثیر اور فنی تکمیل میں حرف گیری کی گنجائش نہیں اور اگر انہیں قرآن مجید کے سامنے رکھ دیں تو بعض سطحی قسم کے لوگ مجھ پر "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" کا الزام لگائیں گے۔ حضرت آپ اس کی پروا نہ کریں اور واضح فرمائیں کہ یہ اشعار قرآن کی کس آیت سے متصادم ہیں۔

دیکھو بھائی! سیدھی سی بات ہے ہر مسلمان جانتا اور مانتا ہے کہ "روزِ محشر" اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کسی قسم کا اختیار نہیں ہوگا بلکہ بغیر اجازت کوئی لب کشائی بھی نہیں کر سکے گا۔ قرآن و حدیث دونوں ہی اس مفہوم کی صریح شہادت دیتے ہیں۔

الملک یومئذٍ للہ ۔ لیکن ان اشعار میں علامہ مرحوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ربانی اختیار سے متصف ظاہر کر رہے ہیں ــــ قرآن فرماتا ہے:

اللہ نور السموات والارض ۔ یعنی اللہ پاک زمین و آسمان کا نور ہیں۔ شعر میں یہ مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کو "علیمٌ بذاتِ الصدور" کہا گیا۔ شعر میں یہ وصف بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں دکھائی دیتا ہے۔ بات دل کو لگتی ہوئی تھی، میں خواہ مخواہ الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ استفادے کے خیال سے میں نے کہا:۔

"علامہ کے ابتدائی کلام کو چھوڑ دیجیے۔ آخر میں تو وہ بالکل قرآن ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اس دور کی کوئی مثال ان کے کلام سے نکالیے۔"

عزیزِ من! تم ایک مثال چاہتے ہو۔ بیسیوں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس سے کیا فائدہ؟

نہ کھلواؤ زباں میری نہ اٹھواؤ قلم میرا

اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں اس شعر کو خلافِ قرآن کہوں اور دوسرے لوگ اُسے عین قرآن کہنے پر تل جائیں۔ میں اقبال کی سطحی عقیدت مندی کے معصوم جذبے کو خواہ مخواہ ٹھیس لگانے کا ناخوشگوار ارتکاب ہی کیوں کروں گا۔"

اس نے اصرار کیا، حضرت میں اپنی معلومات میں اضافے کی خاطر آپ کو یہ تکلیف دے رہا ہوں، اور اس یقین کے ساتھ کہ آپ کسی مخالفانہ جذبے کے تحت کسی کے خلاف زبان نہیں کھولا کرتے۔ آپ جو کچھ کہیں گے خدا لگتی ہی کہیں گے۔ اور یوں تو اقبال کی بے اندازہ عظمت و قبولیت پر حسد کرنے والوں کے بے جان اعتراضات ہم نے دیکھے ہی ہیں۔"

سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ گویا میری آرزو پوری کرنے پر آمادہ ہو گئے اور یوں گویا ہوئے:۔ محقق صاحب! اس مختصر صحبت میں اس موضوع کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے تو علامہ علیہ الرحمتہ کے اس قسم کے تمام اشعار ان کی تمام تصانیف سے منتخب کیے جائیں۔ پھر متعدد صحبتوں میں ان پر تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ یہ محنت کا کام ہے اور اس طرح پوری کتاب کا مواد تیار ہو سکتا ہے۔ اس وقت نمونے کے طور پر بعض اشعار پر اجمالاً ہی تبصرہ ہو سکتا ہے۔"

اجمالاً ہی سہی۔ اس سے کم از کم آپ کا قرآنی نقطہ نگاہ اور اسلوبِ تنقید تو واضح ہو جائے گا۔"

اچھا سنیے۔ محقق صاحب نے کہنا شروع کیا۔ یہ تو حکمائے اسلام کے نزدیک مسلم ہے کہ اسلام کے کسی جذبے اور اس کے قولی یا عملی اظہار کو بے زمام نہیں چھوڑا گیا۔ عقائد و عبادات تک کی حدیں متعین فرما دیں۔ ان سے تجاوز غلو فِی الدّین قرار دیا، اور سابقہ امتوں کو اس غلو کے متعلق بار بار تنبیہہ فرمائی۔

پہلے سورۂ نساء آیت ۱۷۲ اور پھر سورۂ مائدہ آیت ۷۸ میں اس مضمون کو دوہرایا ہے:

"اے اہلِ کتاب اپنے دین میں زیادتی نہ کرو۔" لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا شاعر

حکیم مقامِ نبوت کے عرفان میں احتیاط و اعتدال کو قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ "ارمغانِ حجاز" جو ان کی آخری تصنیف ہے اس کا ایک شعر دیکھیے :

خراب جرأتِ آں رندِ پاکم
خدا را گفت ما را مصطفیٰ بس

حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لیے "بس" یعنی کافی کہنا اور وہ بھی خدا کے سامنے اور کہنے والے کو "رندِ پاک" کا خطاب دینا خود حضورؐ کی تعلیم اور قرآن کی روح کے خلاف ہے یہ مرتبہ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہی اپنے بندوں کے لیے کافی ہیں۔ قرآن بڑے ہی زوردار الفاظ میں فرماتا ہے۔ الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ ؟ (کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے)

وہ بے شمار اشخاص جن کے دل میں علامہ کی عظمت شعر سے بڑھ کر ان کی قرآن دانی اور اسلام شناسی کی وجہ سے ہے۔ وہ ایسے مؤثر اشعار کی زد سے کس طرح بچ سکتے ہیں ؟

اور سنو! جب والی نجد و حجاز عبدالعزیز ابنِ سعود نے بعض (اصلی یا جعلی) مزارات کو منہدم کیا تو مسلمانوں میں ایک ہنگامہ اٹھا۔ مخالف و موافق دو گروہ ہو گئے ــــ مرحوم علامہ نے صرف انہدام کے خلاف بلکہ سجدۂ مزار کے حق میں اپنے جذبات پیش فرمائے ہیں:

سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں
بروبم از مژہ خاک در دوست

اگر اس طرزِ استدلال کی حمایت کی جائے تو ان لوگوں کو کیا کہا جائے گا جو کہتے تھے :

"ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ"

(ہم اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی پرستش کرتے ہیں۔)

جاوید نامہ میں علامہ نے حلاج کو بہت اہمیت دی ہے۔ حلاج کی تاریخی پوزیشن اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ معاصر مورخین کے علاوہ اکابر صوفیہ نے بھی اس کا انکار کیا ہے۔ خود علامہ ۱۹۱۹ء میں مولانا اسلم جیراجپوری کے نام ایک خط میں لکھ چکے تھے۔

"اس زمانے کے مسلمان منصور (حلاج) کی تزاد ہی میں حق بجانب تھے ..... معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر کیوں دلدادہ ہو گئے"

اس کے باوجود علامہ اس کے دلدادہ ہوتے ہیں اور اس سے حقیقت محمدیہ کے متعلق استفسار فرماتے ہیں۔ اس نے جو جواب دیا اس سے علامہ کے اپنے جذبات کی عکاسی ہو رہی ہے۔

کس ز سرّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرّ اللہ نیست

لا الہ تیغ و دم او عبدہٗ
فاش تر خواہی، بگو ہو عبدہٗ

یہاں تک تو حلاج اپنی طرف سے کہہ رہا ہے۔ اس سے آگے وہ قرآن کی سند بھی لے آتا ہے۔

مدعا پیدا نہ گردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقام مارمیت

اس کو پڑھنے والا اس کے سوا کیا سمجھے گا کہ خود اللہ تعالیٰ نے پیکرِ مصطفوی میں نزولِ اجلاس فرمایا اور کفار کو شکست دی۔ "قرآنی سند" موجود ہے۔ اس کو پیش کرنے والا شاعر ماشاء اللہ ترجمانِ حقیقت بھی ہے اور حکیم الامت بھی۔ لیکن قرآن کو جاننے والا جانتا ہے کہ اس "مارمیت" سے پہلے اسی آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے۔ جس وحدت الوجود کے قائلوں نے صدیوں سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ ارشاد ہے:۔

"فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ"

مسلمانو! کافروں کو تم نے قتل نہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا، اور جب (اے رسولؐ) تُو نے تیر چلائے تو تُو نے نہیں تیر چلائے بلکہ اللہ نے تیر چلائے۔

اگر یہاں رسولؐ کو خدا مانا جائے تو آپؐ کے ساتھی مسلمانوں کو پہلے خدا ماننا پڑے گا۔ اس کا ترجمہ وہ کرو جو دونوں جگہ ٹھیک بیٹھ سکے ـــــ اور یہ بھی نہ بھولیے کہ مسلمان غازیوں کے مشترک رشتہ داروں کو کس خانے میں رکھا جائے گا ـــــ اس صورت میں نصاریٰ کے خلاف ہم کس طرح لب کھول سکتے ہیں"

یہاں پہنچ کر حضرت محقق کے لہجے میں خلافِ عادت جوش سا آگیا۔ میں بھی جواب تک ضبط کیے بیٹھا تھا چُپ نہ رہ سکا۔ قبل اس کے کہ آپ آگے بڑھیں میں نے کچھ عرض کرنے کی

اجازت چاہی اور کہا "کس منہ سے کہوں کہ آپ اقبالؔ کو سمجھنے میں ذرا اور گہرے جاتے تو بہتر تھا"

"تو بھائی اب بھی کیا بگڑا ہے میں تمہاری مدد سے مزید غور کرنے کو تیار ہوں"

"میں سورج کو چراغ کیا دکھا سکتا ہوں۔ حضرت علامہ ہی کے دو ایک شعر اس وقت ذہن میں ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان کا صحیح موقف سمجھنے میں ہماری مدد کر سکیں"

"ہاں تو کہیئے"

عرض کرتا ہوں:

دل خود را بدست کس ندادم
گرہ از روئے کار خود کشادم
بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار
دو صد بار از مقام خود فتادم

اس قطعے میں علامہ نے عقیدہ و عمل دونوں حیثیتوں سے اپنا مقام پوری صاف گوئی سے متعین فرما دیا ہے۔ یعنی وہ عرش الوہیت پر ایک لمحے کے لیے بھی دوسری ہستی کو بٹھانے کے روادار نہیں۔ دوسری جگہ زیادہ وضاحت سے فرماتے ہیں:

مسلمانے کہ داند رمز دیں را
نساید پیش غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بکام او تگردد
بکام خود بگرداند زمیں را

یہ تو ہے علامہ کا عرفانِ توحید۔ اب تعظیم مزارات کا مسلک دیکھ لیجیے:

مرید خود شناسے پختہ کارے
بہ پیرے گفت صرف نیش دارے
بمرگ ناتمامے جاں سپردن
گرفتن روزی از خاک زارے

اب آپ اسی روشنی میں علامہ کے ذہن و دماغ کا مطالعہ فرمائیں۔

عزیزِ من! میں تمہارا قصور فہم کیوں کہوں۔ اپنا ہی قصور بیان مان لیتا ہوں۔ محقق صاحب

نے پھر تقریر شروع کی۔

علامہ نے لغت میں کہا ہے :۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر

وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

کیا ہم کرشن اوتار اور مریم کے بیٹے (علیہ السلام) مسیح کو الٰہ ماننے والوں کے لیے ایسی "عشق و مستی" کی اجازت دے سکتے ہیں؟ ہم کسی نہ کسی توجیہہ سے اپنے محبوب پیغمبرؐ کو قرآن و فرقان اور یٰسین و طٰہٰ تو مان سکتے ہیں۔ لیکن اوّل و آخر تو یہ نص قرآن اللہ تعالےٰ کی صفات ہیں۔ بطن آمنہ سے پیدا ہونے والے بزرگ ترین انسان کو ان کا مصداق کیوں کر بنایا جائے گا۔ تم کہتے ہو کہ میں شاعر کے ذہن و دماغ کا مطالعہ کروں۔ میں کہتا ہوں ہماری قوم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو ان صریح الفاظ کو چھوڑ کر شاعر کے ذہن و دماغ کی ٹوہ لگانے اور اس کے تضاد میں مطابقت پیدا کرنے کی زحمت اٹھائیں گے؟ اس قسم کی بھول بھلیاں انبیاء اور محتاط اولیاء کی تعلیم میں کہیں نظر نہیں آتیں — مجھے تسلیم ہے کہ اقبال موحد تھے، صاحبِ دل تھے، حکیم الامت تھے۔ لیکن بعض مواقع پر ان کے قلم سے ایسی باتیں نکل گئی ہیں جن کی کوئی خوب صورت تاویل نہیں ہو سکتی۔ مقامِ نبوت کے فہم میں افراط کی مثالیں تم سن چکے۔ مرتبہ الوہیت میں تفریط کی بعض مثالیں بھی سنو!

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا

یا میرا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اس تخیل پہ "جنوں" کا پردہ ڈالنے کے سوا آپ کیا کر سکتے ہیں!

کرے گی داد محشر کو شرمسار اک دن

کتاب صوفی و ملّا کی سادہ اوراقی

صوفی و ملّا پر برستے برستے داد محشر پہ بھی برس پڑے۔ شرمساری کا ایک اور منظر دیکھیے :۔

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

قرآن فرماتا ہے :- مَا لَکُمْ لاترجُونَ اللّٰہ وَقَارا
لوگو! تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کا وقار ملحوظ نہیں رکھتے ؟
مَا قَدَرُ اللّٰہ حَقَّ قَدْرِہٖ ۔ (اللہ تعالیٰ کی جو قدر کرنی چاہیئے تھی، نہ کی۔آگے بڑھیے:

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

قرآن میں یہود کا قول منقول ہے : "ید اللہ مغلولۃ"۔ (اللہ تنگ دست ہے)
جواباً فرمایا :- "بَلْ یَدَاہُ مَبْسُوطَتَانِ"۔ (وہ تو فراخ دست ہے)
یہاں ارادہ و نیّت میں توارد یقیناً نہیں۔ لیکن لفظی توارد کا انکار کس طرح کریں۔
میرے بھائی! اپنے پیش کردہ مصرعے

"گر بحر فہم غیر قرآں مضمر است"

کو ذہن میں رکھو اور سنتے جاؤ:

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے

اس "دردِ سر" کو دیکھیے اور قرآن کو دیکھیے جو کہتا ہے۔

لَا یَؤُدُہٗ حِفْظُھُمَا وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوبٍ ۔

ارض و سما کی تخلیق اور نظم و حفاظت سے ہمیں کوئی گرانی ہے نہ تکان۔

اس میں شک نہیں کہ علامہ انسان کو اس کی موجودہ سطح سے بلند دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ اس بازارِ موت کو حیاتِ جاودانی میں بدلنے کے آرزومند ہیں۔ لیکن جب انہیں اپنا تصوّر متشکل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا تو ان کے دورِ شباب کی جرأت شکوہ اس طرح ابھرتی ہے :

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

یہ شعر تخلیقِ انسان کو نقشِ باطل کہہ رہا ہے۔ لہجہ طنز کا ہو یا نیّت اصلاح کی۔ اس سے بحث نہیں۔ خطاب اس سے ہے جس کے فعل میں باطل کو راہ نہیں۔ جب ہم قرآن میں جھانکتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔

اس کا مفہوم بیدل عظیم آبادی کے لفظوں میں سنیے:

نبود نقطہ از علم ایں کتاب غلط
کہ فہم ناقص ما کرد انتخاب غلط

یعنی صحیفہ فطرت کا ایک نقطہ (یا شاید نکتہ) نہیں۔ اگر کہیں غلطی نظر آتی ہے تو یہ ہمارے فہم نظر کا قصور ہے۔ اس مفہوم کو مختلف پیراؤں میں بیسیوں آیات میں بیان فرمایا ہے ـــــ قرآنِ پاک میں غوطہ لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عظمت و جلال میں اولوالعزم انبیاء بھی ہیں اور اَعُوْذُ، اَتُوْبُ اور اَسْتَغْفِر کا ورد کرتے ہیں تو لوگ ان کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ ان کا کیا حال ہونا چاہئیے ـــــ اقبال کے غالی معتقد، چاہے میرے پیش کردہ اشعار کی کتنی ہی تاویلیں کریں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اپنی اس روش کو خود ہی گستاخی سے تعبیر کرتے ہیں:"

یہاں پہنچ کر محقق صاحب ذرا رکے تو میں نے عرض کیا:

"وہ کہاں؟"

فرمایا۔ یہ بھی سُن لو۔ وہ درگاہ جس کی شان یہ ہے کہ:۔

"خشعت الاصوات للرحمٰن"

رحمٰن کے حضور آوازیں پست ہو کر رہ جائیں گی اور لا یملکو منہ خطابا۔ ہیبت کے مارے اس سے بات نہیں کر سکیں گے۔ وہاں اقبال کا طرزِ عمل کیا ہے۔

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اس سے زیادہ واضح اعتراف اور کیا ہوگا۔ میں نے عرض کیا حضرت اپنی گستاخی کی

توجیہ بھی علامہ نے فرمائی ہے۔ جو شاید اس وقت آپ کے سامنے نہیں۔

"تو آپ سامنے لے آئیے۔"

فرماتے ہیں:

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوخ نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک

"دیکھو بھائی"! محقق صاحب کہنے لگے: مجھے اس سے انکار نہیں کہ علامہ کے سینے میں جمالِ حقیقت کے شوق و محبت کی شمع فروزاں ہو چکی تھی۔ لیکن میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ طرزِ تعبیر خطرات سے پُر ہے۔ وہ لوگ محبت کی ان گستاخ و بے باک بنا دینے والی رمزوں سے کس طرح دامن بچائیں گے جن کے متعلق ارشاد ہے: "اَمَنُوْا اَشَدُّ حبًّا لِّلّٰهِ" (اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔

عام صوفیانہ شطحیات کو چھوڑئیے کہ اکابر صوفیہ کے نزدیک بھی ان کا کوئی وزن نہیں۔ انبیائے کرام اور محتاط ائمہ و اولیاء کے کلام میں کوئی ایسا فقرہ دکھائیے۔"

میں نے عرض کیا حضرت وقت زیادہ ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں مزید غور و مطالعہ کر کے اس مبحث پر پھر کسی دن آپ سے گفتگو کروں۔

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ایسی جامع اور عظیم شخصیت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے ہمیں بہت احتیاط سے ہر پہلو کو ملحوظ رکھنا مناسب ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ جو اصحاب مجھ سے زیادہ اقبال شناس ہیں یہ اِشکالات ان کے سامنے رکھوں۔ آخر میدان جیتنا تو ہمارا مقصود نہیں ہے — ہمیں تو حقیقت کا سراغ لگانا ہے — حقیقت ہماری خواہشات کے موافق ہو یا خلاف۔"

اس مکالمے کے چند ماہ بعد حضرت محقق عالم بالا میں علامہ اقبال سے جا ملے۔ ان کی رحلت کے بعد ملکی تقسیم کے ہولناک ہنگامے برپا ہوئے اور راقم کو وطن سے بے وطن ہونے کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس مدت کے بعد آج عارفان اقبال کے سامنے اس روداد کو پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

علامہ عرشی امرتسری کا پورا نام محمد حسین اور تخلص عرشی تھا۔ آپ ایک بلند پایہ عالمِ دین، مبلّغ کتاب و حدیث، عاشقِ رسول، شاعرِ ہفت زبان، ممتاز محقق اور ایک منفرد مقام کے حامل ادیب و نقاد تھے۔ علامہ عرشی کا شمار ان معدودے چند خوش نصیب حضرات میں ہوتا ہے جو حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے بہت قریب رہے اور براہِ راست مئے علم و عرفان سے فیضیاب ہُوئے۔ در اصل قرآنِ حکیم، مثنویٔ مولانا روم اور کلامِ اقبال میں بہت سے امور وضاحت طلب ہوتے تھے، جن کی تشریح کے لیے علامہ عرشی نے حکیم الامت سے راہ و رسم پیدا کی اور پھر یہ تعلق عمر بھر قائم رہا۔

علامہ عرشی تصنّع و بناوٹ سے پاک شخصیت کے حامل تھے۔ ظاہر داری کی کوئی بھی شکل اُنہیں نہ بھاتی تھی۔ انسان کو پرکھنے کے لیے صرف اُسوۂ حسنہ کو بطور کسوٹی استعمال کرنے کے قائل تھے۔ آپ کی منظوم اور نثری تحریروں کے ملاحظے سے قاری کے ذہن میں ایک ایسے شخص کی تصویر اُبھرتی ہے جو بظاہر ضعیف و ناتواں سا نظر آتا ہے مگر اُس کے اندر قیام پذیر ہمنشیں بڑا قوی اور باہمت دکھائی دیتا ہے جس نے ہر لحظہ ان کے قول و فعل میں موافقت پیدا کیے رکھی۔ باعمل علما کے اس قحط زدہ دور میں علامہ عرشی امرتسری کی زندگی علم و حکمت کے پیاسوں کے لیے ٹھنڈے میٹھے اور پاک صاف پانی کے چشمے کی مانند ہے جس سے جو چاہے، جب چاہے، جسقدر چاہے فیضان حاصل کرلے۔

کہنے کو تو علامہ عرشی امرتسری 4 جون 1985ء کو انتقال فرما گئے مگر شہرت و ناموری سے دُور رہ کر نیز شاہوں اور شاہانہ انعام و اکرام کی طلب سے یکسر بیگانہ ہو کر زندگی بسر کرنے والے اس مردِ درویش نے جو علمی و فکری اثاثہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے اُس نے انہیں اہلِ علم کے قلوب میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

969 0 00936 2

Rs. 125.00